۱۸۵۷

پاک و ہند کی پہلی جنگِ آزادی

مُلک پر تسلّط کے لیے انگریزوں کی فریب کاریاں،
جنگِ آزادی کے اسباب، جہاد کی پہلی چنگاری، دہلی،
لکھنؤ، کان پور اور بیسیوں دُوسرے مقامات میں جنگ
کے مفصّل حالات، مُجاہدین کی بے مثال استقامت،
انگریزوں کے ظُلم وجَور کی دل ہلا دینے والی داستانیں،
شہزادوں کا خونِ ناحق، بہادر شاہ کی اسیری، رنگون کی
غُربت، پھانسیاں، کالے پانی ——— !

اُردو زبان میں
۱۸۵۷ء کے حالات پہلی مرتبہ صحیح اصول پر مرتّب کیے ہیں۔

۱۸۵۷ء

پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی
کا صحیح مُرقع جو اُردو زبان میں پہلی بار
پیش ہو رہا ہے۔ یہ انگریزوں کے
خوفناک ظلم و جور کی خونچکاں کہانی ہے

غلام رسُول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،
لاہور ○ حیدر آباد ○ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پرنٹرز
جامعہ اشرفیہ، اچھرہ، لاہور

مقامِ اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز
۱۹۹۔ سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲؎/۵۴۰۰۰
ISBN 969-31-0145-6

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پاک و ہند کی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ انگریزی زبان میں اس واقعے پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا واقعہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ کتب خانوں میں ہر علم خصوصاً تاریخ کے متعلق ترتیب کے لیے دَور قائم کر لیے جاتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو جس دَور سے خاص دلچسپی ہو یا وہ جس عہد کے باب میں تحقیق و کاوش کے آرزومند ہوں، اس کے متعلق تمام کتابیں یک جا مل جائیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی شدّت و گرمجوشی اگرچہ صرف چند مہینے رہی، تاہم ہمارے ہاں کے کتب خانوں میں اس کا ایک مستقل دَور موجود ہے، جسے انگریزی تعبیر کے مطابق "دَورِ غدر" قرار دیا گیا ہے۔ اس سے اصل واقعے کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے اور اس کے متعلق کتابوں کی کثرت و فراوانی کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

ان کتابوں کے مصنف، میرے علم کے مطابق، ایک کے سوا سب انگریز تھے اور یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان سب کا نقطہ نگاہ اصولاً اور اساساً وہی تھا، جو انگریزوں کا ہونا چاہیے۔ ان میں سے اکثر نے تمام سرکاری اور فوجی دستاویزیں بالاستیعاب دیکھ لی تھیں اور اس جنگ کی سرگزشت کا کوئی پہلو ان کی نظروں سے اوجھل نہ رہا تھا، لیکن یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اپنے مستقل قومی نظریات بدل لیتے یا انگریزی اقتدار کو تقویت پہنچانے کے مقاصد نظرانداز کر دیتے؟ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ کسی بھی درجے میں تحریک آزادی کی حمایت اختیار کر لیتے یا اس جنگ کے مجاہدوں کی لغزش اور تجاوزات کے متعلق بھی محبانہ و ہمدردانہ عذر خواہیوں کی آرائش اسی طرح ضروری سمجھتے، جس طرح انھوں نے اپنے ہم قوم کارفرماؤں

کی سیکڑوں تعدیوں کے سلسلے میں اپنے لیے لازم قرار دے لی تھی؟

انگریزی زبان میں صرف ایک کتاب ایک ہندوستانی کے قلم سے مرتب ہوئی اور وہ ونائک دامودر ساورکر صاحب ہیں، جن کی زندگی کا ابتدائی دور ایک پُرجوش انقلابی کا تھا، آخری دور ایک تنگ نظر اور تعصب پرور فرقہ پرست کا ہے۔ اس کتاب میں جوش سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور احوال و وقائع پر ویسی توجہ نہیں کی گئی۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں بہ مقام لندن شائع ہوئی تھی اور حکومت نے اُسے ضبط کر لیا تھا۔ ہمارے عہد میں بھی اسے چھاپا گیا، لیکن دوبارہ ضبطی میں آ گئی۔ انگریزی حکومت کے ختم ہو جانے کے بعد ہندوستان میں پھر چھپی۔ میں اس آخری ایڈیشن سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔

اُردو زبان میں کوئی قابلِ ذکر کتاب اس موضوع پر میری نظر سے نہیں گزری۔ ایک پنڈت کنہیا لال کی کتاب ہے، جو دراصل بعض انگریزی دستاویزوں ہی کا چربہ ہے اور اسے پڑھ کر اصل تحریک کے بارے میں صحیح اندازہ کرنا میرے نزدیک مشکل ہی نہیں، غیر ممکن ہے۔ دوسری کتاب مولوی ذکاء اللہ مرحوم کی ہے۔ وہ اصل میں کیئی اور میلی سن کی مشہور و مفصل تاریخ کا ترجمہ ہے، جس میں جابجا بعض حالات کا اضافہ کر دیا گیا ہے، کہیں کہیں باس ورنھ سمتھ کی کتاب "حیات لارنس" یا بعض دوسری کتابوں سے ضروری اقتباسات لے لیے گئے ہیں۔ یہ بہ حیثیت مجموعی ساڑھے گیارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یقیناً اس میں بڑی قیمتی معلومات فراہم ہو گئی ہیں، لیکن واقعات کی ترتیب ایسی نہیں کہ پڑھنے والے پر تحریک کے بنیادی اور اساسی حقائق واضح ہوتے جائیں۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ۱۸۵۷ء کے متعلق ایک سلسلہ کتب شائع کیا تھا۔ انھیں کتابوں کی وجہ سے، یا کہنا چاہیے کہ اس سلسلے کی پہلی کتاب (بیگمات کے آنسو) کی وجہ سے خواجہ صاحب مرحوم نے ہمہ گیر شہرت حاصل کی اور ان کی تحریرات نے غیر معمولی ہردلعزیزی پائی، لیکن وہ تمام کتابیں ۱۸۵۷ء کے متفرق واقعات یا اس کے مختلف پہلوؤں کے متعلق تھیں، خود اصل تحریک کے بارے میں مرتب طریق پر کچھ نہیں لکھا گیا تھا۔ پہلی کتاب کے سوا خواجہ صاحب مرحوم نے جو کچھ چھاپا وہ یا تو بعض

انگریزی یا فارسی تحریرات کے تراجم تھے یا مختلف مآخذ کے اقتباسات، جن کا انتخاب کسی واضح مقصد و نصب العین کے ماتحت نہیں ہُوا تھا۔ اشخاص کے متعلق جو تصریحات فرمائی گئیں، ان میں سے بعض تشنہ رہ گئیں، نیز ترجموں کی صحت پر جتنی توجہ ہونی چاہیے تھی، نہ کی جا سکی۔

میں مدت سے یہ کمی محسوس کر رہا تھا، لیکن دو وجہ سے متامل تھا:

۱۔ معلومات کے وہ گراں بہا ذخیرے میرے دسترس سے باہر تھے، جنھیں سامنے رکھے بغیر خواہش کے مطابق کتاب مرتب نہیں ہو سکتی تھی۔

۲۔ یہ کام ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک جماعت کا تھا اور اس کے لیے جس سروسامان کی ضرورت تھی، وہ میسّر نہیں تھا۔

تقسیم کے بعد اس اہم تاریخی اور قومی خدمت کے سرانجام کی مشکلات دہ چند ہو گئیں، اس لیے کہ بیشتر ذخیرے ہندوستان میں رہ گئے تھے اور ہمارے ہاں تمام شائع شدہ کتابیں بھی مہیا نہیں تھیں۔

۱۸۵۷ء کی یادگار منائے جانے کی صدائیں بلند ہوئیں تو فیصلہ کیا کہ جو ذخیرۂ معلومات پیشِ نظر ہے، اسی کی بناء پر ایک متوسط درجے کی کتاب مرتب کر دینی چاہیئے، جس میں اصل تحریک کے بنیادی پہلو واضح ہو جائیں، نیز ان کی روشنی میں ۱۸۵۷ء کی کہانی کے اہم واقعات قلمبند کر دیے جائیں۔ ساتھ ہی اس جہاد کے بعض ممتاز کارفرماؤں کی سیرتیں لکھ دی جائیں۔ شاید دونوں کتابیں مل کر اس فرض کی جزوی بجا آوری کا ذریعہ بن سکیں، جو ایک صدی سے گراں بہا قرض کی طرح ہمارے ذمے چلا آتا ہے۔ نیز ممکن ہے یہ ناچیز خدمت دوسرے اہلِ علم کے لیے تکمیل و اتمام کار میں اک گونہ سہولت پیدا کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کام مجھ ایسے فقیر بے نوا کا نہیں بلکہ ایک ایسے ادارے کا تھا، جو متعدد اہلِ قلم حضرات پر مشتمل ہوتا اور اسے حکومت کی پوری سرپرستی حاصل ہوتی۔ افسوس کہ گزشتہ دس گیارہ سال کی مدت میں کارفرمایانِ حکومت کی توجہ قومی تاریخ کی ترتیب کی طرف

منعطف ہی نہ ہوئی بلکہ اس اہم قومی و ملکی فرض کا احساس بھی بہ ظاہر مفقود ہی رہا۔ شاید اس لیے کہ کارفرماؤں میں سے کوئی اس ضرورت کا اندازہ شناس نہ تھا بلکہ ضروری مواد کی فراہمی کا بھی کسی کو خیال نہ آیا۔

حکومت کی امداد سے اب تک دو کتابوں کا بندوبست ہوا۔ ایک مختصر تاریخ پاک و ہند اور دوسری "تاریخ تحریکِ آزادی"۔ پہلی کتاب کے لیے کام ۱۹۴۹ء میں شروع ہوا تھا۔ چھ حضرات کا ایک بورڈ بنایا گیا تھا اور بیس حضرات کتاب کے مختلف ابواب مرتب کرنے کے ذمہ دار تھے۔ یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی اس کی حیثیت اتنی معمولی ہے کہ اسے کسی بڑے ادارے اور اہلِ علم کی خاصی بڑی جمعیت کی مجموعی محنت کا ثمرہ قرار دیتے ہوئے سو مرتبہ تامّل ہوتا ہے۔ دوسری تاریخ کے لیے کام ۱۹۵۲ء میں شروع ہوا تھا اور اس کی پہلی جلد ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی، جسے تمہیدی جلد قرار دینا چاہیئے۔ اس کا صحیح اندازہ تو اس وقت کیا جا سکے گا۔ جب کتاب مکمل ہو کر سامنے آ جائے گی۔ تاہم چند باتیں عرض کر دینا شاید غیر مناسب نہ سمجھا جائے۔

۱۔ اگر رفتارِ ترتیب و طباعت وہی رہی، جو پہلی جلد میں گوارا کر لی گئی تو موجودہ نسل کی زندگیوں میں کتاب کا مکمل ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔

۲۔ "تاریخ تحریکِ آزادی" سنتے ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں آزادی کے لیے جدوجہد کے مختلف ابواب و ادوار کے حالات پوری تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور جو واقعات و حقائق اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے تھے، انھیں بھی دفاتر، مخطوطات سے نکال نکال کر مرتب کر دیا گیا ہے نیز ہر تفصیل کو شواہد و حوالہ جات سے مستند بنا دیا گیا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پہلی جلد اس میزان میں پوری نہیں اترتی۔

۳۔ "تاریخ تحریکِ آزادی" کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مختلف اسلامی افراد و جماعات نے بہ طور خود یا بہ اشتراک جماعات دیگر آزادی کے لیے جو بھی جدوجہد کی، وہ اس کتاب

میں شامل ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ذمہ داران ترتیب کتاب کے ذہن مبارک میں غالباً یہ مفہوم واضح نہیں۔

۴۔ مختصر تاریخ پاک و ہند اور تاریخ تحریکِ آزادی دونوں میرے علم کی حد تک تا حال انگریزی میں ہیں، اردو اور بنگالی میں منتقل نہیں ہوئیں، جو یہاں کے باشندوں کی بہت بڑی اکثریت کی زبانیں ہیں۔ ظاہر ہے ان سے اہلِ وطن کا خاصا بڑا حصہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے[1]

اب میں اپنی کتاب کے متعلق چند ضروری باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں، جنھیں پیش نظر رکھ لینے سے غالباً اس کی حیثیت کا اندازہ کرنے میں مدد مل سکے۔

۱۔ بے توقف اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس کی ترتیب میں معلومات کے کسی قابل ذکر نئے ذخیرے سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور کوئی ذخیرہ تھا ہی نہیں کہ اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا۔ تمام معلومات فی الجملہ، شائع شدہ کتابوں سے ماخوذ ہیں البتہ ان میں ایسی کتابیں بھی ہیں جو حال میں شائع ہوئیں یا جو غالباً اکثر اصحاب کی نظر سے نہیں گزریں بلکہ شاید ان کے نام بھی معلوم نہ ہوں گے۔

۲۔ جو اصحاب ان کتابوں کو ملاحظہ فرما چکے ہیں، وہ بھی میری بیان کردہ کہانی کو پڑھیں گے تو امید ہے کہ اسے ہر لحاظ سے نئی اور ناشنیدہ پائیں گے، اس لیے کہ اوّل اس کی ترتیب کے اصول و مبانی بالکل نئے ہیں۔ دوسرے جو واقعات کتابوں میں جا بجا

---

[1] انتقاد نہیں بلکہ لطیفے کے طور پر یہ عرض کر دوں کہ تاریخ تحریکِ آزادی کے تمہیدی باب میں فارسی کے مشہور شاعر سلمان ساوجی کو لاہور کا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ گویا مسعود بن سعد سلمان کو سلمان ساوجی سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ دونوں میں کم و بیش ڈیڑھ صدی کا تفاوت ہے اور اوّل الذکر کا نام مسعود والد کا نام سعد سلمان تھا، دوسرے کا نام سلمان تھا۔

بکھرے پڑے تھے، میں نے انھیں طبعی سلسلہ و توع کے مطابق مرتب کر دیا ہے، لہٰذا ان کی متعارف حیثیت بالکل بدل گئی ہے۔

۳۔ میں نے اس امر کا خاص خیال رکھا ہے کہ جو کچھ لکھا جائے اس کے لیے حوالے دیے جائیں اور یقیناً زیادہ تر حوالے مستند انگریزی کتابوں سے دیے ہیں تاکہ بیانات کی درستی، صحت اور تیقن کے متعلق اپنوں یا بیگانوں کے لیے کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے۔

۴۔ ۱۸۵۷ء کے متعلق کتابیں دیکھتے وقت جو امر بار بار میرے لیے پریشانی کا باعث ہوا، یہ تھا کہ واقعات کی فراہمی میں مصنفین کے پیش نظر جو اہتمام رہا، وہ ان کی ترتیب و توضیح میں ملحوظ نہ رکھا گیا۔ مفصل کتابوں میں بھی یہ نقص کم و بیش موجود ہے اور متوسط درجے کی کتابوں کا تو یہ عالم ہے کہ یا تو بعض اہم واقعات چھوڑ دیے گئے ہیں یا انھیں ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کا ذوق برابر شکوہ سنج تنگ بخشی رہے۔ میں نے اپنی ناچیز استعداد کے مطابق پوری کوشش کی ہے کہ ایجاز کے باوجود نہ کوئی ضروری واقعہ نظر انداز ہو، نہ کوئی اہم پہلو تشنہ بیان رہے۔ نہ حالات کو ترتیب وار ذہن نشین کرانے میں حتی الامکان خلل پیدا ہو اور نہ حوالے ترک کیے جائیں۔ گویا ۱۸۵۷ء کے واقعات کو ایک مسلسل و مرتب کہانی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ خیال بھی رکھا ہے کہ کتاب کی ضخامت مناسب حد سے آگے نہ بڑھے۔ مبادا وہ عام قارئین کے مطالعے کی دسترس سے باہر نکل جائے۔

جن کتابوں کے مطالعے سے میں نے فائدہ اٹھایا، چاہتا تھا کہ ان سب کی حیثیت پر مفصل بحث کروں۔ پھر خیال آیا کہ اس طرح کتاب کی ضخامت بڑھ جائے گی نیز اس بحث کا فائدہ عام نہیں محدود ہے لہٰذا یہ خیال ترک کر دیا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ حوالے دیتے وقت میں نے کتابوں کے پورے نام بار بار درج نہیں کیے صرف مصنفوں کے نام لکھ دینے پر اکتفا کیا۔ انگریزوں کے نام حواشی میں بہ حروف انگریزی بھی درج کر دیے تاکہ غلط فہمی کا کوئی امکان نہ رہے۔

میں نے پنجاب پبلک لائبریری کے ذخیرے سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس کے لیے خواجہ

نور الٰہی صاحب لائبریرین کا ممنون ہوں۔ حبیب مکرم ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے ساور کر کی کتاب ملی، جسے حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ کتاب نہ ملتی تو میں واحد ملکی مصنف کے نقطۂ نگاہ سے آشنا نہ ہو سکتا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس عنایت کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ محب عزیز و صدیق جلیل جناب صادق دلاوری نے تقریباً تمام مسودات بہ غور ملاحظہ فرمائے اور مجھے ترتیب کے متعلق قیمتی مشورے دیے۔ ان کے احسان کا حق سپاس گزاری سے ادا نہیں ہو سکتا۔

کتاب کی ترتیب کا مقصد یہ نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے مجاہدانہ وقائع میں سے ایک ایک بالتفصیل بیان کر دیا جائے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اس تحریک کے بنیادی پہلو واضح ہو جائیں، جو میرے محدود علم کے مطابق آج تک وانشگاف طریق پر واضح نہ کیے گئے۔ انھیں پہلوؤں کی روشنی میں پوری کہانی ایسے طریق پر بیان کر دی جائے کہ عام خوانندگان کرام اس سے بقدر ضرورت آگاہی حاصل کر لیں۔

بنیادی پہلوؤں کے متعلق یا تو کچھ لکھا ہی نہ گیا یا غور و فکر کے بجائے عموماً جذبات سے کام لیا گیا، حالانکہ جذبات کتنے ہی خلوص پر مبنی ہوں تاہم محض ان کی بنا سے تحقیق کی منزل طے نہیں کی جا سکتی اور محض ادعا تاریخی حقائق کا بدل نہیں بن سکتا۔

میری کتاب جس نقطۂ نگاہ کی حامل ہے، اس کی درستی اور پختگی کے متعلق میں نے سب سے پہلے بحث کی ہے اور توثیق کے لیے اپنی سمجھ کے مطابق روشن دلیلیں پیش کی ہیں، پھر قدم آگے بڑھایا ہے۔ جیسا کہ کتاب ملاحظہ فرمانے سے واضح ہو جائے گا۔ بنیادی پہلو میرے نزدیک صرف دو ہیں۔

۱۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک عام و ہمہ گیر تھی، صرف فوج تک محدود نہ تھی کہ اسے "غدر" قرار دیا جائے اور بے شائبہ ریب اس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود تھیں، جو کسی تحریک کے عوامی اور قومی ثابت کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اسے محض اس لیے "غدر" قرار دینا خلاف انصاف ہے کہ انگریز ایک سو سال تک اسے "غدر" قرار دیتے رہے۔

۲۔ اس قومی تحریک کے دبانے کے دوران ہی میں نہیں بلکہ دبا چکنے کے بعد بھی انگریزوں نے

اہل ملک پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً جو خوفناک تعدیاں روا رکھیں، ان کی مثالیں اقوام و امم کی تاریخ میں بہت ہی کم ملیں گی۔ سرگزشت انسانیت کا دامن ایسے واقعات سے لبریز ہے، جن کا تار و پود خون اور آگ کے سوا کچھ نہیں۔ انسانوں نے جوشِ وحشت میں ہم جنسوں کو سرِ مشق انتقام بناتے وقت جنگلی درندوں کی بے حسی کو بھی منزلوں پیچھے پھینکنے میں تامل نہ کیا۔ ۱۸۵۷ء بھی ان چند واقعات میں سے ہے جو خوں ریزی، آتش زنی اور تباہ کاری کے لحاظ سے تاریخ عالم میں یگانہ مانے جانے چاہئیں۔ تعجب ہے کہ اب تک اس پہلو کا صحیح اندازہ نہ کیا گیا۔

میں آزادی کی خاطر جانی اور مالی قربانیوں کو قومی زندگی کا جوہر اور روحِ رواں سمجھتا ہوں۔ جس قوم کو یہ ہمت و توفیق ارزانی ہو، اسے اپنی خوش نصیبی پر فخر کرنا چاہیے کہ یہ برتری کا وثیقہ اور عظمت کی دستاویز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بارے میں فرقہ وار تقابل پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم آپ ۱۸۵۷ء کی سرگزشت کو سرسری نظر سے بھی دیکھ جائیں گے تو واضح ہو گا کہ اس جہاد میں سب سے بڑھ کر حصہ مسلمانوں نے لیا۔ ملک میں قلت تعداد کے باوجود وہ سب جماعتوں اور گروہوں سے منزلوں آگے نکل گئے۔ بے مثال استقامت کی شان بھی انھیں نے دکھائی اور انھیں کی جانی و مالی قربانیاں اس جہاد کا سرمایۂ فخر، پیرایۂ مباہات اور اندوختۂ امتیاز ہیں۔ کاش مسلمان ۱۸۵۷ء کی یادگار مناتے میں بھی اپنی شان امتیاز قائم رکھیں۔ اس سلسلے میں جو فرائض عائد ہیں، انھیں بوجہ احسن پورا کریں۔ ان پاک روحوں کی بارگاہ عالیہ میں اس کے سوا ہدیۂ زیبا اور ارمغان شایاں کوئی نہیں ہو سکتا، جنھوں نے آج سے ایک سو سال پیشتر اس سرزمین کی آزادی کے لیے مجاہدانہ اقدامات کا عَلَم بلند کیا تھا۔ اور وہ نعرۂ حق لگایا تھا، جس کی گونج اس وقت تک قائم رہے گی، جب تک یہ گنبد گرداں قائم ہے۔

ایک سو سال تک ان کے زندۂ جاوید کارنامے غلط بیانیوں کے گرد و غبار میں چھپے رہے۔ اب اس گرد و غبار کو صاف کر دینے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ مجاہد اپنی سربازیوں

اور جاں بازیوں کے لیے کسی تحسین و اعتراف کے آرزومند نہ تھے۔ انھوں نے ایک فرض ادا کیا اور اس کی بجاآوری کے اضطراب و بے تابی کی فراوانی نے ان کے قلب و روح میں کسی دوسری شے کے لیے گنجائش نہ چھوڑی تھی۔ لیکن اگر ہم اعتراف کے واجبات پورے نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے ماضی کے مایۂ ناز سرمایے میں سے ایک شہوار متاع کی قدرناشناسی کے مجرم ٹھہرے۔ کیا کوئی قوم بہ سلامت ہوش و حواس ایسے نازیبا جرم کی مرتکب ہوسکتی ہے۔

قوموں کو عروج کے بعد زوال، بلندی کے بعد پستی اور فراز کے بعد نشیب سے سابقہ کیوں پڑتا ہے؟ اس لیے کہ جب معاملات کی باگ ڈور نااہلوں اور نالائقوں کے حوالے ہوتی ہے تو وہ اپنی بدعملیوں سے کارگاہ حیات ملی کے تمام کل پرزے بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ قوموں کے دامن پر سیاہی کے داغ لگاتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ سفیدی کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ پھر قدرت کا قانون مکافات جاری ہوتا ہے اور برائی کا بدلہ برائی ہی ہوگا، بھلائی نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ

گندم از گندم بروید جو ز جو

بدعملیوں کی سیاہی کے داغ صرف مجاہدوں کے خون سے دھلتے ہیں!

خونِ مردانِ حق بہ شوید

از دامنِ اُمتاں سیاہی

قربانیاں جتنی زیادہ ہوں گی، سیاہی کے دھبے اتنی ہی جلدی دُھل جائیں گے۔ پھر ایک آزاد دُنیا آباد ہوگی اور ایک نئی بہار آئے گی۔

۱۸۵۷ء میں جن جوانمردوں نے اپنا خون بے دریغ بہایا تھا، وہ بھی یہاں آزاد دنیا آباد کرنے کے خواہاں تھے۔ وہ بھی اس چمن زار میں بہار لانا چاہتے تھے۔ ان کی عظمت کا مدار مرادمندانہ نتائج نہیں بلکہ صرف عمل جہاد اور سرمستی ایثار ہے۔ اسی عظمت،

اسی برتری اور اسی سربلندی کے لیے دوام ہے۔ جس قوم کا دامن اس سرمایہ عظمت سے بوجہ اتم بہرہ مند ہو، وہی کامگار و فائز المرام ہے اور اسی کے لیے میکدۂ حیات میں بشارتِ شُربِ مدام ہے۔

مومن نتواں گفتن، عاشق کہ مجاہد نیست
رَو بوسہ چو سربازاں، بر طرۂ پرچم زن

پس منظر

باب ۱

پس منظر

زمانے کی روانی اور حوادث کی جولانی

دنیا حوادث و وقائع کی بازی گاہ ہے، جو زمانے کی روانی کے ساتھ سطح زمین پر منودار ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اپنے دائرہ عمل کی تنگی اور اثرات و نتائج کی ناپائیداری کے باعث اس درجہ ناقابلِ توجہ ہوتے ہیں کہ انھیں تاریخ کے اوراق تک پہنچنا ہی نصیب نہیں ہوتا۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے مبارک یا نامبارک اثرات کی وسعت و شدت کے باعث مدتِ مدید کے لیے خوشگوار یا ناخوشگوار یادوں کے گہرے نقش چھوڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی وجہ سے اقوام و ممالک کی تقدیر کے دھارے کا رُخ بدل جاتا ہے، لہٰذا ان کے ذکر سے وقائع نگار کا قلم کبھی فارغ نہیں ہو سکتا۔

۲۰۔ مئی ۱۴۹۸ء

۲۰۔ مئی ۱۴۹۸ء کو کالی کٹ (ملیبار) کے سامنے ایک واقعہ رونما ہوا تھا، جو بہ ظاہر اتنا چھوٹا، اتنا معمولی اور اس درجہ عامتہ الورود تھا کہ بندرگاہ کالی کٹ سے باہر کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہو سکی تھی، تاہم آگے چل کر یہ واقعہ پاک و ہند کے اندر ایسے عناصر کو بروئے کار لانے کا موجب بن گیا، جن کی وجہ سے ہمارا ملک اجنبی سامراج کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ اس کے کاشانۂ آزادی کی تمام کافوری شمعیں ایک ایک کر کے گُل ہوتی گئیں اور یہاں کی دولت سے یورپ کے سیہ خانوں میں گھی کے چراغ جلنے لگے۔ یہ پرتگیزوں کی آمد تھی جو واسکوڈی گاما کی سرکردگی میں چار چھوٹے جہاز لے کر ایک عرب ماہرِ بحریات، احمد بن ماجد نجدی کی رہنمائی میں کالی کٹ کے

سامنے نمودار ہوئے تھے اور فرنگیوں کو یہاں تک پہنچنے کے لیے بحری راستہ ملا تھا۔

پاک و ہند کی معلوم و متعارف تاریخ میں بلحاظ نتائج اس سے بڑھ کر منحوس و نامبارک واقعہ کوئی پیش نہ آیا۔ اس کے بُرے اثرات آزادی مل جانے کے بعد بھی بڑی حد تک باقی ہیں اور ان سے نجات پانے میں خدا جانے ابھی کتنی مدت صرف ہو، کتنا وقت لگے۔

خوشی اور ماتم کی تقریبیں

قومیں عموماً استقلال کے جشن مناتی ہیں تاکہ ان کے افراد میں حریت کا جوش اور آزادی کی حمیت تازہ رہے۔ وہ اس خداداد نعمت کی قدر پہچانیں اور اس کی حفاظت کے لیے بے دریغ جانیں قربان کر دینے پر آمادہ رہیں۔ ان فرائض و واجبات کی بجاآوری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں جو آزادی اور استقلال کے سلسلے میں ان پر عائد ہوتے ہیں اگر اسی طرح ماتمی تقریبیں منانے کا بھی رواج ہو جائے تاکہ عام لوگوں کو ناخوشگوار و نامبارک حوادث سے عبرت حاصل ہوتی رہے تو پاک و ہند میں قومی ماتم کا تاریک ترین دن ۲۳۔ جون ۱۷۵۷ء (یوم پلاسی) نہیں، بلکہ ۲۰۔ مئی ۱۴۹۸ء (۲۸۔ رمضان ۹۰۳ھ) قرار پائے گا یعنی پرتگیزوں یا فرنگیوں کے ہندوستان پہنچنے کا دن۔

پرتگیزوں کے "تحفے"

پرتگیز اپنے ساتھ کیا "تحفے" لائے؟ سن لیجیے: بے دردانہ قتل و غارت، محسن کشی، عام انسانی حقوق سے بے پروائی، جبری تبدیلی مذہب اور بردہ فروشی۔ ان کے ورود سے پیشتر بحیرۂ قلزم اور بحر ہند کی پوری تجارت عرب جہاز رانوں

ل عام روایت یہی ہے کہ واسکوڈی گاما ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء (۲۸۔ رمضان المبارک ۹۰۳ھ بروز یکشنبہ) پہنچا تھا (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع چہاردہم جلد ۲) سر پری کاکس نے "دی ہسٹری آف ایکس پلوریشن" میں اور ڈاکٹر باسو نے دی رائز آف دی کرسچن پاور ان انڈیا میں تاریخ ۲۲۔ مئی بتائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پرتگیزی بیڑا ۲۰ مئی کو کالی کٹ کے سامنے پہنچا۔ مگر چھ میل پر سمندر میں رک گیا تھا۔ اور خود بیڑے والے ۲۲۔ مئی کو ساحل پر اُترے۔

کے قبضے میں تھی۔ اقبال نے مرثیہ سسلی میں فرمایا تھا

یہ محل خیمہ تھا ان صحرانشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

یہ شاعرانہ تخیل طرازی نہ تھا بلکہ ایک حقیقت کا اظہار تھا۔ بحیرۂ روم اور اٹلانٹک ہی نہیں، بلکہ بحیرۂ قلزم، بحر ہند اور بحرالکاہل کے سینوں پر بھی عربوں ہی کے سفینے کھیلتے پھرتے تھے۔ وہ چین اور جاوا تک جاتے تھے۔ پرتگیزوں نے ان کے بیڑے تباہ کیے اور تجارت چھین لی۔ گویا بحری راستہ مل جانے کے باعث پاک و ہند اور ایشیا کے بہت سے دوسرے خطوں کی آزادی بھی سلب ہوئی۔ ان کی اقتصادی خوشحالی کے وسائل بھی برباد ہوئے۔ عرب مقدس میں جگہ جگہ یورپی سامراج کے مرکز بنے۔ افریقہ میں بھی فرنگیوں کی مداخلت کا آغاز ہوا اور عربوں نے تجارت کے جن سلسلوں کو کمال پر پہنچا دیا تھا، وہ بھی سب کے سب درہم برہم ہو گئے۔ اسی وقت سے عربوں کا عام زوال شروع ہوا۔

یہی پرتگیز اور دوسرے فرنگی تھے، جن کے تاجر اندرون افریقہ سے بے خبرانہ پکڑے ہوئے حبشی مردوں، عورتوں اور بچوں کو جہازوں میں لاد کر امریکہ لے جاتے اور یورپی آبادکاروں کے ہاتھ بیچتے رہے۔ خدا جانے کتنے لاکھ بے زبان بندگانِ خدا عزیزوں اور قریبیوں سے الگ ہو کر غلام بنے اور خدا جانے کتنے لاکھ بے زبان مقاماتِ گرفتاری سے ساحل تک اور وہاں سے جہازوں کے سفروں میں موت کے گھاٹ اُترے۔ انسانیت کی تاریخ میں اس ظلم و شقاوت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔[۱]

---

[۱] اس سلسلے میں کوئی مصور کتاب ملاحظہ فرمائیے، جس میں افریقہ کی بردہ فروشی کے حالات بیان ہوئے ہوں آپ دیکھیں گے کہ غلاموں کی قطاریں کھڑی کر کے ان کی گردنوں میں آڑی لکڑیاں ڈال دی جاتی تھیں اور قطار کے دونوں جانب بردہ فروشوں کے مقرر کیے ہوئے نگہبان کوڑے ہاتھوں (باقی نوٹ اگلے صفحہ پر)

باہم آویزی پرتگیزوں کے بعد دوسری یورپی قومیں بھی آئیں اور ان کے درمیان آویزش شروع ہوگئی۔ پہلے پرتگیز صفحۂ مشرق سے محو ہوئے، پھر بعض دوسری قومیں ختم ہوئیں۔ ولندیزوں نے پاک و ہند کی فضا ناساز گار دیکھی تو جزائر شرق الہند کا رخ کیا اور وہاں کی دولت کے لامتناہی ذخیروں پر تین صدی تک قابض رہے۔ پاک و ہند کے اکھاڑے میں صرف انگریز اور فرانسیسی ایک دوسرے کے مقابلے پر رہ گئے اور دونوں نے ایک دوسرے کی دشمنی میں سر دھڑ کی بازی لگادی۔

انگریز اور فرانسیسی بہ طور خود تو کچھ نہ کر سکتے تھے، دیسی حکمرانوں کی سادہ لوحی، کوتہ اندیشی اور حقیقت ناشناسی نے ان اجنبیوں کے لیے میدان آراستہ کر دیے۔ یہاں جانشینی کے لیے جھگڑے ہوتے ہی رہتے تھے۔ ایک موقع پر دکن کے دو مدعیان حکومت کی حمایت کا بیڑا انگریزوں نے اٹھایا۔ دو کی تائید و نصرت میں فرانسیسیوں نے قدم آگے بڑھایا[1]۔ دیسی باشندے اور مدعیانِ حکومت کٹے مرے، لیکن ان کے خون سے اجنبی اقتدار کے استحکام کا راستہ ہموار ہوا۔ جنگوں میں نشیب و فراز بھی آتے رہتے ہیں۔ فرانسیسی قوم طبعاً بے صبر اور جلد باز تھی۔ اسے حالات توقع کے عین مطابق نظر نہ آئے تو اپنے کارکنوں کے خلاف شور مچایا۔ اس طرح اپنا مستقبل تباہ کر لیا۔ انگریز تنہا باقی رہ گئے تاکہ بے خلش فریب کے جال بچھا کر اپنے اقتدار کو

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸)
میں بیے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ جہاں کسی کا قدم رکتا، زور سے کوڑا پڑتا۔ بعض بدنصیب ان تکلیفوں کی تاب نہ لاکر بے بس ہو جاتے۔ انھیں قطار سے نکال کر الگ کر دیا جاتا۔ لکڑی بہ دستور ان کی گردن میں پڑی رہتی۔ بعض اوقات انھیں کسی درخت سے کس کر باندھ دیا جاتا۔ کوئی درندہ آتا اور کھا جاتا۔ اسی طرح جہازوں میں بیسیوں یا سیکڑوں تپ اور اسہال سے مرجاتے اور انھیں سمندر میں پھینک دیا جاتا۔

[1] حیدرآباد میں ناصر جنگ اور مظفر جنگ کرناٹک میں انورالدین اور چندا صاحب۔ پھر انورالدین کی جگہ محمد علی نے لے لی۔ ان میں سے ناصر جنگ اور محمد علی کے معاون انگریز تھے، مظفر جنگ اور چندا صاحب کے فرانسیسی۔

تقویت پہنچاتے جائیں۔

"فریب کے جال" کو بے وجہ الزام تراشی قرار دینے میں عجلت نہ کیجیے۔

انگریزوں کی گواہی

خود انگریز مصنفوں نے اپنے ہم قوموں کے ابتدائی طرزِ عمل کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اُسے آئینے کے طور پر سامنے رکھیں گے تو آپ کو خود بخود حقیقت کا اندازہ ہو جائے گا۔ ولیم ہوِوٹ[1] رقمطراز ہے:

> جو رئیس اور حکمران انگریزوں کی دوستی کے جادو سے مسحور ہوئے، ان کے لیے یہ دوستی انجام کار مہلک ثابت ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک کو تخت حکومت سے اترنا پڑا یا وہ اس طاقت کے ہاتھ میں بے جان کھلوتے بن کر رہ گئے، جو اپنی مرضی پوری کرانے پر تلی بیٹھی تھی۔ ان حکمرانوں نے دوستی کی راہ اختیار کی یا دشمنی کی، نتیجہ دونوں حالتوں کا یکساں نکلا۔ اگر انھوں نے غاصب انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات گوارا نہ کیے تو ان پر ارادہ ہائے بد کا الزام لگا کر حملہ کر دیا گیا اور ان کے علاقے مسخر کر لیے گئے۔ اگر انھوں نے پیش کردہ دوستی قبول کر لی تو وہ ڈپلومیسی کے جال میں اس طرح اُلجھ گئے کہ اپنی عزت اور موروثی مقبوضات سے محروم ہوئے بغیر نجات نہ پا سکے۔ حق یہ ہے کہ وہ لوگ جہاں حکومت کرتے رہے تھے، وہاں قیدی بن کر رہ گئے۔[2]

دشمنی کا نتیجہ تو بہر حال یہی ہو سکتا تھا کہ انگریز موقع پاتے ہی اس رئیس کو مٹا دیتے، انھوں نے دوستوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ وہ جو کچھ لینا چاہتے تھے، لے کر رہے، ہیوِوٹ خود سوال کرتا ہے کہ وہ کون سا تادیبی شکنجہ تھا جس سے کام لے کر دیسی حکمرانوں کے مقبوضات چھینے گئے؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے:

---

[1] HOWIT [2] بہ حوالہ باسو ص ۳۴

یہ وہی شکنجہ تھا، جس کے ہنرمندانہ استعمال سے مکار و عیار لوگ پہلے قرضخواہ
پیدا کرتے ہیں، پھر انھیں اپنے شدید مطالبات کے روبرو سر جھکا دینے پر
مجبور کر دیتے ہیں۔ جس وقت انگریزوں نے جان لیا کہ ان میں ہندوستان
کے اندر تفرقہ ڈال کر فتح کر لینے کی قوت موجود ہے تو انھوں نے اپنے حقیقی
عزائم کا جرأت مندانہ اعلان کرنے کے بجائے خوشنما تدبیروں کا سلسلہ اختیار
کر لیا۔ اُنھیں اندازہ ہو گیا کہ حق فتح و تسخیر کا جانب دارانہ عذر ——— جس کی
لاٹھی اس کی بھینس کا پُرانا نظریہ ——— پیشتر کی طرح پسندیدہ نہیں
سمجھا جاتا تھا[1]

مطلب یہ کہ زور اور جبر کو پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا تھا، للٰذا مکر و فریب اور عیاری و دغابازی
شروع کر دی۔ پہلے دوستی کا یقین دلایا، آہستہ آہستہ حالات اپنے ڈھب کے بنا لیے
نہ کوئی عذر رکھ کر حکمران کا خاتمہ کر دیا۔

ہربرٹ سپنسر کا بیان ہربرٹ سپنسر انگلستان کا مشہور فلسفی تھا۔ اس کی زبان سے ایسٹ
انڈیا کمپنی کے عہدِ حکومت کی سرسری حالت کا اندازہ سُن لیجیے:

ذرا اس نازیبا معاشرے کی حالت کا تصور کرو۔ جس کا نقشہ ونسی ٹارٹ[2] نے
کھینچا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ انگریز من مانے نرخوں پر دیسی باشندوں کو خرید و فروخت
کے لیے مجبور کرتے تھے۔ اگر وہ اس پر راضی نہ ہوتے تھے تو انھیں تازیانے یا قید

---

[1] بہ حوالہ باسو ص ۴۳

[2] HENRY VANSTART (۱۷۳۲ء۔ ۱۷۷۰ء) یہ ۱۷۵۹ء میں بنگال کا گورنر بن
گیا تھا۔ اس نے دو کتابیں لکھیں۔ ایک "بنگال میں فسادات کے متعلق اصل کاغذات"
دوم "بنگال میں سیاسی کاروبار کی سرگزشت" ۱۷۶۰ء۔ ۱۷۶۴ء

کی سزا دی جاتی تھی۔ وارن ہیسٹنگز نے ایک سفر کے حالات بیان کیے ہیں۔ اُنھیں سامنے رکھ کر خود اندازہ کرو کہ حالت کس قدر ابتر ہو چکی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے پہنچنے سے پیشتر بہت سے چھوٹے چھوٹے قصبے اور سرائیں بالکل خالی ہو چکی تھیں۔

بے دردانہ بد عہدی حکام کی مستقل پالیسی تھی۔ امیروں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑائی کے لیے آمادہ کر دیا جاتا۔ ایک کو امداد دے کر کامیاب بنایا جاتا۔ پھر غلط روی کا الزام لگا کر دوسرے کو تخت سے اتار دیا جاتا۔ جن امیروں نے انگریزوں کا سہارا قبول کر لیا تھا، ان کے قبضے میں حرص افروز خطے تھے۔ خراج کی بھاری رقمیں لے لے کر پیسے اُنھیں مفلس بنا دیا گیا۔ جب ان میں مطالبات پورے کرنے کی سکت نہ رہی تو سمجھ لیا گیا کہ وہ غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ سزا کے سلسلے میں انھیں مسند سے اتار دیا گیا۔ ہمارے زمانے تک یہ ہوتا رہا ہے کہ نام نہاد شرفاء ہاتھیوں پر سوار ہو کر غریب کسانوں کی فصلوں میں سے گزرتے ہیں اور رسد کے طور پر دیہاتیوں سے جو کچھ لیتے ہیں اس کی قیمت ادا نہیں کرتے۔ ہمارے زمانے تک یہ ہو رہا ہے کہ اندرونِ ملک کے لوگ فرنگی کی شکل دیکھتے ہی جنگلوں میں بھاگ جاتے ہیں۔[1]

بنگال، بہار اور اڑیسہ مشرقی ہندوستان میں بنگال، بہار اور اڑیسہ بہت بڑے اور زرخیز صوبے تھے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے انھیں میں قدم جمائے۔ کلکتہ بھی یہیں واقع تھا، جسے مدت دراز تک انگریزی مقبوضات میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ ان صوبوں کے تعلق میں انگریزوں کی عیاری اور فریب کاری اتنی مرتبہ دہرائی جا چکی ہے کہ اب

---

[1] بہ حوالہ باسوص ۹۵

اس میں کوئی ندرت باقی نہیں رہی۔ تاہم یہاں اس کا خاکہ پیش کر دینا ضروری ہے :

۱۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کا اصل ناظم سراج الدولہ تھا۔ اس سے جھگڑا پیدا کیا۔ پھر صلح کا معاہدہ ہو گیا۔ بایں ہمہ امیروں اور درباریوں خصوصاً میر جعفر سے خفیہ ساز باز کر کے سراج الدولہ کو ختم کر دینے کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ اس سلسلے کو کامیاب بنا کر سراج الدولہ کو مسند سے محروم کیا گیا اور اس بیچارے کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

۲۔ میر جعفر نے نظامت کی خاطر اپنے آقا سے غداری کی اور انگریزوں کے لیے کامیابی کا دروازہ کھولا، اسے نظامت ضرور دی گئی لیکن بے اندازہ رقمیں وصول کی گئیں۔ بلکہ مالی مطالبے کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ جب میر جعفر نے تنگ آکر مالی مطالبے پورا کرنے میں بے بسی ظاہر کی تو اُسے مسند سے اتار کر اس کے داماد میر قاسم کو ناظم بنا دیا گیا۔

۳۔ میر قاسم بھی لوٹ کا سلسلہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا تو اس سے جنگ ہوئی۔ وہ شکست کھا کر روپوش ہوا اور باقی عمر دہلی کے نواح میں بہ حالت گمنامی بسر کر دی، پھر دوبارہ میر جعفر کو مسند نظامت پر بٹھا دیا گیا۔

۴۔ اس اثنا میں بادشاہ دہلی کو چھبیس لاکھ روپے سالانہ دینے کے وعدے پر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کی گئی تھی لیکن بادشاہ الہ آباد سے اپنے دارالسلطنت (دہلی) کی طرف روانہ ہوا تو بادشاہ کے چھبیس لاکھ روپے ضبط کر لیے گئے اور اس کے علاقے شجاع الدولہ کے ہاتھ فروخت کر کے روپے لیے گئے۔

گویا نہ سراج الدولہ سے وفا کی، نہ میر قاسم سے، نہ میر جعفر سے اور نہ بادشاہ دہلی سے۔ جس سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہاتھ آیا، فائدہ اٹھایا، جب اسے بے مصرف دیکھا تو کھوٹے سکے کی طرح اٹھا کر پھینک دیا۔

جنگ پلاسی کی حقیقت کہا جاتا ہے کہ انگریزی حکومت کا بنیادی پتھر معرکۂ پلاسی میں رکھا گیا، یہ بالکل غلط ہے۔ انگریزی حکومت کا آغاز دغا بازی، فریب کاری اور محسن کشی سے ہوا۔ اسی طرح یہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ جنگ پلاسی میں نہ انگریزوں کو قوت کے بل پر فتح حاصل ہوئی تھی اور نہ عساکر بنگال نے بے توفیقی یا ناطاقتی کے باعث شکست کھائی تھی۔ کامیابی کی کلید انگریزوں، میر جعفر اور بعض دوسرے درباریوں کی سازش تھی اور یہ سازش دغا بازی و مکاری پر مبنی تھی۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ اس ڈرامے کا کوئی بھی سین دغا بازی، مکاری اور فریب سے خالی نہ تھا۔

۱۔ سراج الدولہ کے خلاف کال کوٹھڑی کی جھوٹی اور بے بنیاد تہمت تراشی گئی اور اسے ساری دنیا میں پھیلایا گیا۔ سراج الدولہ کے حملے کے وقت انگریز کلکتہ سے بھاگے تو ان میں سے بعض کی عورتیں بھی پیچھے رہ گئی تھیں۔ امیر بیگ نے اپنی جان پر کھیل کر ان عورتوں کو بچایا اور انگریزوں کے پاس پہنچا دیا۔ اس غریب کا ذکر کہیں نہیں آیا، حالانکہ میر جعفر کے ساتھ ساز باز کا رشتہ استوار کرنے کا ذمہ دار بھی یہی امیر بیگ تھا۔

۲۔ امیر چند سیٹھ بھی اس سازش میں شریک تھا۔ جب اس نے تیس لاکھ کی موعودہ رقم مانگی تو اس کے ساتھ بھی دغا بازی کی گئی۔ اس دغا بازی کا انکشاف ہوا تو امیر چند ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اسی حالت میں وفات پائی۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان دیسی حکمرانوں میں سے میسور کا فرمانروا حیدر علی پہلا شخص تھا، جس نے انگریزوں کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا۔ اس کی دوررس نگاہ نے بھانپ لیا کہ اگر انگریزوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تو ملک خوفناک آفات کا ہدف بن جائے گا۔ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کیا جا سکتا ہے، قوت کے خلاف قوت لائی جا سکتی ہے۔ دھوکے، فریب اور دغا بازی سے عہدہ برا ہونے کی اس

کے سوا کیا صورت ہے کہ خود اس فن میں کمال پیدا کیا جائے؟

حیدر علی کی تمام کوششیں انگریزوں کو ختم کر دینے کے لیے وقف رہیں۔ ایک مرتبہ تو وہ چھ ہزار چیدہ سوار لے کر ایک سو تیس میل کا فاصلہ بجلی کی تیزی سے طے کر کے مدراس کے سامنے جا نمودار ہوا۔ انگریزوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ انھوں نے گڑگڑا کر صلح کی درخواست پیش کر دی۔ ہومز نے لکھا ہے کہ احاطہ مدراس کی کمزور حکومت پر لرزہ طاری ہو گیا حالانکہ اسی کی احمقانہ روش نے حیدر علی کو مشتعل کر کے لڑائی پر آمادہ کیا تھا۔

حیدر علی جس حقیقت پر پہنچ چکا تھا، اس سے نظام، مرہٹوں اور ناظم کرناٹک کو بھی بار بار آگاہ کرتا رہا۔ اس کے فرزند ٹیپو سلطان نے بھی زندگی اسی مقصد کی نذر کر دی، لیکن نظام اور مرہٹے کوئی بھی شایان شان کام نہ کر سکے۔ صرف اس وہم میں مبتلا رہے کہ انگریزوں کے ساتھ ہو کر سلطنت میسور کو ختم کر دیں۔ جس سے ان پر خوف طاری تھا۔ وہ ختم ہو گئی تو انگریزوں نے نظام کو اس درجہ بے دست و پا بنا دیا کہ اس کا عدم اور وجود برابر رہ گیا اور مرہٹوں کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ فیصلے کی آخری ساعت ان کے سامنے آئی ہو گی تو یقین ہے، ٹیپو سلطان شہید کی روح پاک بار بار انھیں سناتی ہو گی۔

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

غرض سلطنت میسور کی تباہی بھی انگریزوں کی جنگی قوت کا کارنامہ نہ تھی بلکہ دیسی حکمرانوں، خصوصاً نظام اور مرہٹوں کی نالائقی کوتہ اندیشی اور تفرقہ آرائی ہی کا نتیجہ تھی۔

ایک کے بعد ایک

آپ کو یاد ہو گا، دوسری جنگ یورپ میں چرچل نے بار بار ہٹلر کے خلاف یہ الزام لگایا تھا کہ وہ ایک کے بعد ایک کو پکڑتا اور اس کا گلا گھونٹتا ہے۔ چرچل کو یہ کیوں کر معلوم ہوا؟ اس طرح کہ انگریز ہر جگہ، خصوصاً پاک و ہند میں اسی پالیسی پر کاربند رہے تھے یعنی وہ بھی ایک ایک کو ختم کرتے رہے۔

۱۔ پہلے سراج الدولہ کو میر جعفر کے ذریعے سے ختم کیا اور میر جعفر کے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔

۲۔ پھر سلطنت میسور کو مرہٹوں اور نظام کے ذریعے ختم کیا۔

۳۔ یہ ہو چکا تو کبھی مرہٹوں کے خلاف نظام سے کام لیا اور کبھی نظام کے خلاف مرہٹوں کی قوت کا دباؤ ڈلوالیا۔

۴۔ پھر مرہٹوں کے مختلف رؤسا ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہے۔ اس صورتِ حال سے بھی انگریزوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

۵۔ کمال یہ ہے کہ ابتدا میں صرف تین باتوں پر خاص زور دیا جاتا تھا، جو بہ ظاہر بہت بے ضرر سی تھیں۔ ایک یہ کہ ساحلی علاقہ کسی دیسی حکمران کے زیر اثر نہ رہے تاکہ کوئی دوسری یورپی طاقت وہاں نہ پہنچ جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی فرنگی کو ملازم نہ رکھا جائے۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ معاملات کی باگ ڈور صرف انگریزوں کے قبضے میں رہے۔ تیسرے یہ کہ انگریزی فوج اندرونی اور بیرونی حفاظت کا ہر فرض انجام دے گی۔ اور اس کا خرچ ریاست دے دیا کرے۔ یہی تین باتیں ہر حکمران کی حکمرانی کا نقش مٹانے اور محو کرنے کا ذریعہ بن گئیں۔

سکھوں کا المیہ

اس سلسلے میں سکھوں کا المیہ بڑا ہی عبرت ناک ہے۔ تعجب ہے کہ اب تک مؤرخوں نے اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔

مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال میں سکھوں نے ستلج اور جمنا کے درمیان چند مسلیں قائم کر لی تھیں، جن میں سے انجام کار رنجیت سنگھ نے خاصی شہرت حاصل کی۔ اگر رنجیت سنگھ ذرا دور اندیشی سے کام لیتا تو تمام سکھوں کو متحد کر کے ایک پائدار حکومت کا انتظام کر سکتا تھا، لیکن اس نے ذاتی برتری کے جنون میں ستلج اور جمنا کے درمیان کی سکھ مسلوں کو بدظن کر دیا۔ وہ لوگ بھی کوتہ اندیش اور بے بصر تھے، جب دیکھا کہ اپنے ایک ہم قوم کی طرف سے حملے کا ہدف بن رہے ہیں۔

تو نفع نقصان کا اندازہ کیے بغیر اُٹھے اور انگریزوں کی آغوش میں چلے گئے

۱۸۰۹ء کا معاہدہ

رنجیت سنگھ کو پھر بھی ہوش نہ آیا۔ اس نے اپنوں کو غیروں کے قبضے سے نکال کر اپنے ساتھ ملانے کے بجائے انگریزوں سے معاہدہ کر کے ستلج کو اپنی اور انگریزی سلطنت کے درمیان حدِ فاصل بنا لیا۔ گویا سکھوں کی نصف قوت انگریزوں کے پاس چلی گئی، باقی نصف کا رئیس رنجیت سنگھ اس بنا پر خوش ہو گیا کہ اب کسی خلش اور خدشے کے بغیر شمال اور مغرب میں اپنے حدود بڑھا سکے گا، اگرچہ حقیقت حال کے اعتبار سے اس نے سکھوں کے مستقبل پر سب سے کاری ضرب لگائی تھی۔

اُس نے ایک طرف سکھوں کے دو ٹکڑے کیے، دوسری طرف اپنے دائرہ حکومت کی توسیع کے لیے ایسی کوتہ اندیشی کی پالیسی اختیار کی کہ ہر گروہ غیر مطمئن ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب انگریز ہندوستان کے معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک ہی جست میں دریائے ستلج سے پشاور جا پہنچے۔ سکھوں کی حکومت کا نشان تک باقی نہ رہا اور ایک بھی آنکھ سکھوں کی تباہی پر اشک باری کے لیے نہ مل سکی۔ آخر میں سکھوں کے لیے فخر کی ایک دستاویز باقی رہ گئی کہ اُنھوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر پورے ملک کو غلامی کی زنجیریں پہنائیں۔ پچاس ساٹھ سال تک وہ اسی سرمایۂ فخر کے سہارے انگریزوں کی نظر میں معتمد علیہ بنے رہے۔

سندھ

سندھ کی مثال سب سے بڑھ کر دردناک ہے۔ وہاں کے امیر ایک طرف انگریزوں سے بدکتے تھے، دوسری طرف انھیں سکھوں کی پیش قدمی کا خطرہ پریشان کر رہا تھا۔ انگریزوں نے معمول کے مطابق فریب کاری سے کام لیا۔ وہ سکھوں کی پیش قدمی کے خطرے کو زیادہ سے زیادہ بھیانک صورت میں پیش کر کے امیروں پر اثر ڈالتے اور اپنے قدم جماتے رہے۔ نہ رنجیت سنگھ میں اتنی وسعتِ قلب اور وسعتِ نظر تھی کہ وہ امیروں کو پورا اطمینان دلا کر انگریزی اثرات کو دور رکھتا اور نہ امیروں میں اتنی ہوش مندی تھی کہ وہ سکھوں کے خطرے

کی روک تھام کے لیے کسی دوسری تدبیر سے کام لیتے اور انگریزوں سے بچے رہتے، جو قریباً ایک سو سال میں بیسیوں دیسی حکومتوں کو ہضم کر چکے تھے۔

امیروں سے حتمی معاہدہ تھا کہ فوج ان کے علاقے میں سے نہ گزاری جائے گی، لیکن پہلی جنگ افغانستان میں انگریزوں نے اس شرط کی خلاف ورزی کی، بلکہ فوج گزارنے کے علاوہ امیروں کو مجبور کیا کہ وہ شاہ شجاع کو روپیہ دیں۔ جنگ افغانستان ختم ہوگئی تو انگریزوں نے امیروں کو دبانا شروع کیا کہ تم نے تو ہماری مشکلات کے وقت دوستی کا حق فراموش کر دیا تھا۔ اب نیا معاہدہ کرو۔ مجوزہ معاہدہ امیروں کے استقلال کو ختم کرتا تھا۔ وہ بیچارے تذبذب میں پڑے تو فی الفور ان پر حملہ کر دیا گیا۔

کیئی نے خوب لکھا ہے۔

> کہا جاتا ہے کہ امیرانِ سندھ نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی۔ معلوم ہوتا ہے حکومت برطانیہ نے معاہدے توڑنے کا حق صرف اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اگر معاہدوں کو توڑنے کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا کہ علاقے چھن جاتے تو آج حکومت برطانیہ کے پاس دریائے برھم پتر اور دریائے سندھ کے درمیان ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی باقی نہ رہتا۔[1]

گویا انگریزوں نے اتنے معاہدے توڑے کہ اگر ہر عہد شکنی کے معاوضے میں علاقہ لے لیا جاتا تو انگریز اس ملک کے مشرق سے مغرب تک ایک بھی علاقے کے مالک نہ رہتے۔

حقیقت حال یہ تھا انگریزوں کے تصرفات کا ایک سرسری خاکہ۔ ہم نے اس کے بعض اہم حصے بالکل نظر انداز کر دیے۔ مثلاً روہیلوں کی تباہی کے لیے سازباز، روپے کی خاطر چیت سنگھ والیِ بنارس اور بیگمات اودھ پر بے پناہ ظلم و جور، اودھ اور دوسری ریاستوں سے

---

[1] بحوالہ باسو ص ۳۴

سلوک وغیرہ۔ اس لیے کہ مقصود تفصیل نہ تھی، مقصود صرف یہ تھا کہ حقیقت حال کی ایک تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے۔

سوچیے کہ یہاں کون سی قوت استعمال ہوئی؟ دیسی حکمران اور دیسی سپاہی لڑے یا زیادہ تر لڑائیاں انھوں نے کیں۔ بوجھ ان پر پڑا اور حکومت انگریزوں کی استوار ہوئی۔ بنر دولت ثروت کی ندیاں انگلستان میں بہنے لگیں۔

بازی اور سر

یہ حکومت تھی جس کے خلاف ۱۸۵۷ء میں آزادی کی جنگ شروع ہوئی، اس لیے کہ:

۱۔ یہ اجنبی تھی، جسے مدت تک عام لوگ دیسی حکمرانوں کی کارندہ سمجھتے رہے۔ انھیں اندازہ نہ تھا کہ یہ براہ راست ہر شے کی مالک اور مختار بن گئی ہے۔

۲۔ یہ سراسر دھوکے، فریب اور دغا بازی سے ملک پر قابض ہوئی تھی۔

۳۔ اس سلسلے میں عوام کو سخت دھوکا اس وجہ سے ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارہ تھی اور سلطنت برطانیہ کو براہ راست اس کمپنی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ملکی لوگ سادہ لوحی سے سمجھتے رہے کہ تجارتی کمپنی ملک کی والی نہیں بن سکتی۔ وہ تو صرف حاکموں کے لیے سب کچھ کر رہی ہے۔ یہ اندازہ نہ تھا کہ ایک خاص وقت تک خاص وضع کی نقاب اوڑھ کر سب کچھ قبضے میں لے لیا جائے گا تو پھر نقاب اٹھا دی جائے گی۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ دیکھنے والے اس شعبدے کی اصلیت کے متعلق کس درجہ فریب نظر میں مقید تھے۔

۴۔ اس ملک میں یہ پہلی اجنبی حکومت تھی۔ اس سے پیشتر دو ہزار سال میں جتنے بھی گروہ آئے وہ مستقل طور پر یہاں کے باشندے بن چکے تھے۔

اُسے توڑنے اور درہم برہم کرنے کے لیے ایک زبردست کوشش کی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ بے مثال قربانیوں کے باوجود کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ واضح رہے کہ عظمت د

برتری ہمیشہ اصل کوشش میں ہوتی ہے نہ کہ نتائج میں۔ نتائج کا حسب مراد ہونا یقیناً ہر لحظ مطلوب ہوتا ہے۔ تاہم اگر کوشش کی عظمت و برتری کو نظر انداز کردیا جائے تو اس دُنیا کی جہاد آرائیوں اور ایثار جوشیوں کے تین چوتھائی مرقعے بالکل بے وقعت رہ جائیں۔ سوداؔ کیا خوب کہہ گیا ہے۔

سوداؔ قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن! بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا!
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز؛ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اسی کوشش نے آہستہ آہستہ اجنبیوں کے خلاف ہمہ گیر احساس پیدا کیا، جو انجام کار آزادی کا ایک بے پناہ سیل بنا، یہاں تک کہ انگریز ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

باب ۲

جنگ آزادی کے اسباب

(۱)

سرسید کے افکار ہر واقعے کے اسباب و عوامل ہوتے ہیں، جو اس کے وقوع کا موجب بنتے ہیں۔ جنگ آزادی کے بھی اسباب تھے، جن پر اہل قلم نے مفصل بحثیں کی ہیں، سرسید مرحوم نے ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر مرتب فرما دیا تھا، جو الگ بھی چھپا تھا، خواجہ حالی مرحوم نے اسے "حیاتِ جاوید" میں بہ طور ضمیمہ شامل کر دیا تھا اور حال میں وہ کراچی سے بھی شائع ہوا ہے۔ سرسید نے اس مسئلے پر گفتگو میں سلبی اور ایجابی دونوں پہلو پیشِ نظر رکھے۔ یعنی بعض بیان کردہ اسباب کی نفی کی اور بعض کا اثبات فرمایا۔ نفی کے سلسلے میں ان کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ چپاتی کا بٹنا کسی سازش کا نتیجہ نہ تھا۔

۲۔ روس و ایران کی بھی کوئی سازش نہ تھی۔ شاہ دہلی نے ممکن ہے شاہ ایران کو کوئی خط لکھا ہو، لیکن وہ سرکشی کی بنیاد نہ تھا۔

۳۔ اودھ کی ضبطی بھی عام فساد کا باعث نہیں ہو سکتی تھی۔

۴۔ فوج میں بھی پہلے سے کوئی سازش موجود نہ تھی، نیز فوج اور شاہ دہلی کے درمیان بھی نامہ و پیام کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

۵۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ قوم نے غیروں کی حکومت اٹھا دینے کی سازش کی تھی۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض امور کے متعلق سر سید مرحوم کو غلط فہمی ہوئی۔ مثلاً ان کی نفی عام و ہمہ گیر سازش پر تو یقیناً حاوی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک مخصوص گروہ کے درمیان سازش نہ تھی۔ چپاتی کے بٹنے کی مصلحت یا خفیہ پیام ہر شخص پر واضح تھا یا نہ تھا، تاہم یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فعل محض ایک تماشا تھا اور اس کے پس پردہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ غیروں کی حکومت اٹھا دینے کی کوشش میں پوری قوم یقیناً شریک نہ تھی۔ اور پوری قوم کب کسی کوشش میں شریک ہوتی ہے، تاہم اس واقعے سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک خاصی بڑی جماعت اسی غرض سے کوشاں تھی اور اس کوشش نے عمومی ناراضی ہی کی بناء پر یکایک ہمہ گیر اشتعال پیدا کر دیا۔

حقیقی اسباب سر سید حقیقی مثبت اسباب کی کیفیت ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں:

۱۔ رعایا میں غلط فہمی یعنی حکومت کی تجاویز کا مطلب غلط سمجھنا۔

۲۔ ایسے ضابطوں اور طریقوں کا جاری ہونا جو اہلِ وطن کی عادات کے مناسب نہ تھے۔

۳۔ رعایا کے اصل حالات اور اطوار و عادات سے حکومت کا ناواقف رہنا۔

۴۔ جن امور کا بجا لانا حکومت کے لیے ضروری تھا، ان کا ترک۔

۵۔ فوج کی بدانتظامی اور بے اہتمامی[1]

اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان اسباب کی بنیاد و اساس انگریزی حکومت کی اجنبیت اور بیگانگی کے سوا کچھ نہ تھی یا کہہ لیجیے کہ یہ تمام باتیں انگریزوں کی اجنبیت کے برگ و بار تھیں۔ پھر سر سید خود ہی فرماتے ہیں کہ بہت سی باتیں مدت دراز سے لوگوں کے دلوں میں فراہم ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا۔ صرف اس کے شتابے

---

[1] اسباب بغاوت ہند ۸ — ۱۲

میں آگ لگنی باقی تھی، فوج کی بغاوت نے اس کا بندوبست کر دیا۔[1]

اگر ناراضی کے اسباب کا میگزین فراہم ہو چکا تھا اور لوگوں کے دلوں میں حکومت سے نفرت موجود تھی تو باقاعدہ سازش ہوتی یا نہ ہوتی، جو کچھ ہوا وہ بہرحال کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ ایسی ہی حالت کو عام اصطلاح میں سازش کہا جاتا ہے خواہ اس کا دائرہ محدود مانا جائے یا وسیع۔

تھیوفلس مٹکاف

تھیوفلس مٹکاف نے بھی میرزا معین الدین حسن خاں اور منشی جیون لال کے روزنامچوں کا انگریزی ترجمہ شائع کرتے وقت جنگ آزادی کے اسباب پر بحث کی تھی۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک خاص طبقے کی سازش تھی، جسے غیر دانشمند طریق پر باز مانی کے لیے مجبور کر دیا گیا۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک قومی تحریک تھی، جس کا مدعا یہ تھا کہ ملک کو اجنبیوں کے تسلّط سے آزاد کرا یا جائے اور اس کی جگہ اسلامی حکومت قائم کی جائے۔

۳۔ بعض کا خیال ہے کہ لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی اس کا حقیقی سبب تھی، یعنی الحاق کی پالیسی جس میں اودھ کا الحاق بھی شامل تھا۔

۴۔ کیئی نے آوٹرم کا بیان درج کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے الحاق اودھ سے بہت پہلے بغاوت کی تحریک جاری کر دی تھی۔

۵۔ بعض مصنفین نے یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ سپاہ کو قدیم حکمران خاندانوں کے کارندوں نے گمراہ کر دیا تھا۔

۶۔ ایک مصنف کا خیال ہے کہ بغاوت دربار ایران کے ایک شاہی فرمان سے پیدا شدہ مذہبی

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص ۳۔

جوش کی بنا پر شروع ہوئی۔

۷۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ خالص اسلامی تحریک تھی، بعض کے نزدیک ہندو اور مسلمان دونوں اس میں یکساں شامل تھے۔[1]

ان میں سے بعض اسباب یقیناً درست ہیں اور بعض بالکل بے سروپا ہیں۔ مثلاً اسے خالص اسلامی تحریک قرار دینا، اس لیے کہ اس کے کارفرماؤں اور کارکنوں میں ہندو اور مسلمان دونوں کی شرکت کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔

ضروری نکتہ

اسباب پر غور و فکر سے پیشتر یہ جان لینا ضروری ہے کہ ان کے درجات و مراتب ہوتے ہیں۔ بعض اسباب کی حیثیت بنیادی اور اساسی ہوتی ہے اور بعض کی اضافی و تائیدی۔ پھر آخری قسم کے اسباب میں بھی بعض ایسے ہوتے ہیں، جن سے بنیادی اسباب کو تقویت پہنچتی ہے اور ان کی شدت و وسعت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بعض فوری اشتعال اور ناگہانی برہمی کا باعث بن جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ تمام اسباب کو ان کے اصل مقام پر رکھ کر غور کریں۔ اسی طرح حقیقت حال و انکشاف اور برہنہ صورت میں ہمارے سامنے آئے گی اور ہم صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔ اگر اس طریق فیصلہ کو نظر انداز کیے رکھا تو اسباب پر غور و فکر سے ہم کسی صحیح، واضح اور روشن نتیجے تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

حقیقتِ حال

جنگ آزادی کا بنیادی اور اساسی سبب ایک اور صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ انگریزی حکومت اجنبیوں کی حکومت تھی۔ ابتدا میں انھیں مختلف دیسی حکمرانوں کے کارندے، ایجنٹ اور مختار سمجھ کر قبول کیا گیا۔ جب معلوم ہوا کہ اُنھوں نے چرافی اور عیاری سے سب کچھ سنبھال لیا تو ان کے خلاف ہمہ گیر نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ کوئی بھی

---

[1] دو روزنامچے (انگریزی) ص ۵–۶

غیرت مند محبِ وطن اجنبی تسلّط کو بہ طیبِ خاطر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میر جعفر یا اس جیسے دوسرے آدمیوں کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

آپ سر سیّد کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ "قوم نے غیروں کی حکومت اٹھا دینے کے لیے اقدام کیا یا تھیو فلس مٹکاف کی تعبیر کے مطابق سمجھ سکتے ہیں" یہ ایک قومی تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کو غیروں کے تسلّط سے نجات دلائی جائے"۔

باقی رہے دوسرے اسباب جن کا ذکر سر سیّد نے کیا ہے یا جن کا ذکر ۱۸۵۷ء کے متعلق عام کتابوں میں ملتا ہے تو وہ سب اصل بنیادی سبب کے لیے تقویت و استحکام کے باعث بنے۔ مثلاً اہلِ وطن کی عادت کے خلاف قاعدے اور ضابطے جاری کرنا، ان کے حالات سے بے خبر رہنا، ضروری امور سے بے پروائی اختیار کرنا، عیسائیت کی تبلیغ کے لیے حکام کا سرگرمی دکھانا یا مختلف ریاستوں اور علاقوں کے الحاق پر مُصر ہونا یا اس قسم کے دوسرے امور۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں انگریزوں کے اجنبی اور بیگانہ ہونے کی قاطع اور دل خراش دلیلیں تھیں، جن کے باعث اجنبیّت زیادہ سے زیادہ ناقابلِ برداشت بنی۔ چربی والے کارتوسوں سے فوری اشتعال پیدا ہوا اور ملک کے طول و عرض میں آگ لگ گئی۔

اب ہم بنیادی سبب پر نہیں بلکہ تائیدی و اضافی اسباب میں سے بعض پر اجمالاً گفتگو کریں گے۔

ویلزلی اور ڈلہوزی

۱۸۵۷ء سے پیشتر دو گورنر جنرل ایسے آئے، جنھیں جوشِ غضب و الحاق میں خاص شہرت حاصل ہے: ایک ویلزلی اور دوسرا ڈلہوزی۔

ویلزلی کے عہد میں بھی انگریزی حکومت بہت پھیلی اور متعدد علاقے انگریزوں کے قبضے میں آئے، نیز ان کے تسلط کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے دہلی اور آگرہ تک پہنچ گیا، لیکن یہ تصرفات اس وجہ سے ہمہ گیر ناراضی پیدا کرنے کے موجب نہ بنے کہ اوّل ویلزلی کا طریقہ ذرا محتاط تھا۔ مثلاً اُس نے میسور کی سلطنت ختم کی، تاہم اُس کی تقسیم کے وقت جہاں ایک حصہ خود سنبھالا، وہاں کچھ علاقے نظام اور

مرہٹوں کو دے دیے اور قدیم ہندو حکمران خاندان کی ریاست بھی قائم کر دی۔ اسی طرح مرہٹوں کو نقصان ضرور پہنچایا لیکن ان کی ریاستیں بہ دستور قائم رکھیں۔ مغل بادشاہ یقیناً انگریزوں کا وظیفہ خوار بن گیا، لیکن انتظام کی ظاہری وضع وہیئت ایسی تھی کہ معلوم ہو، انگریز محض بادشاہ کے مختار کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں جیسے اس سے پیشتر سندھیا کر چکا تھا اور قدیم شاہی آداب و رسوم ٹھیک ٹھیک پورے ہوتے تھے۔

ڈلہوزی آیا تو اس نے جھاڑو اٹھالی اور ہر علاقے کو کوڑے کرکٹ کی طرح سمیٹ کر انگریزی اقتدار کے ٹوکرے میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ کارکردگی یا مختاری کے پردے بھی آہستہ آہستہ بیچ میں سے اٹھ گئے اور انگریزی اجنبیت بالکل بے نقاب ہو گئی، لہٰذا ناراضی کے بارود خانے میں آگ لگ گئی۔

الحاق کی پالیسی اس سلسلے میں سب سے پہلے الحاق کی پالیسی آتی ہے جو انگریزوں کی اجنبیت و بیگانگی کا کھلا ہوا ثبوت تھی اور جس کی وجہ سے مختلف ذی اثر خاندانوں کے افراد انگریزوں کے خلاف زبردست تحریک چلانے کے لیے آمادہ ہوئے:

۱۔ ہارڈنگ نے سکھوں کی حکومت کا صرف ایک حصّہ چھینا تھا اور کشمیر کو گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ ڈلہوزی نے پورا پنجاب لے لیا اور دلیپ سنگھ کو معزول کر کے فتح گڑھ (یوپی) پہنچا دیا۔ اس نے عیسائیت قبول کر لی، شاید اس لیے کہ تخت حکومت حاصل کرنا سہل ہو جائے گا۔ لیکن عیسائیت اسے انگریزوں کے قریب نہ لا سکی اور آخری دَور میں اس کے ساتھ جو بدسلوکیاں ہوئیں، وہ بڑی ہی دردانگیز اور عبرت افزا تھیں۔

۲۔ ستارہ کی چھوٹی سی ریاست سیواجی کے خاندان کے لیے رکھی گئی تھی۔ معاہدہ یہ ہوا تھا کہ وہ دواماً قائم رہے گی۔ اپریل ۱۸۴۸ء میں ستارا کے راجا نے وفات پائی۔ اس کے اولاد نہ تھی، لیکن ہندو دھرم کے رواج کے مطابق اس نے ایک لڑکے کو متبنّیٰ

بنا لیا تھا۔ ڈلہوزی نے متبنیٰ کو راجا بنانا منظور نہ کیا اور ریاست ضبط کر لی۔

۳۔ ۱۸۵۳ء میں رگھوجی بھونسلا والیِ ناگ پور فوت ہُوا۔ اس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی اور غالباً اس خیال سے اس نے کسی کو متبنیٰ بھی نہ بنایا تھا کہ عوام اسے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم سمجھ لیں گے۔ تاہم ملک کے رواج اور ہندو دھرم کے مطابق اس کی بیوہ متبنیٰ تجویز کر سکتی تھی۔ ڈلہوزی نے وہ ریاست بھی بے تکلف سنبھال لی۔ پھر محلات کا سارا اسباب انتہائی بے دردی سے برسرِ عام نیلام کرایا یہاں تک کہ ایک رانی بدسلوکی پر خفگی کے جوش میں پورے محل کو آگ لگا دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اسی طرح جھانسی، سنبھل پور، تنجور، کرناٹک وغیرہ ریاستیں ضبط کر لی گئیں۔

باجی راؤ ثانی پیشوا

باجی راؤ ثانی آخری پیشوا ۱۸۱۸ء کی جنگ میں شکست کھا کر مسند سے دست بردار ہوا تھا اور آٹھ لاکھ روپے سالانہ کی پنشن لے کر بٹھور میں آ بیٹھا تھا، جو کان پور کے نزدیک ایک مشہور مقام ہے۔ ۲۸۔ جنوری ۱۸۵۱ء کو وہ ۷۷ سال کی عمر میں لاولد فوت ہُوا۔ اس نے تین بچوں کو متبنیٰ بنایا تھا: اول ڈھونڈو پنت نانا، دوم پنڈورنگ راؤ اور سوم گنگا دھر راؤ۔ پنڈورنگ راؤ فوت ہو گیا تو اس کے بیٹے سداشیو پنت کو اس کی جگہ مل گئی۔ باجی راؤ نے اپنی وصیت میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ میرے دو بیٹے ہیں اور ایک پوتا اور میرے بعد ڈھونڈو پنت نانا مکھ پردھان کی حیثیت میں میرا وارث ہو گا اور اسی کو پیشواؤں کی گدی کا مالک سمجھا جائے۔

باجی راؤ کی پنشن نانا کو ملنی چاہیے تھی۔ پوری نہ ملتی تو کم از کم اس کا ایک حصہ تو ملنا لازم تھا۔ لیکن ڈلہوزی نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ باجی راؤ جو تبتیس سال میں بہت کچھ جمع کر گیا ہے، اسی پر قناعت کی جائے حالانکہ باجی راؤ کے ساتھ معاہدے میں ایسی کوئی شرط نہ تھی جسے کھینچ تان کر بھی ثابت کیا جا سکے کہ پنشن اسے صرف مدت العمر ملے گی۔ ڈھونڈو پنت نے پنشن کے لیے یہاں بھی کوشش کی، ولایت بھی اپنے وکیل بھیجے تاہم جو فیصلہ ہو چکا تھا، اس میں

ردوبدل نہ ہُوا۔

وہ تمام لوگ جن کی ریاستیں چھنی تھیں، نیز ان کے متوسلین جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی، کسی حالت میں بھی انگریزوں کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے تھے بلکہ سخت دشمن بن گئے، اس لیے کہ انھیں انگریزوں کی اجنبیت، بیگانگی، مرتفع پرستی اور بے دردی کا براہِ راست تجربہ ہو چکا تھا۔

اودھ

سب سے آخر میں اودھ کا معاملہ آتا ہے۔ انگریزوں نے پہلے وہاں دوعملی کی کیفیت پیدا کی، یعنی فوج کا انتظام ۷۶ لاکھ روپے سالانہ کے عوض میں خود سنبھال لیا اور باقی انتظام والیانِ اودھ کے قبضے میں رہنے دیا۔ ولزلی نے جب دیکھا کہ اودھ میں بے قاعدہ لشکر بڑی تعداد میں موجود ہے تو اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہُوا کہ اگر کسی وقت نپولین ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گیا یا زمان شاہ دُرّانی جیسا کوئی من چلا افغان فوج لے کر آ گیا اور اودھ کا بے قاعدہ لشکر اس کا معاون بن گیا تو انگریزی تسلّط کا گھروندا تباہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے والیِ اودھ کے روبرو یہ تجویز پیش کر دی کہ بے قاعدہ لشکر کو ختم کر دیا جائے، اس کی جگہ بھی انگریزی فوج رکھی جائے اور پچاس لاکھ روپے سالانہ کا مزید خرچ برداشت کیا جائے۔ جب اس غریب نے کہا کہ اتنا روپیہ کہاں سے دوں گا تو کہہ دیا کہ علاقہ دے دیا جائے۔ چنانچہ کچھ ضلعے لے لیے، جن کی آمدنی ایک سال میں دُگنی ہو گئی۔

واضح رہے کہ یہ گرانقدر رقم سوا کروڑ روپے (۷۶ لاکھ + ۵۰ لاکھ) اس غرض سے والیِ اودھ کے ذمے نہ ڈالی گئی تھی کہ ملک کا انتظام اچھا رہے۔ مقصود صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار ایک موہوم خطرے سے محفوظ ہو جائے۔ گویا فائدہ صرف انگریزوں کا مطلوب تھا، لیکن اس کا خرچ والیِ اودھ سے وصول کیا گیا اور بے دست و پا بھی اسی کو بنایا گیا۔

بادشاہی کا ڈھونگ

نواب سعادت علی خاں نے اپنی جزرسی سے بہت بڑی رقم جمع کر لی تھی۔ اس زمانے میں مختلف علاقوں کو متاجری پر لینے کا دستور تھا۔ کہا جاتا

ہے کہ نواب سعادت علی خان نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام مقبوضات مستاجری پر لے لینے کی غرض سے روپیہ جمع کیا تھا۔ وہ بے چارا چل بسا اور غازی الدین حیدر کا زمانہ آیا تو اس روپے کی بربادی کے لیے نیا ذریعہ مہیا کر دیا گیا۔

اس کی کیفیت یہ ہے کہ مارکوئیس ہیسٹنگز نے اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی سے ملاقات کرنی چاہی، لیکن شرط یہ عائد کی کہ نذر نہ دوں گا۔ بادشاہ نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اب اس انکار پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ صورت حال کے متعلق بادشاہ کے تصورات کس درجہ غلط اور مہمل تھے، لیکن اس زمانے میں نذر شاہی آداب کا لازمہ سمجھی جاتی تھی۔ ہیسٹنگز نے بادشاہ سے ملاقات نہ کی اور غازی الدین حیدر کو بادشاہ بنا دینے کی تجویز پختہ کر لی۔ مقصود یہ تھا کہ اکبر شاہ کو بتایا جائے۔ انگریز بادشاہی کے جتنے بُت چاہیں قائم کر سکتے ہیں۔

غازی الدین حیدر نے بادشاہی کا سامان فراہم کرنے کے لیے روپیہ اندھا دھند برباد کر دیا اسے یہ خیال نہ آیا کہ جب ایک ایک بات کے لیے ریزیڈنٹ سے منظوری لینی پڑتی ہے تو بادشاہی ہوئی یا نوابی، فرق کیا پڑتا ہے؟ لیکن اس زمانے میں ہر شخص ظواہر پہ جان دیتا تھا اور معنویت سے کسی کو کوئی سروکار نہ تھا، ہنری لارنس نے بالکل درست لکھا تھا کہ:

> نواب غازی الدین حیدر کو بادشاہی کا لقب اختیار کرنے کے لیے اُکسایا گیا
> لارڈ ہیسٹنگز چاہتا تھا کہ اس طرح دہلی اور اودھ کے خاندانوں میں رقابت کے
> جذبات برانگیختہ کر دے

ہیسٹنگز تو جو چاہتا تھا، اس سے بحث نہیں، لیکن ان خاندانوں کو اس رقابت سے کیا فائدہ پہنچتا تھا، جو انگریزوں کے ہاتھ میں کھلونے بنے ہوئے تھے؟ وہ صرف نام و نمود اور الفاظ و خطابات پر مرتے تھے، یہ خیال کسی کو نہ تھا کہ اپنی حیثیت بدلنے اور انگریزوں کے قبض و تصرف سے نجات پانے کی کوشش کی جائے۔

الحاق جو کچھ ہم نے بیان کیا، اُسے اودھ سے انگریزوں کے سلوک کی پوری داستان نہیں کہا

جا سکتا بلکہ یہ اس کے بعض اجزا کا سرسری خلاصہ ہے، جو صرف یہ بتانے کی غرض سے پیش کیا گیا ہے کہ اودھ جیسا بھی تھا، اسے انگریزوں نے خود بنایا تھا۔ اس کا روپیہ مختلف حیلوں بہانوں سے کھایا۔ اس کے انتظام کو مسلسل بگڑنے دیا، حالانکہ جس طرح وہ فوج کا کاروبار بار بار سنبھالتے رہے، اسی طرح انتظامی کاروبار بھی سنبھال کر درست کر سکتے تھے۔ یہ انھوں نے نہ کیا۔

پھر واجد علی شاہ سے پیشتر کئی حکمران ایسے گزر چکے تھے جو ایک لمحے کے لیے بھی مسندِ حکومت پر بیٹھنے کے اہل نہ تھے۔ مثلاً خود غازی الدین حیدر، جسے بادشاہ بنایا گیا یا اس کا بیٹا نصیر الدین حیدر، لیکن اس وقت تک روپیہ انگریزوں کو مل رہا تھا، اس لیے کوئی سوال نہ اٹھایا گیا۔ جب باقی ہندوستان صاف ہو گیا اور صرف اودھ رہ گیا تو پردہ اٹھا دیا گیا اور اس کا الحاق کر لیا گیا حالانکہ واجد علی شاہ اچھا تھا یا بُرا لیکن نصیر الدین حیدر سے یقیناً بہتر تھا۔

اچھا فرض کر لیجیے کہ اودھ کا الحاق وہاں کے عوام کی بہتری کے لیے عمل میں آیا تھا، لیکن الحاق سے انھیں کیا فائدہ پہنچا؟ کیا ان کی اقتصادی حالت بہتر ہوئی؟ کیا عوام و خواص کے درمیان توازن کی کوئی صورت نکالی گئی؟ کیا ملک کی دولت اہلِ ملک کی فلاح کے لیے استعمال ہونے لگی؟ ہر سوال کا جواب نفی میں ہے اور ۱۸۵۶ء سے انگریزوں کے آخری دَور تک نفی ہی میں رہا۔ بس اتنا ہوا کہ شاہی نظام کی جگہ انگریزی نظام جاری ہو گیا۔ انگریزی نظام زیادہ گراں اور مصیبت خیز تھا، اس لیے کہ انگریز بڑی بڑی تنخواہیں لیتے تھے۔ اس سے اور جو مصیبتیں پیدا ہوئیں، ان کی ایک جھلک آیندہ باب میں پیش کی جائے گی۔

باب ۴

جنگ آزادی کے اسباب

(۲)

الحاق کے نتائج

الحاق کا ایک پہلو یہ تھا کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں چھوٹے یا بڑے علاقوں کی حکومت تھی، وہ بے تعلق ہو گئے یا جنھیں بڑی بڑی پنشنیں ملی تھیں، انھیں جواب مل گیا۔ لیکن ہر مقام کی حکومت کا ایک مستقل نظام تھا، جو ہزاروں خاندانوں کی پرورش کا ذریعہ تھا۔ الحاق نے یہ پورا سلسلہ درہم برہم کر ڈالا۔

پھر ہر جگہ سینکڑوں ہزاروں لوگوں کو جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ اصل نظام ٹوٹا تو جاگیریں بھی ضغطے میں پڑ گئیں۔ انگریزوں نے انھیں برقرار رکھنے کے لیے سندوں کا مطالبہ کیا۔ یقیناً سب کے پاس سندیں اور وثیقے نہ تھے، وہ کام کرتے تھے اور جاگیروں پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ نہ کسی نے ان کے حق تصرف کو باطل قرار دیا تھا اور نہ انھیں باقاعدہ سند حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ گویا الحاق میں ہزاروں خاندان مبتلائے مصائب ہوئے اور ان سب کے دل میں یہی احساس پیدا ہو سکتا تھا کہ اجنبی اور بیگانہ حکومت نے ان کے ساتھ بے دردی کا یہ سلوک روا رکھا۔[1]

احاطہ بمبئی اور انعام کمیشن

مرہٹوں کی سلطنت انگریزوں نے ۱۸۱۷ء میں سنبھالی تھی۔ اس میں بہت سے افراد اور خاندانوں کو جاگیریں یا زمینیں ملی ہوئی تھیں

---

[1] تفصیلات کے لیے کیئی جلد اول کا چوتھا باب ملاحظہ فرمائیے۔

جن پر کوئی مالیہ عائد نہ تھا۔ عہدیداروں کو عموماً مشاہروں کی جگہ معافیوں ہی کی شکل میں زمینیں دے دی گئی تھیں۔ اصطلاح میں انھیں "انعام" کہا جاتا تھا۔ مدت تک ان کے متعلق جھگڑا جاری رہا۔ پھر ایک "انعام کمیشن" مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن نے چھتیس ہزار جاگیروں سے تصدیقی سندیں طلب کیں اور ان میں سے کم وبیش اکیس ہزار ضبط کر لی گئیں۔[1]

غور فرمائیے کہ اس سے کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا؟ کیا یہ کہ انگریز بہت اچھے حکمران اور بڑے قانونی لوگ ہیں؟ ہرگز نہیں۔ عام لوگوں پر صرف یہ اثر پڑ سکتا تھا کہ یہ حکمران اصل ونسل، وضع قطع، رنگ ڈھنگ، تہذیب و تمدن اور طریق بود و ماند ہی کے اعتبار سے اجنبی نہیں، بلکہ طریق ملک داری کے لحاظ سے بھی انھوں نے اپنی اجنبیت اور بیگانگی کو زیادہ سے زیادہ دل آزار، مصیبت خیز اور حقوق برانداز شکل میں نمایاں کر دیا ہے۔

انگریزی عدالتیں انگریزوں نے جو عدالتیں قائم کی تھیں، وہ بھی ان کی حکومت کے دوسرے اداروں کی طرح عوام کے لیے حد درجہ مصیبت اور پریشانی کا باعث بن گئیں۔ مثلاً کسی شخص کا مالیہ بروقت ادا نہ ہو سکا اور اس کا مقدمہ عدالت میں پہنچ گیا۔ جج نے اس امر سے کوئی سروکار نہ رکھا کہ ادا نہ ہونے کی وجہ کیا تھی یا وہ کس حد تک جائز یا معقول تھی، چپ چاپ ڈگری دے دی۔ انگریزوں کی سرپرستی میں سود خور مہاجنوں اور ساہوکاروں کو پنپنے کا خوب موقع مل گیا تھا۔ وہ معمولی رقمیں قرض پر دیتے اور عوام کی ناواقفی سے فائدہ اٹھا کر سود در سود کے ذریعے سے بڑی رقمیں بنا لیتے پھر عدالت میں مقدمے دائر ہو جاتے اور وہاں سے من مانے فیصلے کرا لیتے۔ نہ حاکموں کو عوام کی پریشان حالیوں سے آگاہی اور اتنا شعور کہ اندازہ کر لیں، ساہوکار کا اصل قرضہ کتنا تھا اور اس میں سود کتنا شامل ہوا، نیز اس کی تفصیل کیا تھی۔ فیصلے کے ساتھ ہی مقروض کی جائداد فروخت کرنے کا حکم صادر ہو جاتا۔

---

[1] کیئی جلد اول ص ۱۷۷

کیئی نے بنگال کے ایک مقدمے کا حوالہ دیا ہے جس میں چار روپے کی ڈگری کے عوض ایک جاگیر کی نیلامی کا حکم دیا گیا تھا[1]

سوال یہ نہیں کہ حق و انصاف کا تقاضا کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آیا چار روپے یا اسی قسم کی دوسری معمولی رقم کے لیے جاگیروں کی نیلامی کے احکام صادر کرنا ایسی عدالتوں کے لیے زیبا سمجھا جا سکتا تھا جو اہلِ ملک کے درمیان بخششِ انصاف کے لیے معرضِ وجود میں آئی تھیں ؟ ایسے طریقے وہی عدالتیں اختیار کر سکتی تھیں، جن میں ہمدردی، خویشی اور حق و انصاف کا کوئی احساس نہ تھا اور وہ محض افراد کے اعتبار سے نہیں۔ بلکہ ہر لحاظ سے اجنبی و بیگانہ تھیں۔

عیسائیت کی تبلیغ اپنے مذہب کی تبلیغ گناہ نہیں، لیکن اس کے حدود اور اصول ہیں۔ جنھیں ہر وقت پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جب انگریزی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں تو مسیحی پادریوں نے حد درجہ غیر مناسب طریقے اختیار کر لیے۔ وہ بحثوں اور مناظروں میں اشتعال انگیز الفاظ استعمال کرتے۔ انگریز حاکم ہر ممکن ذریعے سے پادریوں کو تقویت پہنچاتے۔ نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ پادریوں کو نظامِ حکومت کا لاینفک جزو سمجھا جاتا۔ سر سیّد مرحوم فرماتے ہیں۔

۱- پادریوں نے جو کتابیں چھاپیں، ان میں دوسرے مذاہب کے مقدس لوگوں کی نسبت رنجدہ الفاظ و مضامین درج ہوتے۔

۲- وعظ اور کتھا کا عام دستور پہلے سے یہ چلا آتا تھا کہ تمام لوگ اپنے اپنے مکانوں یا عبادت گاہوں میں کہتے۔ پادریوں نے خود غیر مذاہب کے مجمعوں، میلوں اور تیرتھوں میں جانا شروع کیا۔ گویا جس اصول پر مسلمان ابتدائے حکومت سے قائم رہے تھے، پادریوں نے انھیں بالکل نظر انداز کر دیا۔

۳- بعض ضلعوں میں پادری تھانوں کے چپراسی ساتھ لے جاتے اور وعظ میں انجیل کے

---

[1] کیئی جلد اول ص ۱۷۸ حاشیہ

بیان پر اکتفا نہ کرتے، بلکہ دوسرے مذاہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقامات کو
بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے۔

۴۔ اسی طرح انھوں نے مشنری سکول جاری کیے اور جو طالب علم عیسائی مذہب کے مطابق
عقائد کا اظہار کرتے، انھیں انعام دیے جاتے ہیں[1]

پادری ایڈمنڈ

۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے ایک طویل خط ملک کے تعلیم یافتہ
آدمیوں، خصوصاً معزز سرکاری ملازموں کے پاس جس کا مضمون یہ تھا کہ

> اب ہندوستان میں ایک عملداری ہو گئی۔ تاربرقی سے سب جگہ کی خبر ایک
> ہو گئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہو گئی۔ مذہب بھی
> ایک چاہیے، اس لیے مناسب ہے تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب
> ہو جاؤ۔[2]

ان تمام باتوں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ لوگوں کو یقین ہو جاتا، اب حکومت نے
عیسائیت کو فروغ دینے اور سابقہ مذاہب کو مٹا ڈالنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔

پادری فنڈر

اس ضمن میں پادری فنڈر کا ذکر ضروری ہے جو ۱۸۵۴ء میں یہاں آیا تھا اور آتے
ہی اسلام پر اعتراضات کا لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ اُسے عربی اور فارسی
سے خوب واقفیت تھی۔ اسلامی علوم کی کتابیں بھی دیکھ چکا تھا۔ سادہ لوح علماء جنھیں عیسائیت سے
چنداں واقفیت نہ تھی، فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔

آخر مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے بہ مقام آگرہ فنڈر سے مناظرہ کیا۔ موضوع
مناظرہ یہ تھا کہ توریت و انجیل میں تحریف ہوئی یا نہیں ہوئی۔ فنڈر نے شکست کھائی اور رو والپس چلا گیا

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص ۱۳، ۱۴

[2] ایضاً ص ۱۷۔ اصل چٹھی کا ترجمہ بھی رسالے میں بہ طور ضمیمہ چھپ گیا ہے۔

تاہم یہ حقیقت پھر ایک مرتبہ واضح ہو گئی کہ پادریوں کو دور دراز کے سفر کر کے یہاں آنے اور لوگوں کے عقائد بگاڑنے کی کوشش کرنے کا حوصلہ کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ یہاں انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی، لہٰذا لوگوں کے دلوں میں یہ بات پختہ ہو گئی کہ جب تک انگریزوں کا اقتدار باقی ہے، اس مصیبت سے نجات نہیں ہو سکے گی۔ انھیں یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ جس سرچشمے سے یہ مصیبت اُبل کر ملک میں پھیلی، اسے جلد سے جلد بند کر دینا چاہیے۔

سکول اور کالج پھر ابتدا میں مدرسوں اور کالجوں کے اندر تعلیم کا طریقہ دوسرا تھا۔ وہ تمام السنہ و علوم پڑھائے جاتے تھے، جن کا پہلے رواج تھا مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت، فقہ، حدیث، ہندو دھرم کی کتابیں وغیرہ۔ ان کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ بعد ازاں عربی اور فارسی کی تعلیم بہت کم ہو گئی، فقہ، حدیث اور دوسری مذہبی کتابیں بند کر دی گئیں، اُردو اور انگریزی کا زور ہوا۔

مذہبی علوم کی تعلیم ختم ہونے پر تشویش تھی ہی، اچانک حکومت نے اشتہار دے دیا کہ جو شخص سرکاری سکولوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ ہو گا یا فلاں فلاں علوم اور زبانِ انگریزی میں امتحان دے کر سند حاصل کرے گا، اُسے دوسروں کے مقابلے میں ملازمت کے لیے ترجیح دی جائے گی[1]

اس طرح تعلیم کے متعلق بھی سوءِ ظن پیدا ہوا۔ حکومت کی نیت کا سوال خارج از بحث ہے، لیکن جس طریق پر پے در پے یہ سب کچھ پیش آیا، اس سے لوگوں کو یہی یقین ہو سکتا تھا کہ اب آہستہ آہستہ سب کو عیسائی بنا لیا جائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ اس عہد کے انگریز عموماً مذہب کے پابند نہ تھے، اس لیے کہ ان کے طور طریقے سراسر خلافِ مذہب اور خلافِ اخلاق تھے، لیکن ایسے لوگوں میں یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ انھیں ہر لحاظ سے مذہب کے شیدائی سمجھا جائے۔ چنانچہ وہ پادریوں کی حوصلہ افزائی میں بڑے ہی سرگرم تھے اور خود بھی سب پر عیسائیت کی برتری واضح کرنے کے لیے مضطرب رہتے تھے۔ بہ حیثیت مجموعی حکومت۔ یقینی طور

---

[1] اسبابِ بغاوت ہند ص ۱۶-۱۷۔

پر غیر جانبدار نہ تھی، جانبدار ہی تھی۔

جیل خانوں میں نئے طریقے

ابتدا میں قیدیوں کو خوراک کے لیے پیسے مل جاتے تھے اور وہ اپنی خواہش کے مطابق کھانا پکا لیتے تھے یا چند آدمی مل کر کھانے کا انتظام کر لیتے تھے۔ پھر اچانک حکومت کے خیال میں غالباً یہ بات آئی کہ اس طرح قیدیوں کا وقت ضائع ہوتا ہے اور جتنی محنت انھیں کرنی چاہیے وہ نہیں کرتے، لہٰذا حکم دے دیا گیا کہ سب کے لیے ایک جگہ کھانا پکے گا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اونچی جاتیوں کے آدمی پنچ جاتیوں کے آدمیوں کا پکایا ہوا کھانا کیوں کر کھائیں؟ اس طریقے کو بھی مذہب میں مداخلت کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اور یہی اثر قبول کیا گیا کہ حکومت ہندوؤں کی ذات پات کو برباد کر کے عیسائیت کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہتی ہے۔

اسی طرح پہلے قیدی اپنے پاس لوٹے رکھ سکتے تھے۔ پھر حکومت نے سوچا کہ پیتل اور تانبے کے برتن بعض اوقات خطرناک مقاصد کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں لہٰذا انھیں بند کر کے مٹی کے برتن دیے گئے، جنھیں ہندو قطعاً استعمال نہیں کر سکتے تھے، ان کی وجہ سے آرہ اور مظفر پور (بہار) میں بڑے ہنگامے برپا ہوئے۔

تبدیل مذہب اور جدّی جائداد

۱۸۵۰ء میں ایک قانون منظور ہوا کہ جو شخص مذہب تبدیل کر لے، وہ جدی جائداد میں سے اپنا حصّہ پانے کا حق دار رہے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اس قانون کو اپنے مذاہب کے خلاف اور عیسائیت کی حوصلہ افزائی کا موجب سمجھا۔ ہندو اس وقت تک شدّت سے اس امر کے پابند تھے کہ غیر مذہب کا کوئی شخص ہندو ہو ہی نہیں سکتا۔ آریا سماج جس نے ہندوؤں کے لیے بھی تبلیغ کا دروازہ کھولا، پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ اگر غیر مذہب کا کوئی آدمی مسلمان ہو جائے تو اس کے لیے مورثوں کے متروکے میں سے، جو پہلے مذہب پر قائم ہوں، حصّہ لینا ممنوع ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس قانون سے نہ تو نو ہندو فائدہ اٹھا سکتے تھے اور نہ نو مسلم، صرف نو عیسائی فائدہ اٹھا سکتے تھے، لہٰذا سب کو یقین ہو گیا کہ یہ قانون لوگوں کو عیسائی بنانے کی سرکاری مہم کا ایک حصّہ ہے۔

بیوگان کی شادی

۱۸۵۶ء میں بیوگان کی شادی کا قانون منظور ہوا۔ لاریب یہ قانون صرف ایک خوفناک مجلسی مرض کے ازالہ کی غرض سے تجویز ہوا تھا، لیکن ہندوؤں نے اسے اپنے مخصوص قومی مراسم میں مداخلت کا ذریعہ سمجھا اور سر سیّد کے قول کے مطابق وہ اسے:

> باعث اپنی ہتک اور عزت اور بربادی خاندان کا جانتے تھے اور یوں بدگمانی کرتے تھے کہ یہ ایکٹ اس مراد سے جاری ہوا ہے کہ ہندو کی بیوائیں خود مختار ہو جائیں اور جو چاہیں سو کرنے لگیں۔[1]

حکومت کی بے خبری

یہ بھی ایک اہم حقیقت ہے کہ حکومت اور حکام عوام کے حالات سے بالکل بے خبر اور ناواقف تھے۔ دیسی حکمرانوں کو ہر چھوٹی بڑی بات کا خود خیال رہتا تھا، اس لیے کہ وہ طبعاً تمام حالات سے آگاہ تھے۔ جانتے تھے کہ تکلیفیں کیا کیا ہیں؟ انھیں کن کن ذرائع سے کام لے کر دُور کیا جا سکتا ہے؟ انگریز اس قسم کے احساسات سے کاملاً بے بہرہ تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اجنبی تھے۔ انھیں صرف یہ چاہیے تھا کہ روپیہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں ملے اور اسے انگلستان پہنچا دیں، خواہ تجارت کے ذریعے سے ملے یا مشاہروں اور پنشنوں کے ذریعے سے یا خام مال ارزاں نرخ پر انگلستان بھیج کر اور وہاں کے کارخانوں میں مصنوعات تیار کر کے دس دس بیس بیس گنا قیمت لی جائے۔ سر سیّد نے بالکل درست لکھا ہے: "جب تک ایک قوم دوسری قوم میں مل جل کر اور محبّت و اخلاص پیدا کر کے ہم وطنوں کے طور پر نہ رہے باہم ارتباط اور اختلاط کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے۔"[2] انگریز میل جول سے سخت متنفر تھے، لہٰذا ان کی اجنبیت کا احساس کیوں کر زائل ہو سکتا تھا؟

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص ۱۹ [2] ایضاً ص ۲۶

حکام کی روش

پھر انگریز اپنے آپ کو حکمران ہونے کی حیثیت میں بہت اونچے درجے کے انسان سمجھتے تھے اور عوام کے ساتھ محبت، اخلاص اور ہمدردی کا برتاؤ کرنا ان کے نزدیک آداب حکمرانی کے خلاف تھا۔ زبان اجنبی، طریق بود و ماند اجنبی، لباس اجنبی، برتاؤ اجنبیوں کا سا، ان میں خوش دلی کہاں سے پیدا ہوتی! پھر وہ بے حد نازک مزاج تھے۔ ملنے جلنے والوں کو کوئی ایسی بات کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، جو ان کے مزاج کے خلاف ہوتی۔ خوشامد کی بنا پر غلط بیانیاں کی جاتی تھیں۔ ان حالات میں انگریز حاکم حقیقی حالات سے آگاہ کیوں کر ہوتے؛ وہ ہندوستانیوں کو بے وقعت بھی سمجھتے تھے۔ اور ان کی عزت قطعاً نہیں کرتے تھے، حالانکہ یہاں کے لوگ رزق سے بھی زیادہ عزت کے بھوکے تھے۔ سر سید نے بالکل بجا فرمایا کہ بے عزتی دل دکھاتی ہے، ظاہری نقصان پہنچائے بغیر دشمنی پیدا کرتی ہے اور اس کا زخم ایسا گہرا ہوتا ہے، جو کبھی نہیں بھرتا۔[1]

مسلمانوں کی ذکاوت حس

یہ طریقے اور یہ اوضاع عموماً سب کے لیے ناخوشگوار تھے، مگر مسلمانوں کو ان کی وجہ سے بہت رنج پہنچتا تھا، اس لیے کہ وہ:

> صدہا سال سے ہندوستان میں باعزت چلے آتے تھے ان کی طبیعت اور جبلت میں ایک غیرت ہے۔ دل میں لالچ روپے کا بہت کم ہے۔ کسی لالچ سے عزت کا جانا نہیں چاہتے۔ بہت تجربہ ہوا ہو گا کہ اور قوم میں جو باتیں بغیر رنج کے اٹھا لیتے ہیں، مسلمانوں کو اس سے بھی ادنیٰ بات کا اٹھانا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ ہم نے مانا کہ مسلمانوں میں خصلتیں بہت بری سہی، مگر مجبوری ہے۔ خدا نے جو طبیعت بنائی ہے، وہ بدلی نہیں جاتی۔ اس میں مسلمانوں کی بدبختی سہی مگر کوئی قصور نہیں۔[2]

---

[1] اسباب بغاوت ہند ص ۳۴ [2] ایضاً ص ۳۶

حکومت بنگال کا اشتہار

ان میں سے بعض باتیں عوام میں خاص ناراضی کا باعث بنی تھیں، اس لیے حکومت بنگال کو فارسی زبان میں ایک اشتہار شائع کرنا پڑا اور اس زمانے میں زیادہ تر فارسی زبان ہی استعمال کی جاتی تھی۔ اس اشتہار میں چار باتوں کا ذکر تھا۔ ان کے باب میں حکومت کی تصریحات خلاصۃً درج کی جاتی ہیں:

۱۔ پادریوں نے جو رسالے چھاپے یا جو خط بھیجے، سمجھ لیا گیا وہ سب کچھ حکومت کے ایما سے ہوا، حالانکہ حکومت کو اس بارے میں کوئی اطلاع و آگاہی نہیں اور وہ کسی شخص کو کسی مذہب کی طرف ترغیب دینے کی روا دار نہیں ہو سکتی۔

۲۔ مشہور ہے کہ حکومت تعزیہ داری، ختنہ اور پردے کو موقوف کرنا چاہتی ہے اور شرع و شاستر کے قوانین موقوف کر دینے کی خواہاں ہے۔ یہ محض افترا ہے۔

۳۔ بعض جیل خانوں کے سپرنٹنڈنٹوں نے حکومت کی اطلاع و آگاہی کے بغیر قیدیوں سے کھانے پینے کے برتن لے لیے۔ جب حکومت کو معلوم ہوا کہ اس طرح قیدیوں کے مذہب کو نقصان پہنچے گا تو فوراً تار کے ذریعے سے یہ حکم موقوف کر دیا گیا۔

۴۔ سکولوں کے قیام اور زبان انگریزی کی تعلیم کو دین و مذہب کی تخریب سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس کا مدعا محض یہ ہے کہ لوگ تعلیم حاصل کریں، ان کی معاشی حالت بہتر ہو اور ترقی پائیں۔[1]

اس اشتہار سے بھی ظاہر ہے کہ کس طرح مختلف لوگ گوناگوں پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ سب کچھ انگریزوں کی اپنی روش کا طبعی نتیجہ تھا۔

انگریز اور افلاس ملک

پھر انگریزوں کی وجہ سے ملک میں افلاس بڑھا۔ سر سید فرماتے ہیں:

جب افغانستان سرکار نے فتح کیا۔ لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ جب گوالیار فتح ہوا۔ پنجاب فتح ہوا اودھ لیا گیا، لوگوں کو کمال رنج ہوا۔ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ ان کے پاس کی ہندوستانی

---

[1] یہ اشتہار ذکاء اللہ نے بھی چھاپا ہے۔ اسباب بغاوت ہند کے تازہ ایڈیشن میں بھی بہ طور ضمیمہ چھپ گیا ہے۔

عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی۔ نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں۔ ہر قسم کی ہندوستانی اشیا کی تجارت بہ کثرت تھی۔ ان عملداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی تھی۔[1]

یہ ان اسباب کی سرسری کیفیت ہے، جن سے عوام میں رنج و ناراضی بڑھی۔ بنیادی سبب وہی تھا، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، یعنی اجنبیوں کی غلامی۔ باقی تمام اسباب اس میں اضافے کا موجب بنتے رہے یا کہہ لیجیے کہ وہ انگریزوں کی اجنبیت کو تازہ رکھنے اور اُسے زیادہ سے زیادہ رنج افزا بنانے کا باعث ہوئے۔ ان عوام میں فوجی بھی بہ طور افراد شریک تھے۔ آیندہ باب میں یہ بتایا جائے گا کہ فوجیوں کو خصوصاً کن کن شکایات کی بنا پر سرکشی کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔

ڈاکٹر سین کا بیان ہر پہلو زیر غور آ چکا، آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سین نے اپنی کتاب میں جو کچھ بیان کیا ہے اسے بھی اجمالاً یہاں پیش کر دیا جائے، جو بڑی حد تک مذکورہ بالا بیانات کا مصدق ہے۔

۱۔ چربی والے کارتوس

۲۔ سپاہیوں میں ان کارتوسوں کے علاوہ بھی بے چینی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے انگریزوں کے لیے ملکوں پر ملک فتح کیے۔ پورا ہندوستان ان کے قبضے میں دے دیا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ ہمارے عوام کو لوٹا گیا، ہمارے حکمرانوں اور امیروں کے درجے گرا دیے گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے مذہب پر ناقابل تصور حملے شروع ہو گئے۔

۳۔ مالیے میں اضافہ، دو سو کی جگہ تین سو، چار سو کی جگہ پانسو۔

۴۔ چوکیدارہ دُگنا، تگنا بلکہ دس گنا۔

۵۔ معززین اور اہلِ علم کے وسائل روزگار ختم ہو گئے۔ لاکھوں ضروریات زندگی سے محروم ہوئے۔

---

[1] اسباب بغاوت ہند صفحہ ۲۹

۶- جب کوئی شخص روزگار کی تلاش میں ایک ضلعے سے دوسرے ضلعے میں جاتا تھا تو اس سے دو پیسے فی کس سڑک کا ٹیکس لیا جاتا تھا اور ہر چھکڑا چار آنے سے آٹھ آنے تک دینے کے لیے مجبور ہوتا تھا۔ ٹیکس ادا کرنے والے ہی سڑک پر جا سکتے تھے۔

۷- انگریزوں کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ نسلی اور ثقافتی اعتبار سے بلند ہیں مغرب نے تہذیب میں اونچا درجہ حاصل کر لیا ہے اور مشرق پس ماندہ رہ گیا ہے۔

۸- انگریز اصلاح کے جوش میں عوام کے جذبات سے بے پروائی برت رہے تھے۔

۹- سپاہیوں کے مذہبی جذبات انگریزوں کے نزدیک قطعاً مستحق توجہ نہیں تھے جیسا کہ ویلور اور جنگ برما والے واقعات سے ظاہر ہے۔

۱۰- ستی کو منسوخ کر دیا گیا یہ مذہب میں مداخلت تھی۔

۱۱- بیرونی ملکوں میں سپاہیوں کو بھیجا جاتا تھا تو ذات پات کا مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ ایک ہندو سپاہی کابل میں قید ہو گیا۔ وہ پانسو روپے دینے کے وعدے پر رہا ہوا فیروز پور پہنچا تو اسے صرف نصف رقم دی گئی۔ نصف اس کے ایک دوست نے ادا کی۔

۱۲- پادریوں کی تبلیغی سرگرمیاں۔

۱۳- مدراس میں مسیحیت کی تبلیغ اور جیلوں میں عام تعلیم کے علاوہ مسیحیت کی تعلیم۔

۱۴- ریل کے ڈبوں میں ذات پات کی حفاظت کا کچھ انتظام نہ تھا۔

۱۵- ہندو بیوہ عورتوں کی شادی کا مسئلہ۔

۱۶- تبدیل مذہب کے سلسلے میں میراث کے حقوق کی حفاظت کا مسئلہ۔ اس قانون سے صرف عیسائی ہونے والے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مسلمان ہونے والے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے کہ مسلمان غیر مسلم کی میراث سے حصہ لے ہی نہیں سکتا تھا اور ہندو دھرم میں تبلیغ تھی ہی نہیں کہ ہندو اس سے [illegible]

۱۷- فوجیوں کے لیے بھتا۔ پہلی جنگ افغانستان میں جنرل پولک نے دریائے [illegible] کو

عبور کرتے ہی بھنا دیا۔ اس کے بعد بار بار مزاحمت۔

۱۸۔ سپاہیوں کو بدل بدل کر دور دور بھیجا جانے لگا۔ ان کی تنخواہ اتنی نہ تھی کہ بال بچوں کو ساتھ لے لیتے یا دو جگہ خرچ چلاتے۔

۱۹۔ پے در پے وعدہ شکنیاں۔ مثلاً مدراس کے گورنر نے وہاں کی فوج بمبئی بھیجی تو وعدہ کیا کہ فوجیوں کو وہ تمام فوائد حاصل ہوں گے جو برما جاتے وقت ہوئے تھے، لیکن وہ لوگ بمبئی پہنچے تو معلوم ہوا گورنر جنرل نے مدراس کے گورنر کا وعدہ رد کر دیا۔ بالکل یہی صورت جنرل چارلس نیپئر کے وعدے کے سلسلے میں ڈلہوزی نے پیدا کی۔ جس پر نیپئر کو استعفیٰ دینا پڑا۔

۲۰۔ رشوت عام تھی۔

۲۱۔ سپاہیوں سے سخت بدسلوکی ہوتی تھی بلکہ گالیاں تک دی جاتی تھیں۔

سپاہ کا خرچ

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں سپاہ کی کل تعداد تین لاکھ پندرہ ہزار اور پانسو بیس تھی اور اس پر اٹھانوے لاکھ دو ہزار دو سو تینتیس پونڈ خرچ ہوتے تھے۔ اب ان کے الگ الگ خرچ کا اندازہ کیجیے:

قسم	تعداد	رقم
یورپین	۵۱۳۱۶	۵۶۶۸۱۱۰
دیسی	۵۶۴۳۰۴	۴۱۳۴۱۲۵

گویا یورپینوں یعنی فرنگیوں کا خرچ فی کس بطور اوسط ۱۱۰ء۴ پونڈ اور دیسیوں کا فی کس ۱۳ء۶ پونڈ بنتا تھا۔ مانا کہ فرنگی حکمران تھے۔ یہ بھی مانا کہ ان کا معیار قدرے بلند تھا، لیکن کیا بارہ اور ایک سو دس کی نسبت کسی بھی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اطمینان سمجھی جا سکتی ہے؟

باب ۴

دیسی فوج کی سرگذشت

احسان فراموشی

انگریزی حکومت کی ایک خصلت آپ کو جا بجا نمایاں نظر آئے گی، یعنی اس کی مطلب پرستی اور احسان فراموشی۔ اس ملک میں انگریزوں نے جن جن لوگوں سے فائدہ اٹھایا، مطلب پورا ہو چکنے کے بعد انھیں نیچے گرانے میں قطعاً تامل نہ کیا۔ میر جعفر نے ملک و قوم کے بہترین مقاصد سے غداری کر کے انگریزوں کے لیے استحکام کا موقع پیدا کیا تھا اور بنگال اور بہار اور اڑیسہ کی نظامت حاصل کر لینے کے بعد کمپنی، کلایو اور تمام انگریز افسروں کو بے اندازہ روپیہ دیا تھا۔ جب انگریزوں کو میر جعفر سے مزید فائدہ اٹھانے کی کوئی امید نہ رہی تو اسے مسند نظامت سے اتار کر میر قاسم کو ناظم بنا دینے میں کوئی اخلاقی برائی محسوس نہ ہوئی۔ پھر میر قاسم سے بھی بد عہدی کی۔ مزید چند سال گزر گئے تو میر جعفر کی اولاد کو بالکل بے اختیار بنا کر قعرِ گمنامی میں ڈال دیا۔

کرناٹک کا نواب محمد علی انگریزوں کے سرگرم حامیوں میں سے تھا، لیکن اس کی اولاد غداری سے حاصل کی ہوئی نظامت زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکی۔ اور انگریزی حکومت نے اس نظامت پر بھی قبضہ کر لیا۔ اودھ سے طویل مدت تک بڑی بڑی رقمیں وصول کی جاتی رہیں۔ جب دیکھا کہ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا اور ملک کے باقی حصے قبضے میں آ چکے ہیں تو ایک دم اودھ کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ غرض کہیں بھی آپ کو احسان شناسی یا پابندی عہد کی کوئی جھلک نظر نہ آئے گی۔

یاد کیجیے کہ ارکاٹ کے محاصرے میں دیسی سپاہیوں نے رسد کی قلت کے وقت گوروں پر بہت بڑا

احسان کیا تھا۔ چاول گوروں کو دیتے تھے اور خود پیچ پر گزارا کرتے رہے۔ اب آپ گوروں کا برتاؤ ملاحظہ فرمائیے۔

فوج بنگال فوج بنگال کی بنیاد ۱۷۵۷ء میں پڑی تھی۔ اُسی کے بل پر بنگال، بہار اور اڑیسہ جیسے زرخیز علاقے انگریزی مقاصد کا بازیچہ بنے۔ اُسی کے بل پر بکسر کی جنگ میں کامیابی حاصل کی گئی۔ ۱۷۶۴ء میں میر جعفر نے گوروں کے لیے ایک بہت بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس رقم کے پہنچنے میں دیر ہوگئی تو گورے بگڑ بیٹھے۔ چنانچہ فوراً روپیہ منگوایا گیا اور گوروں میں تقسیم ہوا تو وہ راضی ہوئے۔ اس موقعے پر دیسی سپاہیوں کو بھی خیال آیا کہ جب لڑنے میں سب برابر ہیں تو تقسیم تحائف میں کیوں برابر نہ ہوں؟ آپ کو معلوم ہے کہ "منصف مزاج" اور "حق شناس" انگریز کارکنوں نے تقسیم انعامات کا تناسب گوروں اور دیسیوں میں کیا رکھا تھا؟ ہر گورے کو چالیس روپے ملتے تھے اور ہر دیسی کو چھ روپے!! بڑی ردوکد کے بعد دیسیوں کا حصّہ بڑھا کر بیس روپے کیا گیا۔

ایک موقع پر ایک دیسی بٹالین کو اس بے انصافی پر سخت غصّہ آیا۔ اس نے اپنے انگریز افسروں کو قید کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ ہم آیندہ کوئی خدمت انجام نہ دیں گے۔

انگریزوں کی شقاوت انگریزوں نے فوراً چوبیس دیسیوں کو گرفتار کر کے چھپرہ میں ان پر مقدمہ چلایا اور فوجی عدالت نے ان چوبیس کو توپ دم کر دینے کی سزا تجویز کی۔ فوج میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ہیکٹر منرو نے، جسے بکسر کی جنگ میں ناموری حاصل ہوئی تھی، انتہائی بیدردی سے اس سزا کے نفاذ کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ چوبیس میں سے چار دیسی آدمیوں کو توپوں سے باندھ دیا گیا یہ ہو چکا تو باقی اسیروں میں سے چار کشیدہ قامت اور وجیہہ جوان آگے بڑھے اور منرو سے درخواست کی کہ میدانِ جنگ میں ہمیں ہمیشہ عزّت کے مقام پر لڑنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ آج سزائے موت میں بھی ہمیں سبقت حاصل ہونی چاہیئے۔ سنگ دل منرو کو اس درخواست پر بھی حقیقت حال کا کوئی احساس نہ ہوا۔ اس نے پہلے چار آدمیوں کو کھلوا کر ان چاروں کو بندھوا دیا۔ جب دیکھا کہ فوج میں ناراضی کا

جذبہ ترقی پذیر ہے تو گوروں کو حکم دے کر توپیں بھروالیں اور اس طرح جمادیں کہ کوئی بھی دیسی ذرا حرکت کرے تو آتش بازی شروع کردی جائے۔ اس طرح دیسیوں سے ہتھیار رکھوا لیے گئے اور بیس آدمیوں کو اندھا دھند توپ سے اڑا دیا گیا۔ باقی چار کو دوسری چھاؤنیوں میں بھیج کر یہی سزا دی گئی۔ بعد ازاں چھ آدمی بانکی پور میں موت کے گھاٹ اتارے گئے۔[1]

یہ ان دیسی فوجیوں پر انگریزوں کا پہلا عظیم الشان "احسان" تھا، جنھوں نے اپنا خون ان سفید فام اجنبیوں کو تاجروں سے حکمران بنانے کے لیے بہایا تھا۔

گوروں کی بغاوت

گوروں کا ڈبل بھتا موقوف ہوا تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ سب نے باہم سازباز کرکے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کرلیا۔ کمپنی کے ڈائرکٹر ڈبل بھتا دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے حکم دے دیا تھا کہ گورے مستعفی ہوتے ہیں تو ہو جائیں ان کی جگہ دوسروں کو ملازم رکھ لیا جائے گا۔ البتہ اگر مرہٹوں کی طرف سے حملے کا اندیشہ پیدا ہو یا دیسی سپاہ بگڑنے پر آمادہ نظر آئے تو گوروں سے بات چیت کرکے مناسب سمجھوتا کرلیا جائے، ورنہ ان کے مطالبے مسترد کردیے جائیں اس موقعے پر دیسی سپاہ نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جو انگریزی حکومت کے لیے تشویش کا باعث ہوتی، لیکن حکومت نے گوروں سے بات چیت کرکے سمجھوتا کرلیا اور وفادار دیسیوں کے حقوق پر ضربیں لگانے لگی۔ پہلے یہ تجویز ہوئی کہ دیسی افسروں کو اونچے فوجی عہدوں پر نہ رکھا جائے۔ پھر انھیں آہستہ آہستہ فوج سے نکالنا شروع کیا۔ ان کے درجے اور مشاہرے گھٹا دیے گئے۔ یہ اس فوج پر انگریزوں کا "تازہ احسان" تھا جس نے ایک بھی نازک موقعے پر وفاداری کے راستے سے قدم ادھر ادھر نہیں ہٹایا تھا اور امن قائم رکھا تھا۔

افرنجیت کا جوش

ٹیپو سلطان کی شہادت پر میسور کی سلطنت ختم ہو گئی اور مرہٹے بھی انگریزوں کے مقابلے میں جم کر لڑنے کے اہل ثابت نہ ہوئے تو انگریز افسروں کے دل میں یکایک یہ خیال پیدا ہو گیا کہ دیسی سپاہیوں کو ہر ممکن کوشش سے افرنجیت کے رنگ میں رنگ

---

[1] کیئی جلد اول صفحہ ۲۰۶-۲۰۸

دبا جائے۔ کیئی نے لکھا ہے کہ انگریز چاہتے تھے دیسی سپاہی انگریزی فیشن میں ڈرل کریں، انگریزی فیشن کا لباس پہنیں اور انگریزی فیشن کے مطابق حجامت بنوائیں۔[1] گویا ہر ممکن کوشش سے مشرقی اوصاف و خصائص کو ختم کر دینے کا پختہ ارادہ کر لیا گیا تھا اور ایسے حالات پیدا کر دیے گئے تھے کہ امن کی زندگی بسر کرنا دیسی سپاہیوں کے لیے میدانِ جنگ کی سختیوں اور جفاکشیوں سے بھی زیادہ دوبھر ہو گیا۔

نئے فوجی احکام

مدراس کی فوج کے لیے جو احکام جاری ہوئے، ان میں سے بعض کا خلاصہ یہ تھا:

۱۔ دیسی سپاہی یونی فارم پہن لے تو نہ تو اس کی پیشانی پر تلک ہونا چاہیے اور نہ کانوں میں بالیاں۔

۲۔ اس کی داڑھی منڈی ہوئی ہونی چاہیے۔

۳۔ اُسے پگڑی کی جگہ ٹوپی استعمال کرنی چاہیے۔

اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ ہندوؤں کو ذات پات کے نشان سے محروم کر دیا جائے اور مسلمان جس چیز کو شعائرِ دین میں شمار کرتے ہیں، اُسے چھوڑ دیں۔ غرض ان احکام سے عام لوگ بھی نتیجہ نکال سکتے تھے کہ انگریز آہستہ آہستہ سب کو اپنے جیسا بنا لینے کی فکر میں ہیں اور وہ کسی کا بھی دین سلامت نہ رہنے دیں گے۔

ویلور کی بغاوت

ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۰۔ جولائی ۱۸۰۶ء کو ویلور (احاطہ مدراس) میں بغاوت ہوئی جہاں ٹیپو سلطان کے شہزادے بھی نظر بند تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے شہزادہ معزالدین نے فوجیوں کو اکسانے میں سرگرم حصّہ لیا، حالانکہ اکسانے سے کچھ نہیں بن سکتا تھا۔ ہنگامے کے اصل وجوہ وہی تھے، جن کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے۔

ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ سپاہیوں کو دُور دراز کے مقامات پر لے جاتے اور اُنھیں اپنے

---

[1] کیئی جلد اوّل ص ۲۱۶

اہل وعیال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں بڑی دقتیں پیش آتیں۔ جو سپاہی انگریزوں کے پاس ملازم تھے، ان کے مقابلے میں نظام اور سندھیا کے سپاہیوں کی حالت بدرجہا بہتر تھی۔

ویلور کی بغاوت فرو کردی گئی۔ اُس کے نتیجے میں بعض بڑے بڑے انگریز حاکموں پر سخت عتاب نازل ہوا اور ٹیپو سلطان کے شہزادوں کو ویلور سے نکال کر کلکتہ پہنچا دیا گیا۔

بے چینی کی علامتیں

دیسی سپاہیوں کے دل پر جو کچھ گزر رہا تھا۔ اس کی علامتیں کبھی کبھی منظرِ عام پر بھی آجاتی تھیں۔ ۱۸۲۲ء کے موسمِ بہار میں ارکاٹ کے رسالے کی بارکوں کے اندر ایک اشتہار ملا، جس کا مضمون یہ تھا کہ مسلمان انگریزوں کے محکوم بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی نمازیں اور دعائیں قبول نہیں۔ وہ ہیضے کی وبا میں بہ تعدادِ کثیر مرتے ہیں۔ یہ آفت اُن پر خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ اُنھیں چاہیئے کہ اپنے مذہب کے لیے جانبازانہ جہاد کریں۔ ارکاٹ اور دہلی کے درمیان بے شمار ہندو اور مسلمان آباد ہیں، انھیں متحد ہو جانا چاہیئے۔ انگریز ان کے مقابلے میں بہت تھوڑے ہیں۔ ہر مقام کے سپاہیوں کو خبردار کر دیا جائے۔ ۱۷۔ مارچ ۱۸۲۲ء کو اتوار کا دن ہوگا۔ آدھی رات کے وقت ایک ایک نائک دس دس سپاہی ساتھ لے کر ایک ایک انگریز افسر کے بنگلے پر پہنچ جائے۔ اس طرح تمام انگریز افسروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور فوجوں کی کمان خود سنبھال لی جائے۔[۱]

اسی زمانے میں مدراس کے گورنر کو ایک خط ہندوستانی زبان میں موصول ہوا جس میں شکایت کی گئی تھی کہ محکمہ فوج اور محکمہ دیوانی کے گورے پوری دولت سمیٹ رہے ہیں۔ دیسی سپاہیوں کی قسمت میں رنج و محنت کے سوا کچھ نہیں:

> سپاہی تلوار کے زور سے ملک فتح کرتے ہیں۔ بزدل سول حکام حکومت کا کاروبار سنبھال لیتے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں روپے سے صندوق

---

[۱] کیئی جلد اوّل ص ۲۶۲

بھر کر یورپ چلے جاتے ہیں۔ سپاہی زندگی بھر بھی محنت مشقت
کرتا رہے تو اُسے پانچ کوڑیاں نہیں ملتیں۔[1]

سپاہیوں کی پریشانیاں

برما میں جنگ شروع ہوئی تو ۴۷ دیسی پیادہ فوج کو بھی محاذِ جنگ پر بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔ جو بارک پور میں مقیم تھی، لیکن اسے بھیجنے کے سلسلے میں جو انتظامات ضروری تھے، وہ بالکل نہ کیے گئے۔ گورا فوج کے لیے یہ انتظام حکومت خود کرتی تھی، دیسی سپاہیوں کو اپنا ضروری سامان تک ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتا تھا۔ تھارن ٹن نے لکھا ہے۔

> گورے اپنے تھیلے خود نہیں اٹھاتے، سپاہی کو یہ بوجھ بھی معاف نہیں۔ علاوہ بریں اسے اپنی دوسری چیزیں اٹھوانے کے لیے بھی خود ہی بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً کھانا پکانے کے برتن، پہننے کے کپڑے، ضروری سازوسامان اور گولی بارود۔ اتنا بوجھ ہو جاتا ہے کہ سپاہیوں کے جسم طویل سفروں میں اس کے متحمل نہیں ہو سکتے، خصوصاً ایسے ناسازگار حالات میں جو اکثر پیش آتے ہیں۔ فوج کے کوچ کے وقت بیل گاڑیوں کا ہونا ضروری ہے، لیکن یہ جان لینا چاہیے کہ جانوروں اور اُنھیں ہانکنے والوں کا خرچ سپاہیوں کو خود ہی ادا کرنا پڑتا ہے۔[2]

دیسی سپاہ کا عذر

۴۷ کے سپاہیوں نے عذر پیش کیا کہ حمل ونقل کا انتظام کر دیا جائے یہ نہیں کہ خرچ بھی حکومت برداشت کرے، بلکہ وہ خود خرچ برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔ تھارن ٹن لکھتا ہے کہ بیل نہ مہیا کیے گئے اور نہ کرایے پر ملتے تھے، صرف خریدے جا سکتے تھے اور ان کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ کمسریٹ کے محکمے سے مدد کی درخواست

---

[1] کیئی جلد اول ص۲۶۲ [2] برطانوی ہند کی تاریخ جلد پنجم ص۱۰۵

کی گئی۔ وہاں سے جواب آیا کہ سپاہیوں کو اپنا انتظام خود کرنا چاہیئے۔

اس کا مطلب کیا تھا؟ یہ کہ سپاہی بیل خریدیں، حالانکہ وہ قیمت ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر حکومت انھیں پیشگی تنخواہیں دے دیتی تو ان کی خریداری میں وقت لگتا۔ جتنا سامان ساتھ لے جانا ضروری تھا، اُسے ہر سپاہی اٹھا نہیں سکتا تھا۔ بایں ہمہ بے تکلفی سے فرما دیا گیا کہ سپاہی اپنا انتظام خود کریں۔

رجمنٹ کے کمان افسر نے ذاتی روپے سے جانور خریدنے کی کوشش کی۔ پھر حکومت نے بھی کچھ روپیہ دیا۔ لیکن اس وقت تک رجمنٹ حد درجہ پریشان اور متألم ہو چکی تھی۔ بے شک وہ لوگ غلام تھے لیکن ان کے آقاؤں کی حالت کیا تھی؟ وہ خدمت بڑے اہتمام سے لیتے تھے اور ملازموں سے انھیں کوئی ہمدردی نہ تھی۔ سپاہیوں نے کہہ دیا کہ اول ہمارے تھیلے ناقابلِ استعمال ہیں، دوسرے ہمارے ساتھ رنگون جانے کا عہد نہیں ہوا تھا۔ تیسرے اس دوران میں ہمیں ڈبل بھتا ملنا چاہیئے۔ یہ آخری مطالبہ بھی ہر لحاظ سے جائز تھا اس لیے کہ گاڑیاں چلانے والوں اور دوسرے لوگوں کو زیادہ پیسے دیے گئے تھے۔

ڈاکٹر سین نے تین چیزوں کا ذکر کیا ہے: اول سمندر پار جانے میں سپاہیوں کی ذات پات چھن جانے کا ڈر، دوم سمندر پار جا کر خدمت بجالانا ان کے شرائط ملازمت میں شامل نہ تھا، سوم یہی حمل ونقل کی مشکلات، تاہم ان کے پیش نظر مسلح مزاحمت قطعاً نہ تھی[1]۔

دردانگیز خونریزی — یہ معاملہ کمانڈر انچیف تک پہنچا۔ جس کا نام ایڈورڈ پیجٹ تھا[2]۔ وہ بڑا ہی شقی القلب آدمی تھا۔ یکم نومبر ۱۸۲۴ء کو بارک پور پہنچا۔ نہ غریب سپاہیوں کی شکایتیں سُنیں، نہ ان کی دلداری کا کچھ خیال کیا، نہ انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ توپیں پہلے سے بھروالی گئیں، پھر سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ فوراً کوچ کے لیے تیار ہو جاؤ یا ہتھیار رکھ دو۔ انھیں خبردار بھی نہ کیا گیا کہ توپیں تیار ہیں اور حکم نہ مانو گے تو آتش باری شروع ہو جائے گی۔ بس دنادن

---

[1] سین کی کتاب ص۲۷
[2] PAGET

توپیں چلنے لگیں۔ بہت سے غریب مارے گئے۔ باقی دریا میں کود ے اور ڈوب گئے۔ جو بندوقیں جا بجا بکھری پڑی تھیں، اُنھیں اٹھا کر دیکھا گیا تو کوئی بھی بھری ہوئی نہ تھی۔ یعنی بیچارے سپاہیوں نے نہ سرکشی کا ارادہ کیا تھا اور نہ ان کی نیت بد تھی۔ وہ صرف جائز شکایتیں بالادست افسروں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ خود انصاف دوست انگریزوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ بڑا ہی غلط اور جابرانہ فعل تھا۔ اس کی جابریت اس وجہ سے ناقابل تصوّر بن جاتی ہے کہ کوئی خاص خطرہ درپیش نہ تھا۔ چند موزوں فقروں سے الم ناک اور حزن انگیز حادثے کو روکا جا سکتا تھا، جو یکم نومبر ۱۸۲۴ء کو پیش آیا۔

یہ بیجٹ خوش ہو گا کہ دیسیوں کو بے دردانہ موت کے گھاٹ اتار کر فوجی ضابطہ پورا کر لیا گیا۔ لیکن یہ زخم ۱۸۵۷ء تک مندمل نہ ہوا اور ۱۸۵۷ء میں جو سلوک دیسیوں نے انگریزوں سے کیا، وہ ایسے ہی زخموں کے درد اور ٹیس کا طبعی نتیجہ"

مختلف واقعات ان کے علاوہ بھی بعض ایسے واقعات پیش آئے، جن سے فوج کے رنج و غم پر اضافہ ہوتا رہا۔ مثلاً فتح سندھ کے بعد وہاں جو فوجیں متعین کی گئیں، اُنھیں زائد الاؤنس نہ دیے گئے لہٰذا انھوں نے ٹھہرنا گوارا نہ کیا بلکہ بعض فوجوں نے زائد تنخواہ اور الاؤنس لیے بغیر کوچ ہی سے انکار کر دیا۔

جب پنجاب میں سکھوں سے پہلی جنگ ہو رہی تھی تو کہا جاتا ہے کہ پٹنہ کی فوج کے منشی اور جمعدار نے سازش کی تھی۔ اس ضمن میں خواجہ حسن علی خاں نام کا ایک شخص کو ملزم گردانے کی کوشش کی گئی کہا گیا کہ اسی نے فوجیوں میں خوف و ہراس پیدا کیا اور بتایا کہ مذہب بگاڑ کر اُنھیں عیسائی بنا لیا جائے گا۔ مقدمے میں خواجہ صاحب کے خلاف کوئی شہادت نہ مل سکی اور انھیں بری کرنا پڑا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص فارسی کی کتابیں بیچنے کے بہانے فوج میں جا کر اُلٹی سیدھی افواہیں پھیلاتا رہتا تھا۔ جمعدار اور منشی کے خلاف جرم ثابت ہو گیا اور انھیں موت کی سزا ملی[1]

---

[1] کیئی جلد اول ص ۳۰۵-۳۰۹ افسوس کہ منشی اور جمعدار کے نام معلوم نہ ہو سکے لیکن تھے دونوں مسلمان۔

ایک اور سنگ دل سپہ سالار ہیجٹ کی کیفیت آپ نے ملاحظہ فرمالی، اب ایک اور سنگ دل سپہ سالار چارلس نیپئر کی حالت ملاحظہ فرمائیے، جو "فاتح سندھ" کے لقب سے مشہور ہے۔ وہ بھی بڑا گرم مزاج، ضدی اور حق ناشناس آدمی تھا۔

فتح پنجاب کے بعد ایک فوج نے اس بنا پر تنخواہ لینے سے انکار کیا تھا کہ معمول کے خلاف اس کے الاؤنس بند کر دیے گئے تھے۔ نیپئر نے دورہ شروع کر دیا۔ وزیرآباد پہنچا تو وہاں بھی تنخواہیں لینے سے انکار کیا گیا۔ چنانچہ اس نے پہلے چار آدمیوں کو قید بامشقت کی سزا دے دی پھر مزید تین آدمی گرفتار کر لیے جن کے متعلق بیان کیا جاتا تھا کہ وہ ایک ایک رجمنٹ میں پھر پھر کر لوگوں کو اکساتے رہے تھے۔ انھیں چودہ چودہ سال کے لیے قید کیا گیا۔ نیپئر نے پہلے اسے سزائے موت میں تبدیل کر دیا، پھر سزائے موت کو معاف کر کے عمر قید کی سزا میں تبدیل کرتے ہوئے لکھا:

> وہ دائمی جلاوطنی میں اپنے جرموں کی پاداش بھگتیں گے۔ اپنے وطن اور رشتہ داروں سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو کر ایک اجنبی سرزمین میں چلے جائیں گے جو سمندر پار واقع ہے اور وہاں اپنی سیاہ نصیبی کے باقی اوقات گزاریں گے۔ وہ اپنی بدبختی کی زندہ مثالیں بنے رہیں گے اور اپنے پرچم سے غداری کرنے والوں کا حشر یہی ہوتا ہے[1]

پھر گوبند گڑھ میں ۶۶ نے سرکشی اختیار کی۔ اُسے توڑ دیا گیا اور اس کا پرچم گورکھا فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ اس واقعے پر چارلس نیپئر اور ڈلہوزی میں جھگڑا شروع ہو گیا، جس کے باعث چارلس نیپئر استعفیٰ دے کر انگلستان چلا گیا۔

کارتوس اس سرسری سرگزشت سے آشکارا ہے کہ دیسی سپاہ کو انگریزوں کے خلاف

---

[1] کیئی جلد اوّل ص ۲۱۴

بڑی شکایتیں تھیں، اس کے دل پر بار بار چرکے لگائے جاتے رہے اور وہ مناسب موقعے کی منتظر تھی۔ یہ موقع چربی والے کارتوسوں نے بہم پہنچا دیا جو فوری اشتعال کا باعث بنا۔

بہادر شاہ ظفر سے ایک شعر منسوب کیا گیا ہے:

ایران نے کیا، نہ کیا شاہ روس نے
انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے

یہ شعر حقیقتاً ظفر کا ہو یا نہ ہو لیکن معنوی لحاظ سے اس کی درستی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ ایران یا روس کو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اُلجھانا بالکل بے جا ہے۔ اس کے اسباب دوسرے تھے۔ سرسید کے الفاظ میں بارود پہلے سے تیار تھی۔ صرف شتابے کو آگ لگنا باقی تھا اور اس آگ کا سروسامان چربی والے کارتوسوں نے کر دیا۔

باب ۵

غدر یا جنگِ آزادی؟

بنیادی سوال ایک نہایت اہم بلکہ بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا ۱۸۵۷ء کی جنگ واقعی جنگ آزادی تھی یا ہم نے محض انگریزوں کی مخالفت کے جوش میں اس کے لیے ایک دِل خوش کن اور سامعہ نواز نام تجویز کر لیا تھا؟ اسی سوال کے صحیح اور تسلی بخش جواب پر اصل واقعے کا جائزہ لینے کے لیے نقطۂ نگاہ کا تعین موقوف ہے۔ اگر یہ غدر تھا تو اس باب میں غور و فکر کا ایک طریقہ ہو گا۔ اگر یہ پورا ہنگامہ آزادیِ وطن کے لیے تھا تو ہم دوسرے نقطۂ نگاہ سے اس کا جائزہ لیں گے۔ اسے غدر تسلیم کر لینے کی صورت میں ہم صرف یہ دیکھنے کے مجاز ہوں گے کہ انگریزی حکومت نے اس کے لیے جو انسدادی تدبیریں اختیار کیں وہ مناسب حدود سے کس قدر متجاوز تھیں؟ اگر اسے جنگِ آزادی مان لیا جائے تو ہم انگریزوں کی تمام سرگرمیوں کو سراسر جابرانہ قرار دیں گے اور اس جنگ میں شریک ہونے والا ہر فرد ہمارے نزدیک سچا محبِ وطن، سچا محبِ آزادی اور سچا محبِّ انسانیت ہو گا۔

غدر کیوں؟ انگریزوں نے اسے کیوں غدر قرار دیا؟ صرف اس لیے کہ اس کی ابتدا دیسی فوج کی سرکشی سے ہوئی، بعد میں بھی مختلف مقامات کی فوجوں نے سرکشی ہی کو مدارِ شل بنائے رکھا، لیکن کیا پورا ہنگامہ صرف سپاہ کی سرکشی پر موقوف تھا؟ نیز کیا سپاہ کی سرکشی کی وجہ صرف کارتوسوں کی چربی یا اس چربی کے متعلق ایک عام افواہ تھی اور ان لوگوں کے دل میں انگریزوں کے سلوک اور برتاؤ کے متعلق ناراضی کا کوئی جذبہ نہ تھا یا وہ انگریزوں کے تسلط سے مخلصی حاصل کرنے کے خواہاں نہ تھے؟ تاریخ کے ہر واقف کار کے لیے ان دونوں سوالوں کا

جواب واضح طور پر نفی میں ہے، پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اُسے کیوں غدر قرار دیا جائے اور کس بناء پر غدر تسلیم کیا جائے؟

اگر ہم اپنی نظر نفسِ سرکشی تک محدود رکھیں تو صرف سپاہیوں کے تعلق میں اُسے غدر قرار دینا ایک حد تک درست مانا جا سکتا ہے، لیکن اگر اس کے تمام اسباب و محرکات اور اصول و مقاصد سامنے رکھے جائیں تو لازماً اُسے جنگِ آزادی تسلیم کر لینا پڑے گا، اس لیے کہ یہ انگریزی تسلّط کو ختم کر دینے کی غرض سے شروع ہوئی تھی۔

رہا یہ سوال کہ ہر مقام کی سپاہ نے رزم و پیکار اور تقابل و تزاحم میں زیبا طریقہ اختیار کیا یا نہ کیا؟ جن مقاصد کے لیے وہ میدانِ عمل میں اُتری تھی ان کے سلسلے میں جد و جہد کے لوازم پورے کر سکی یا نہ کر سکی؟ تو ان سوالات کا کوئی بھی جواب دیا جائے اس سے مقاصد و اصول پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اور یہ کیوں کر مانا جا سکتا ہے کہ سپاہ محض ایک ہنگامہ چاہتی تھی جس کے لیے جگہ جگہ آگ اور خون کے سیل بہہ نکلے۔ اس سے زیادہ کچھ مقصود نہ تھا؟

کامیابی اور ناکامی کا مسئلہ

یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ تحریکات کی عملی خامیاں ایسی حالت میں بطورِ خاص نمایاں ہوتی ہیں، جب وہ ناکام رہ جائیں۔ جو تحریکیں کامیاب ہو جاتی ہیں، ان کے باب میں خامیوں کو پیشِ نظر لانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ ناکام رہی۔ انگریزوں نے کامیاب ہونے کے بعد اس جنگ کے حقیقی آثار و شواہد کو انتہائی اہتمام سے محو کر دیا اور تقریباً نصف صدی تک اس کی کوئی صحیح اور مستند تاریخ ہی نہ لکھی گئی۔ جو انگریزوں نے مناسب سمجھا مرتب کر کے شائع کر دیا، لہٰذا آج کس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ہمارے سامنے آیا، وہی اُس کی سرگزشت کا پورا سرمایہ ہے؟

ہم بے توقف تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ جنگ بعض اتفاقات کی بناء پر اچانک شروع ہو گئی اور اس کے قائدوں کو اپنی تحریک کا جال پوری طرح پھیلانے کا موقع نہ مل سکا، نہ ہی

کے لیے مجاہدوں کی تربیت کا انتظام بقدر ضرورت ہو سکا لیکن اس سے بھی تحریک کی حقیقی نوعیت نہیں بدل سکتی۔ ہمارے سامنے انقلابی تحریکوں کے بیسیوں ہنگامے موجود ہیں، جن میں اہلیت وصلاحیت کا کوئی بھی سراغ نہیں ملتا، تاہم انھیں انقلابی تحریکوں کے اجزاء ماننے میں کبھی کسی کو تامل نہیں ہوا۔ پھر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو جنگِ آزادی قرار دینے میں کیوں تامل کیا جائے؟ منظم حکومتوں کے خلاف تحریکیں اٹھتی ہیں تو ابتدائی منزلوں ہی میں ان کی حیثیت زیادہ منظم نہیں ہوتی اور پہلے ہی قدم پر تنظیمی پختگی کمال پر نہیں پہنچ جاتی۔

قائدین

پھر قائدین کی ایک طویل صف موجود ہے جو پاک و ہند کے مختلف حصوں میں کام کر رہے تھے اور ان سب میں گہرا ربط و تعلق بھی موجود تھا۔ ان میں سے کوئی فرد انگریزی فوج میں ملازم نہ تھا، مثلاً رانی لکشمی بائی، حضرت محل، عظیم اللہ خاں، مولینا لیاقت علی، ڈھونڈو پنت نانا، تانتیا ٹوپے، شہزادہ فیروز شاہ۔ احمد شاہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر فرد نے فوجوں کی قیادت کی۔ ان کی سرگرمیوں کو غدر قرار دینے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟ بہادر شاہ ظفر کس کا ملازم تھا کہ اس کی رزم آرائی یا بدرجۂ آخر سپاہ کی پناہ دہی کو غدر قرار دیا جائے؟ حق یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے متعلق انگریزوں نے تعبیر کا جو طریقہ اختیار کیا، اس کی وجہ سے ایک خاص قسم کا غلط تصوّر دماغوں میں پیدا ہو گیا۔ اور مدتِ دراز تک جو صدا کانوں میں مسلسل گونجتی رہی، اس نے آہستہ آہستہ اک گونہ واقعیت کا لباس پہن لیا۔

عجیب استدلال

انگریزوں کے دورِ اقتدار میں تو حقیقت حال کے متعلق شبہ چنداں تعجب انگیز نہ تھا، اس لیے کہ طبیعتیں وہ نقطہ نگاہ اختیار کرنے میں متامل تھیں جو انگریزوں کے نزدیک غیر مرغوب تھا اور اس کے لیے بحث و تمحیص کی بھی چنداں گنجائش نہ تھی۔ ساورکر نے ہندوستان کی جنگِ آزادی کے نام سے جو کتاب لندن میں چھاپی تھی، وہ یہاں پہنچتے ہی ضبط ہو گئی اور مدت تک ضبط رہی۔ پھر دوسرا پہلو کیوں کر نمایاں ہو سکتا تھا؟

تعجب اس امر پر ہے کہ آج بھی بعض اہلِ علم اسے جنگ آزادی تسلیم کرنے میں متذبذب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چھان بین کے باوجود اس تحریک کا کوئی منظم پروگرام نہیں مل سکا۔ نہ اس پروگرام کے مطابق عمل پیرا ہونے کی کوئی مستند دستاویز سامنے آئی ہے۔ بلکہ اس کے بڑے بڑے کارفرماؤں میں سے بہادر شاہ ظفر اور رانی لکشمی بائی کے ایسے خطوط ملے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم ابتدا میں وہ انگریزوں کے مخالف نہ تھے۔ فرض کر لیجیے کہ یہ دعویٰ درست ہے۔ تاہم میرے نزدیک ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی حقیقی حیثیت کا فیصلہ کرنے کے لیے سوچ بچار اور غور و فکر کا یہ طریقہ ہی صحیح نہیں۔

انقلابی تحریکیں اور پروگرام

دنیا کی بڑی بڑی انقلابی تحریکوں میں سے کتنی ہیں جن کے متعلق منظم پروگرام ہمیں دستیاب ہو سکتے ہیں یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا دائرۂ اثر ابتدا میں اتنا ہی وسیع تھا جتنا کہ آخر میں ہو گیا؟ انقلابی تحریکوں کے لیے مشورے شروع میں صرف چند افراد کے درمیان ہوتے ہیں اور کام کا آغاز ہو جاتا ہے پھر طبعی مدتیں ان تحریکوں کو پروان چڑھانے میں لگ جاتی ہیں۔

انقلابِ فرانس، دورِ حاضر کی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ مانا جاتا ہے۔ اس کے لیے کہاں اور کس وقت منظم سکیمیں تیار کی گئیں؟ عوام کی ناراضی اور پریشان حالی کے اسباب مدت سے فراہم ہو رہے تھے، اتفاقی حوادث کے توانز نے اہلِ ملک کو انقلاب کے کنارے پر پہنچا دیا۔ پھر ہنگامۂ عظیم پیش آیا اور اس کے مختلف مرحلے بھی مؤرخوں نے بعد میں متعین کیے۔

اس کے آغاز کی داستان بڑی ہی تعجب انگیز ہے؛ پیرس میں روٹی کم یاب تھی۔ لوگ پریشانی کی حالت میں بازاروں کے چکر لگا رہے تھے۔ ان میں ایک بڑھیا بھی تھی، جس کے پاس ایک لاٹھی کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔ یکایک اس نے دیکھا کہ گاڑی آ رہی ہے، جس میں

شاہی کتوں کے لیے گوشت لایا جارہا ہے اور سوار اس گاڑی کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ گوشت کتوں کے سامنے ڈال دیا گیا۔ بڑھیا اس واقعے پر حیرت زدہ رہ گئی کہ انسانوں کو تو روٹی نہیں ملتی اور شاہی کتوں کے لیے گوشت مہیا کیا جارہا ہے۔ وہ للکار کر آگے بڑھی۔ اِدھر اُدھر چکر لگانے والے لوگ دوڑے آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہجوم فراہم ہوگیا۔ شاہی کتوں کے گوشت پر ہنگامہ شروع ہوا، پھر ہجوم نے ایک نانبائی کو مار کر اس کی دکان لوٹ لی، شام سے پہلے پورے پیرس میں انقلاب کی لہریں دوڑ گئیں اور وہ ہنگامہ شروع ہوا جسے دور حاضر کی تحریک آزادی کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔

حقیقتِ حال

حقیقت یہ ہے کہ قائم شدہ حکومت کے خلاف رنج و ناراضی کے اسباب آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جب یہ اسباب ایک خاص درجے پر پہنچ جاتے ہیں تو کوئی معمولی سا اتفاقی حادثہ آغاز تحریک کا سبب بن جاتا ہے۔ گویا ناسازگار اور نامرغوب واقعات کی حیثیت بارود کے تھیلوں کی سی ہے جو کسی سرنگ میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ پوری سرنگ اُن تھیلوں سے بھر جاتی ہے تو ایک معمولی سی چنگاری اسے بھک سے اڑا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی حالت بالکل یہی تھی۔ اس کے لیے اسباب مدت سے فراہم ہورہے تھے۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، بنیادی سبب انگریزوں کی اجنبیت کے سوا کوئی نہ تھا۔ اُسے دوسرے اسباب کے ذریعے سے تقویت پہنچتی رہی یہاں تک کہ اہلِ ملک کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس میں ایک قطرے کی بھی گنجائش نہ رہی۔ چربی والے کارتوسوں کے واقعے نے سپاہ میں بے چینی پیدا کی۔ سپاہ بھڑکی تو ہر جگہ آگ لگ گئی۔

طبقات کی حالت

آبادی کے مختلف طبقوں اور مختلف افراد میں بے چینی موجود تھی اگرچہ اس کے محرکات اور درجات بالکل مختلف تھے۔ کوئی اس بات پر ناراض تھا کہ ریاست چھن گئی۔ کسی کی برہمی کا یہ سبب تھا کہ اس کی پنشن ضبط ہوگئی۔ بہادر شاہ ظفر کو نذریں بند

ہونے اور جواں بخت کے ولی عہد نہ بننے کا رنج تھا۔ سپاہیوں کو چربی والے کارتوسوں پر اعتراض تھا۔ ان وقتی واقعات واسباب کے علاوہ ایک بنیادی شے سب کے سینوں میں موج زن تھی اور وہ یہ کہ انگریز اجنبی ہیں اور ان کی حکومت پر راضی ہو جانا اہلِ ملک کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ وہ شروع میں انگریزوں کو دہلی سلطنت یا مختلف دیسی حکومتوں کے کارندے سمجھتے تھے اور یہاں ایسی کارکردگی اور مختاری کا دستور عام تھا۔ جب ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اجنبی تاجر اپنی حقیقی حد سے تجاوز کر کے مستقل سلطنت کی طرح ڈال چکے ہیں، تو ان کے دل میں شدید رنج پیدا ہوا۔ پھر وہ دیکھ چکے تھے کہ یہ اجنبی تاجر بے درد بھی ہیں، حق ناشناس اور محسن کُش بھی۔ جس درخت کے سایے میں بیٹھے، اس کی جڑ کاٹنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ نہ انھوں نے والیانِ ملک سے اچھا برتاؤ کیا۔ نہ عوام سے اور نہ فوجیوں سے۔ بس اس احساس نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی شکل میں ظہور کیا۔

ایک مقدّس گروہ

واضح رہے کہ سیکڑوں دوسرے کارکنوں کے علاوہ ایک ایسا گروہ بھی موجود تھا جس نے جنگ آزادی میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا، لیکن ان کے سامنے ذاتی غرض کوئی نہ تھی۔ نہ ان میں سے کسی کی ریاست چھینی گئی تھی، نہ کسی کی پنشن ضبط ہوئی تھی، نہ کوئی اور شکایت تھی، مثلاً مولانا لیاقت علی، مولانا سرفراز علی، مولانا احمد اللہ شاہ، یا ایسے بیسیوں علمائے کرام اور مجاہدین عظام۔ ان کا نصب العین آزادیِ وطن کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اسی غرض سے انگریزوں کے خلاف لڑے۔ اُنھوں نے وہی صدا بلند کی تھی جو ۱۸۵۷ء سے تقریباً اسّی نوے سال پیشتر سلطان حیدر علی فرماں روائے میسور نے بلند کی تھی۔ وہ اُسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے میدانِ عمل میں اُترے تھے، جس کے لیے ٹیپو سلطان نے اپنا قیمتی خون بے دریغ بہا دیا تھا۔ وہ اُسی دعوت کے اتباع میں میدانِ جہاد آراستہ کرنے کے لیے آگے بڑھے تھے جو ۱۸۵۷ء سے چالیس سال پیشتر سید احمد بریلوی نے اہلِ ملک کو دی تھی۔ موقت پر سب کو حقیقی ضرورت کا احساس نہ ہو سکا، جب واقعات نے احساس دلا دیا تو انھیں تلافیِ مافات کے لیے جانیں قربان کر دینے میں قطعاً تامل نہ ہوا۔

اس مقدس گروہ کی جہاد آرائی کو "غدر" قرار دینا صریح ظلم ہے۔

ایک ضروری نکتہ

اگر ملک کے مختلف طبقات میں انگریزوں کے خلاف ہمہ گیر ناراضی کا جذبہ موجود نہ ہوتا تو بارک پور میں منگل پانڈے اور ایشوری پانڈے کی سعی یا سپاہ میرٹھ کی سرکشی ملک بھر میں آگ لگا دینے کا باعث کیوں بن جاتی؟ سپاہ کی بے چینی کے واقعات اس سے پہلے بھی پیش آ چکے تھے، یہاں تک کہ بے درد انگریزوں نے بہت سے سپاہیوں کو توپوں سے بھی اُڑا دیا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس وقت ملک کے کسی حصے سے کوئی صدا بلند نہ ہوئی اور کہیں آگ نہ لگی؟ وجہ یہ ہے کہ پہلے رنج و ناراضی کے اسباب درجہ کمال پر فراہم نہیں ہوئے تھے جیسے کہ ۱۸۵۷ء تک ہو چکے تھے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ ہر لحاظ سے عوامی جنگ تھی اور اس کا مقصد و نصب العین یہ تھا کہ ملک کو انگریزی تسلّط سے نجات دلائی جائے۔

انگریزوں کی حمایت کا مسئلہ

ہمیں معلوم ہے کہ اس عوامی جنگ میں بعض طبقوں اور بعض رئیسوں نے انگریزوں کی سرگرم امداد کی، مثلاً ستلج اور جمنا کے درمیان کی سکھ ریاستوں یا بعض دوسرے رؤسا اور والیانِ ریاست یا پنجاب اور دوسرے حصے کے مختلف طبقوں یا نیپال کے رانا شمشیر جنگ نے۔ تاہم اس سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی عوامیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی اور بہتر سے بہتر تحریک پیش نہیں کی جا سکتی، جس کی تائید و حمایت میں تمام متعلقہ گروہوں اور طبقوں نے ابتدا ہی سے سرگرم حصّہ لیا ہو۔ عام دستور یہی رہا کہ ہر تحریک کے آغاز میں جستہ جستہ آدمی اور جستہ جستہ گروہ شریک ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے اس کا دائرہ اثر پھیلتا جاتا ہے، دوسرے گروہ شامل ہوتے جاتے ہیں۔ مخلص، صاف دل اور بلند ہمت لوگ ہمیشہ آگے رہتے ہیں۔ مذبذبین اس وقت تک ساتھ نہیں دیتے، جب تک کہ تحریک کی کامیابی یقینی نہ ہو جائے۔ ایک گروہ آخری دم تک اختلاف پر قائم رہتا ہے اور ساتھ دیتا ہے تو اس وقت، جب اس کے

لیے کوئی دوسرا چارہ کار نہیں رہتا۔

۱۸۵۷ء میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے سبقت کی۔ وہ بڑی مردانگی سے لڑے۔ انھوں نے انگریزوں کے ظلم صابرانہ برداشت کیے، گولیاں کھائیں، پھانسیاں پائیں۔ عوام کے شمول کی ایسی مثالیں بہت ہی کم تحریکوں میں ملیں گی۔ تعجب ہے کہ اس جنگ کو عوامی نہ سمجھا جائے یا جنگ آزادی قرار دینے میں تامل کیا جائے!

خفیہ تنظیمات

ساورکر نے ایک پورا باب خفیہ تنظیمات پر لکھا ہے، جس کے مطالب کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ عظیم اللہ خاں نے روس سے بھی تعلقات پیدا کر لیے تھے یا پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے مصر کے ذریعے سے بھی کسی نہ کسی نوع کے سیاسی روابط منضبط کرنے کے لیے اقدام کیا تھا۔ لارڈ رابرٹس نے لکھا ہے کہ عظیم اللہ خاں کے متعدد خطوط میں سے دو خط قسطنطنیہ کے عمر پاشا کے نام تھے، جن میں سپاہیوں کی بے اطمینانی اور ہندوستان کے عمومی حالات کی ابتری کا ذکر تھا۔[1]

۲۔ نانا نے ۱۸۵۶ء سے کچھ مدت پیشتر اپنے خاص قاصد ہندوستان بھر میں بھیجنے شروع کر دیے تھے۔

۳۔ تھوڑی ہی مدت میں ہزاروں آدمیوں کو فقیروں، پنڈتوں اور سنیاسیوں کی شکل میں روانہ کر دیا اور ان کے لیے یافتی تک دے دیے گئے تھے۔[2]

۴۔ بڑے بڑے مولوی صاحبان سیاسی جہاد کے وعظ کہنے کے لیے مقرر ہو چکے تھے اور ہزاروں روپے ان کے حوالے کر دیے گئے تھے۔[3]

۵۔ ایک سپاہی کالی ندی کی جنگ میں مجروح ہو کر پکڑا گیا اور اسے توپ سے اڑا دینے کی سزا تجویز

---

[1] ساورکر ص ۶۰-۶۱ [2] ایضاً ص ۶۳ [3] ایضاً ص ۶۷ [4] ایضاً ایضاً

ہوئی۔ ایک گورے نے اس سے پوچھا کہ تمھیں سرکشی کا حوصلہ کیوں کر ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ اگر دیسی سپاہی متحد ہو جائیں تو گوروں کی حیثیت سمندر میں قطرے کے برابر رہ جائے۔[1]

۶- ایک خط کھولا گیا جس میں ایک سپاہی نے لکھا تھا۔

بھائیو! ہم خود اجنبی چھرا اپنے جسموں میں بھونکے بیٹھے ہیں۔ اگر ہم اٹھیں تو فتح ہماری ہوگی کلکتہ سے پشاور تک میدان ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔[2]

تصدیقات ان میں سے بعض بیانات کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے، مثلاً ایک برہمن مدراس میں فوجوں کو اکساتا ہوا پکڑا گیا تھا اور اُسے پھانسی کی سزا ہوئی ایک برہمن علی گڑھ میں گرفتار ہوا تھا، اُسے پھانسی دی گئی تو ایک سپاہی نے پکار کر کہا کہ یہ شخص دین کی خاطر شہید ہوا۔ اس پر ہنگامہ شروع ہو گیا اور انگریز علی گڑھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

کیئی نے غیر مطبوعہ سرکاری دستاویزوں کی بنا پر لکھا ہے:

بہت سے قاصدوں میں سے جو ملک میں چکر لگا رہے تھے، ایک قاصد ماہ اپریل ۱۸۵۷ء میں بہ مقام میرٹھ نمودار ہوا تھا۔ وہ بہ ظاہر فقیر تھا، لیکن اپنے پیروؤں کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہوتا تھا اور اس کے ساتھ گھوڑے اور دیسی گاڑیاں بھی تھیں۔ چونکہ دیسی رجمنٹ کے بہت سے آدمی عموماً اس کے پاس جاتے رہتے تھے، اس لیے (افسروں کی) توجہ اس کی طرف منعطف ہوئی اور پولیس کے ذریعے سے اسے چلے جانے کا حکم دے دیا گیا۔ بہ ظاہر اس نے حکم مان لیا، لیکن کہا جاتا ہے کہ اس نے ۲۰ پیادہ دیسی فوج کی لائنوں میں مزید کچھ وقت گزارا۔[3]

ولسن کا بیان انگریزوں نے ہنگامے کے بعد ہر امر کی خوب چھان بین کی تھی۔ ان میں سے ولسن کی رپورٹ میں درج ہے۔

---

[1] ساورکر ص ۹۴، [2] ایضاً ایضاً [3] کیئی جلد اول ص ۵۶۶

جو شہادتیں اس وقت تک مہیا ہو چکی ہیں، ان کی بنا پر مجھے یقین و وثوق ہے کہ
آغاز ہنگامہ کے لیے ۳۱ مئی (۱۸۵۷ء) کی تاریخ معین ہو چکی تھی کہ ہر ایک رجمنٹ
کے لیے تین آدمیوں کی ایک کمیٹی بن گئی تھی اور یہی کمیٹی بغاوت کے متعلق ہر کام
انجام دیتی تھی۔ سپاہیوں کو اس بات کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ کیا کچھ طے ہو چکا ہے۔
رجمنٹوں کے درمیان جو فیصلے ہو چکے تھے، ان کا مغا محض یہ تھا کہ جو کچھ دوسری رجمنٹیں
کریں گی، وہی انھیں کرنا چاہیے۔ کمیٹی ہی تمام اہم منصوبوں کا فیصلہ کرتی تھی، اسی کے
ہاتھ میں خط و کتابت اور بعض دوسرے معاملات تھے۔ البتہ اس فیصلے پر سب پہنچ چکے تھے
کہ ۳۱ مئی کو ہنگامے کا آغاز ہو جانا چاہیے۔ چونکہ یہ اتوار کا دن تھا، اس لیے انھیں امید
تھی کہ یورپی افسروں کی بڑی تعداد گرجاؤں میں مل جائے گی۔ تمام یورپی افسروں اور دوسرے
گوروں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا، پھر تمام خزانوں کو لوٹنا تھا جو فصل ربیع کے مالیے
سے پُر ہوتے۔ جیلوں کو توڑ کر قیدیوں کو آزاد کر دینا تھا، صوبہ غرب و شمال میں صرف
قیدیوں سے تقریباً پچیس ہزار کی فوج تیار کی جا سکتی تھی[1]

اس نقشے کو سامنے رکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ ہر نقطۂ نگاہ سے ملکی آزادی
کی جنگ نہ تھی؟

چپاتی اور کنول ساورکر نے لکھا ہے کہ جب تحریک پھیل گئی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ مختلف طبقوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اس کے متعلق بنگال میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا
انقلابیوں کا ایک خاص قاصد ہر چھاؤنی میں جاتا، سب سے بڑے ہندوستانی افسر سے ملتا اور اُسے سُرخ کنول
کا پھول دکھاتا۔ افسر وہ پھول پاس کے سپاہی کو دے دیتا اور اسی طرح پھول ایک ایک سپاہی کے ہاتھ میں
پہنچتا۔ یہ پھول پاکیزگی، فتح اور روشنی کا نشان تھا[2]

---

[1] یہ رپورٹ کیئی اور بعض دوسرے مصنفوں نے بھی نقل کی ہے۔ میں یہ اقتباس ساورکر کی کتاب سے
پیش کر رہا ہوں۔ ملاحظہ ہو ص ۷۵ [2] ساورکر ص ۷۷

دہلی، کرنال، میرٹھ اور آس پاس چپاتیاں بٹی تھیں۔ چپاتیاں بھی تحریک میں وحدت اور ارتباط پیدا کرنے کا ذریعہ تھیں۔ یہ ہر گاؤں کے چوکیدار کے پاس جاتیں، وہ ایک ٹکڑا خود کھاتا، باقی تبرک یا پرشاد کے طور پر دوسروں میں بانٹ دیتا اور جتنی چپاتیاں آئی تھیں اتنی ہی پکوا کر دوسرے گاؤں میں بھجوا دیتا۔[1]

سرسید نے اسباب غدر میں انھیں چپاتیوں کا ذکر کیا ہے اور بہادر شاہ کے مقدمے میں بھی ان کے متعلق بڑے سوالات کیے گئے تھے۔ غرض یہ بھی خفیہ ساز باز کا ایک نشان تھا۔ البتہ وثوق سے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کے بٹنے کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا اور ان کی ایجاد کا ذمہ دار کون تھا۔ ساورکر نے لکھا ہے کہ بغاوت ویلور سے پیشتر بھی چپاتیاں بانٹی گئی تھیں۔

---

[1] ساورکر ص ۷۹

آغاز

باب ۱

منگل پانڈے اور ایشوری پانڈے

صورت حال بے چینی اور اضطراب کے اسباب و محرکات پورے زور سے کارفرما تھے اگرچہ فضا بہ ظاہر بالکل صاف و پرسکون نظر آتی تھی اور اس میں کوئی ایسی علامت نہ پائی جاتی تھی، جس سے تکدر کے ممکنات کا سراغ مل سکے۔ طوفانوں کی آمد سے پہلے عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ خطرے کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، ورنہ طوفانوں کی شدت نمایاں کیوں کر ہو؟ اچانک اور بے خبرانہ آنا ہی ان کی کارفرمائی کو زیادہ سے زیادہ رنج دہ اور قلق افزا بنانے کا موجب ہوتا ہے۔

سخت حیرت ذمہ دار انگریز افسروں کی ذہنیت پر ہے کہ وہ جانتے تھے، دیسی فوجیوں کو چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے گریز ہے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ معاملہ ذاتی پسند و ناپسند کا نہیں بلکہ مذہب اور دھرم کا ہے؛ جس میں کم از کم عوام کے لیے انتخاب کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ انھیں زیادہ سے زیادہ دور اندیشی سے کام لینا چاہیے تھا، لیکن وہ اقتدار کی سرمستیوں میں ہر مصلحت کو نظر انداز کیے بیٹھے تھے اور صرف ایک ہی چیز ان کے سامنے رہ گئی تھی کہ جو حکم جاری ہو، وہ بے چون وچرا مانا جائے۔ اسی طرح مانا جائے جس طرح وہ منوانا چاہتے تھے۔

انفیلڈ رائفل اور کارتوس ۱۸۵۶ء کے اواخر میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ پرانی بندوق کی جگہ انفیلڈ رائفل جاری کردی جائے۔ اس غرض سے تین مقامات پر ٹریننگ کے لیے سکول قائم کیے گئے تھے۔ ایک ڈم ڈم میں (نزد کلکتہ) دوسرا

انبالہ میں اور تیسرا سیالکوٹ میں۔ اس نئی بندوق کے لیے کارتوسوں کی بہت بڑی مقدار فورٹ ولیم میں تیار کی گئی تھی اور تینوں سکولوں میں پہنچا دی گئی تھی[1]

۱۸۵۳ء میں انگلستان سے بھی کارتوسوں کی پیٹیاں آئی تھیں اور کہا گیا تھا کہ یہ استعمال کرنے کے لیے نہیں، صرف یہ دیکھنا اور جانچنا مقصود ہے کہ ان پر یہاں کی آب و ہوا کا کیا اثر پڑتا ہے۔ ان کارتوسوں میں سے بھی ساڑھے بائیس ہزار انبالہ اور چودہ ہزار سیالکوٹ بھیجے گئے تھے[2] ان میں یقیناً سور کی چربی لگی ہوئی تھی۔ بعد میں کہا گیا کہ یہ صرف گوروں کے لیے تھے، حالانکہ پہلے انھیں گوروں کے لیے مخصوص نہیں کیا گیا تھا۔

چونکہ نئے کارتوسوں کو استعمال کرتے وقت دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا، لہٰذا افواہ پھیلی کہ اس طرح انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب میں خلل ڈالنا چاہتے ہیں اور یقیناً چربی والے کارتوسوں کے بارے میں یہ شبہ بے بنیاد نہ تھا خواہ انگریزوں نے یہ فعل دانستہ کیا تھا یا نادانستہ[3]

ڈمڈم سب سے پہلے ڈم ڈم میں بے چینی اور اضطراب کے آثار نے اک گونہ عملی صورت اختیار کی۔ ۲۴ جنوری ۱۸۵۷ء کو پریذیڈنسی ڈویژن کے کماندار میجر جنرل ہیرسی نے

---

[1] فارسٹ جلد اوّل صفحہ ۱ ۔ [2] کیئی جلد اوّل صفحہ ۵۲۰ حاشیہ۔ نیز سین کی کتاب ص ۴۲ کرنیل ٹکر نے اس وقت ملٹری بورڈ کو خبردار کر دیا تھا کہ ہندوستانیوں پر ان کا بُرا اثر پڑے گا۔ [3] کیئی نے جلد اوّل صفحہ ۵۱۹ کے حاشیے میں بالتصریح لکھا ہے کہ ۵۔ اگست ۱۸۵۶ء کو گنگا دھر بینرجی اینڈ کمپنی نے چھوٹی چھوٹی چیزیں فورٹ ولیم کے لیے فراہم کرنے کا جو ٹھیکہ لیا تھا، اس میں چربی بھی شامل تھی، جو دو آنے فی پونڈ کے حساب سے دی جاتی تھی۔ ۲۹۔ جنوری ۱۸۵۷ء کو حکم دیا گیا تھا کہ جو چربی دیسی سپاہیوں کے استعمال کی چیزوں میں صرف ہوتی ہے، وہ بھیڑ یا بکری کی۔ اول ظاہر ہے ٹھیکیدار یہ یقین نہ دلا سکتا تھا کہ چربی واقعی بھیڑ یا بکری کی ہے، دوسرے سپاہیوں کو یہ اطمینان کیوں کر ہو سکتا تھا کہ جو کارتوس انھیں دیے جا رہے ہیں، وہ مندرجہ بالا حکم کے بعد کے بنے ہوئے ہیں۔[4]

اپنے ماتحتوں کے دو خط حکومت ہند کے فوری ملاحظے کے لیے بھیجے، جن کا مفاد یہ تھا کہ جو دیسی سپاہی انفیلڈ رائفل کی ٹریننگ کے لیے آئے ہیں، ان میں کارتوسوں کی چربی کے متعلق شدید ناخوشگوار احساسات پائے جاتے ہیں۔ بعض بد طینت افراد نے افواہ پھیلادی ہے کہ ان میں گائے اور سؤر کی چربی استعمال ہوتی ہے تاکہ ہندوؤں کا دھرم اور مسلمانوں کا دین دونوں برباد ہو جائیں۔

اس افواہ کو نیچ ذات کے ایک خلاصی کے بیان سے بہت تقویت پہنچی۔ اس نے ایک روز ایک برہمن سپاہی سے کہا کہ اپنے لوٹے سے مجھے پانی پلادیجیے۔ برہمن نے جواب دیا مجھے کیا معلوم کہ تیری ذات کیا ہے؟ خلاصی نے معاً جواب دیا کہ یہ تمھارا ذات پات کا بُت بہت جلد چکنا چور ہو جائے گا، اس لیے کہ تمھیں وہ کارتوس دانتوں سے کاٹنے پڑیں گے، جن پر گائے اور سؤر کی چربی لگائی جاتی ہے[1]

انگریز افسروں نے سپاہیوں کو یقین دلایا کہ یہ بیان غلط ہے، اس لیے کہ کارتوسوں میں بھیڑ بکری کی چربی استعمال ہوتی ہے، سپاہیوں نے کہا کہ ممکن ہے آپ کی بات درست ہو، لیکن عام سپاہیوں کو اس کا یقین دلانا ممکن نہیں۔

میجر بونٹین[2] کو یہ علم ہوا تو اس نے بندوق سیکھنے والے دیسی سپاہیوں کو پریڈ کا حکم دے دیا اور کہا کہ جو شکایت ہو بے تکلف بیان کرو۔ انھوں نے انتہائی احترام سے کارتوسوں کے بارے میں اپنے احساسات پیش کرتے ہوئے کہا کہ تیل اور موم کے سوا چکنائی کے لیے اور کچھ نہ لگایا جائے چنانچہ بونٹین کی سفارش کے مطابق حکم جاری کردیا گیا کہ ضروری جنسیں بازار سے خرید کر سپاہیوں کو خواہش کے مطابق چکنائی تیار کرلینے کی اجازت دے دی جائے[3]

---

[1] فارسٹ جلد اوّل ص ۲۰۱ HEARSEY, BONTIEN [2]

[3] فارسٹ جلد اوّل صفحہ ۲۰۲۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ تجویز جنرل ہیرسی کی تھی یعنی یہ کہ سپاہی خود چکناہٹ کا بندوبست کرلیں۔ ہدایات جاری کردی گئی تھیں کہ انبالہ اور سیالکوٹ کے سپاہیوں کو آگاہ کردیا جائے اور کمانڈر انچیف سب کو یقین دلادے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس حکم کے سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا گیا، اس لیے کہ سپاہی اپنی تمام بندوقوں کے لیے چکنے کارتوس استعمال کرتے ہیں۔ اگر اب کچھ کیا گیا تو وہ سمجھیں گے کہ ان کی ذات برباد ہوئی رہین صفحہ ۲۰۲)

بارک پور

اس اثنا میں بارک پور کی چھاؤنی کے سپاہی بھی بے چینی کا تختۂ مشق بن چکے تھے مذہبی احساسات سب میں یکساں موجود تھے اور جس جس گروہ کو چربی کے متعلق اطلاع ملتی گئی، اس کے دل میں تشویش پیدا ہوتی گئی۔ بارک پور پریزیڈنسی ڈویژن کے کمانڈر جنرل ہیرسی کا مرکز تھا اس نے فوراً ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کر دی کہ سپاہیوں سے پوچھ گچھ کے بعد رپورٹ پیش کی جائے۔ چنانچہ اس کمیٹی یا کورٹ نے متعدد مسلم اور غیر مسلم فوجیوں سے شہادتیں لیں۔ جو رپورٹ تیار ہوئی اس کے متعلق جنرل ہیرسی نے اپنی رائے یہ لکھی کہ شبہات اگرچہ بے بنیاد ہیں، تاہم سپاہیوں کے دل میں اس طرح جڑ پکڑ چکے ہیں کہ انھیں دُور کرنے کی کوشش بالکل فضول و بے سود ہوگی۔ للٰذا مناسب یہ ہے کہ انفیلڈ رائفل کے لیے کارتوس اسی کاغذ سے بنائے جائیں جو عام بندوقوں کے کارتوسوں میں استعمال ہوتا ہے، اسی طرح شُبہ دور ہو سکے گا۔[1]

بارُود کی سُرنگ

شبہات دُور کرنے کے لیے جو قدم اٹھائے گئے تھے، عملاً موثر ہو سکے یا نہ ہو سکے، لیکن سپاہیوں نے اپنے مذہبی حقوق کے تحفظ کے لیے باہم بات چیت شروع کر دی تھی اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جنرل ہیرسی کا بیان ہے کہ ۳۴ رجمنٹ کے جمعدار نے مجھے بتایا ۵ فروری کو کچھ آدمی میرے پاس آئے اور اپنے ساتھ لے گئے۔ ہم پریڈ کے میدان میں پہنچے تو وہاں خاصا مجمع تھا۔ سب نے اپنے سر اور منہ اس طرح باندھ رکھے تھے کہ کسی کو پہچاننا مشکل تھا۔ البتہ آوازوں سے ایک حد تک اشخاص کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ وہاں مجھے (جمعدار کو) بھی ساتھ دینے کے لیے کہا گیا۔ جب میں نے پوچھا کہ کرنا کیا ہے؟ تو بتایا گیا کہ ہم سب کو دین کی خاطر جانیں دے دینی چاہئیں۔ موقع ملے تو ۶۔ فروری کی رات کو ایک دم اٹھ کر انگریز افسروں کو ختم کر دینا چاہیے، پھر جہاں جی چاہے گا چلے جائیں گے۔

جنرل ہیرسی نے یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ہم واقعی بارود بھری سرنگ پر بیٹھے ہیں، جو کسی وقت بھی بھک سے اڑ سکتی ہے۔[2]

---

[1] فارسٹ جلد اوّل صفحہ ۸-۹ ✤ [2] ایضاً ص ۹ ✤

فوج کو خطاب ہیرسی نے پوری صورت حال کا اندازہ کر کے ۹ فروری کو پریڈ کا حکم دیا اور وہاں سب کے سامنے بلند آواز سے کہا کہ عیسائی اہلِ کتاب ہیں۔ ہم کسی کا عیسائی ہونا اس وقت تک قبول نہیں کر سکتے جب تک وہ بالغ نہ ہو پڑھا لکھا نہ ہو اور مذہب کے اصول سے پوری طرح آگاہ نہ ہو جائے۔[1]

اس امر پر کسی بحث کی ضرورت نہیں کہ جنرل ہیرسی نے جو کچھ کہا، وہ درست تھا یا نادرست، لیکن سوال یہ تھا کہ گائے اور سور کی چربی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب پر کیا اثر پڑتا تھا، وہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان کا مذہب بگڑ جائے گا، انھیں ہم عقیدہ گروہوں میں سے خارج کر دیا جائے گا، پھر اس کے سوا چارہ نہ رہے گا کہ وہ عیسائیت قبول کر لیں، گویا ان کے خیال کے مطابق تنہا چربی کے استعمال سے عیسائی بننے کا امکان تھا یا نہیں تھا، لیکن عیسائیت کے لیے راستہ ضرور ہموار ہوتا تھا۔

بہرام پور بارک پور کلکتہ سے صرف سولہ میل کے فاصلے پر تھا۔ بہرام پور اس سے بھی آگے مرشد آباد کے قریب واقع تھا۔ وہاں بھی ایک چھاؤنی تھی اور کرنیل مچل[2] اس چھاؤنی کی فوج کا کماندار تھا۔ جب گائے اور سور کی چربی والے کارتوسوں کی افواہ عام ہوئی تو ایک برہمن حوالدار نے کرنیل مچل سے اس بارے میں حقیقت حال پوچھی۔ مچل نے افواہ کی تردید کی۔ مزید چند روز گزر گئے ۲۴ فروری کو بارک پور سے کچھ سپاہی بہرام پور پہنچے۔ ان سے بات چیت کے بعد سپاہیوں میں پھر تشویش پھیل گئی۔ کرنیل مچل نے اگلے دن سپاہ کو پریڈ کا حکم دے دیا۔ جب اسے اطلاع ملی کہ سپاہیوں میں کارتوسوں کے متعلق شبہات ظاہر کیے جا رہے ہیں تو اس نے تمام دیسی کمیشن یافتہ افسروں کو جمع کر کے حکم دے دیا کہ سب سپاہیوں پر واضح کر دیں، جو حکم عدولی کرے گا، وہ سخت سزا کا مستوجب ٹھہرے گا۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق کہا، حکم عدولی کرنے والے سپاہیوں کو برما اور چین بھیج دیا جائے گا، جہاں سے

---

[1] فارسٹ جلد اول ص ۱۰-۱۱ [2] HETCHELL

وہ زندہ واپس نہ آسکیں گے [1]

نازک حالات

اس احمقانہ حکم کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ سپاہیوں کے شبہات یقین میں بدل جاتے اور یہی ہوا۔ یہ سب ۱۹ کے سپاہی تھے، انھوں نے جھٹ ایک فیصلہ کیا۔ رات کے گیارہ بجے ڈھول بجا اور سب سپاہی آخری اقدام کے لیے تیار ہو گئے۔

مچل حد درجہ ضدی اور شعلہ مزاج آدمی تھا۔ اُسے جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اُس نے توپ خانے اور گوروں کے رسالے کو تیار کر کے ساتھ لیا اور سپاہیوں کے پاس پہنچ گیا۔ اب اس نے دیسی افسروں سے کہا کہ سپاہیوں سے ہتھیار رکھوا دو۔ اس کا جواب یہ ملا کہ جب تک گوروں کا رسالہ اور توپ خانہ موجود ہے، سپاہی ہتھیار نہ رکھیں گے، البتہ اگر ان دونوں کو ہٹا لیا جائے گا، تو وہ چپ چاپ اپنی بارکوں میں چلے جائیں گے۔ رد و کد کے بعد مچل نے صبح کے تین بجے رسالے اور توپ خانے کو واپس بھیج دیا، ساتھ ہی کہہ دیا کہ صبح پریڈ ہو گی۔ چنانچہ سپاہی پریڈ میں آئے، ان میں سے کسی نے نافرمانی کی کوئی حرکت نہ کی۔

انگریزی فوج کی طلبی

۱۹ کی اس حرکت کے بعد فیصلہ کر لیا گیا کہ اسے توڑ دیا جائے لیکن کلکتہ اور دانا پور کے درمیان تین سو میل کی مسافت میں صرف ایک گورا رجمنٹ موجود تھی۔ ضروری تھا کہ گوروں کی تعداد بڑھائی جاتی۔ اس غرض سے ایک جہاز رنگون بھیج دیا گیا کہ وہاں سے گورا فوج کو لے آئے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ انگریزوں کی حماقت بلکہ بد طینتی میں کسی کو شبہ ہو سکتا ہے؟ معاملہ کارتوسوں کا تھا اور ان کے متعلق کوئی بھی شخص سپاہیوں کو ملزم نہیں ٹھہرا سکتا تھا، اس لیے کہ چربی کے باب میں بے احتیاطی خود انگریزوں نے کی تھی۔ سپاہی احتجاج کے بعد چپ چاپ بیٹھ گئے تھے۔ انھوں نے

---

[1] سرکاری دستاویزیں جلد اوّل صفحہ ۵۳ ۔

کسی بھی فوجی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ پھر انھیں برخاست کیوں کیا جا رہا تھا؟ اس کا مطلب صرف ایک ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ سپاہیوں کو بہرحال انگریزوں کا حکم ماننا چاہیے۔ اگرچہ وہ خلاف مذہب ہی کیوں نہ ہو؟ یہ ملازمت کی کون سی شرط تھی؟

پھر اگر ۱۹ کو توڑنا تھا تو اس کے لیے گورا فوج باہر سے لانے کا انتظام کیوں کیا گیا؟ کیا اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ انگریز اپنے فوجیوں کے سوا کسی پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے؟ اگر ان کے دلوں کی یہ کیفیت تھی تو دیسی سپاہیوں کے لیے افسروں پر بھروسا کرنے یا انھیں اپنا سمجھنے کی کون سی وجہ تھی۔

سب سے آخر میں یہ کہ جب سپاہیوں کے دلوں میں شبہات کا سمندر موجزن تھا تو اس حالت میں گورا فوج کو بالاہتمام بلانے کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ انگریز جو مقصد امن و امان کی حالت میں پورا نہیں کر سکے تھے، اسے زور، جبر اور قوت سے پورا کرنے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے۔ اس کا اثر سپاہیوں پر زیادہ سے زیادہ ناخوشگوار ہی ہو سکتا تھا اور یہی ہوا۔ تعجب ہے کہ اس وقت انگریزوں میں ایک بھی دور اندیش، حق شناس اور مصالحت دوست آدمی موجود نہ تھا۔ سب سوچ رہے تھے کہ دیسی فوجیوں کو کیوں کر مرعوب و دہشت زدہ کر کے بے چون و چرا فرماں برداری پر مجبور کیا جا سکتا ہے؟ یہ اجنبیت اور فرعونیت دیسی سپاہیوں میں انتہائی ناراضی اور غیظ و غضب کی آگ بھڑکانے کے سوا اور کیا نتیجہ پیدا کر سکتی تھی؟

متفرق واقعات

اس اثنا میں کچھ اور واقعات بھی پیش آئے، جن سے بے چینی کی شدت و وسعت کے مزید ثبوت ملے۔ مثلاً:

۱۔ دیسی پیادہ فوج کے دو سپاہی ایک روز فورٹ ولیم میں ٹکسال کی گارد کے صوبیدار سے ملے اور کہا کہ گورنر جنرل صاحب بارک پور جا رہے ہیں، شاید وہاں لڑائی ہو۔ کلکتہ کی ملیشیا کو قلعہ میں بھیجا جا رہا ہے۔ ہمارے حوالدار میجر کا حکم ہے کہ آپ بھی اپنی گارد دے کر دیسی سپاہ سے آملیں۔

ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا اور انھیں دیسی افسروں کی عدالت سے چودہ چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔

۲۔ بارک پور میں عمارتیں جلنی شروع ہو گئی تھیں۔ پہلے تار گھر کو آگ لگی یا لگائی گئی پھر پے در پے افسروں کے بنگلے کو جلایا جانے لگا۔ بنگلوں کی چھتیں گھاس پھوس کی تھیں۔ رات کے وقت آتشیں تیر آکر چھت پر گرتا اور آگ بھڑک اٹھتی۔

۳۔ گورا فوج کے آنے کی افواہ پھیلی تو بارک پور میں بے چینی بڑھ گئی۔ جنرل ہیرسی کو یقین دلانا پڑا کہ کوئی گورا یا دوسرا فوجی اس وقت تک بارک پور میں نہ آئے گا جب تک میرا حکم جاری نہ ہوگا۔ میں حکم جاری کروں گا تو پہلے خبر دے دوں گا۔[1]

منگل پانڈے

۲۹ مارچ کو اتوار کے دن بعد دوپہر ایک غیر کمیشن یافتہ دیسی افسر لفٹنٹ باگھ[2] (ایڈجوٹانٹ ۳۴ پیادہ فوج) کے بنگلے پر پہنچا اور اطلاع دی کہ ایک سپاہی منگل پانڈے نے کوارٹر گارد کے سامنے سارجنٹ میجر پر گولی چلا دی۔ باگھ گھوڑے پر سوار ہو کر موقع پر پہنچا۔ دفعتاً اس پر بھی گولی چلی۔ اتفاق سے وہ بچ گیا، البتہ اس کا گھوڑا گولی کھا کر مر گیا۔ باگھ نے دیکھا کہ منگل پانڈے دوبارہ بندوق بھر رہا ہے چنانچہ اس نے بھی گولی چلائی۔ اتفاق سے منگل پانڈے بھی بچ گیا۔ پھر باگھ تلوار کھینچ کر بڑھا۔ اس اثنا میں سارجنٹ میجر نے بھی قدم آگے بڑھایا، لیکن ایک سپاہی نے سارجنٹ میجر کو گرا دیا۔ اس کے بعد باگھ بھی گر گیا۔ ان دونوں کے مارے جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی، اچانک ایک مسلمان سپاہی شیخ پلٹو نے جو بالکل غیر مسلح تھا، ہمت کر کے منگل پانڈے کو کمر سے پکڑ لیا۔ دوسرے کسی شخص نے افسروں کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کی، بلکہ شیخ پلٹو کو بھی دھمکایا اور گالیاں دی گئیں کہ منگل پانڈے کو چھوڑ دو، ورنہ مارے جاؤ گے۔ اس نے گرفت نہ چھوڑی، یہاں تک کہ دونوں انگریز بچ کر

[1] فارسٹ جلد اول صفحہ ۱۸۱، یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ ایک جمعدار سالگ رام سنگھ کو اس بنا پر برطرف کیا گیا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے روبرو چکنے کارتوسوں کی مذمت کر رہا تھا۔ (سین ص ۴۹)

[2] BAUGH

نکل گئے۔ ایک اور سپاہی نے دوڑ کر سارے حالات کی خبر جنرل ہیرسی کو پہنچادی۔

ہیرسی کی ہمّت

ہیرسی نے فوراً گھوڑے پر زین ڈلوائی، دو پستول بھر لیے، دو مختصر نوٹ لکھے: ایک چنسرہ میں کرنیل ریڈ[1] کے نام، دوسرا ڈم ڈم میں ایک کرنیل کے نام۔ تاکید کردی کہ فوراً فوج کے ساتھ بارک پور پہنچ جاؤ۔ خود اپنے دو بیٹوں کپتان جان ہیرسی[2] اور رائیڈر لوولیم ہیرسی کے ساتھ موقع پر پہنچا۔ ایک افسر نے پکار کر کہا کہ منگل پانڈے نے بندوق بھر رکھی ہے۔ جنرل ہیرسی بے توقف بولا: "تف اس کی بندوق پر" اور گھوڑا آگے بڑھاتا گیا۔

منگل پانڈے اس وقت جوش سے بے خود ہو کر بندوق لیے اِدھر اُدھر پھر رہا تھا اور سپاہیوں کو گالیاں دے رہا تھا کہ تم نے مجھے اُکسایا، اب میرا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟

جنرل ہیرسی اور آگے بڑھا، تو اس کے بیٹے جان نے کہا: "ابا جان! وہ آپ کی طرف شست باندھ رہا ہے۔" ہیرسی نے صرف اتنا کہا کہ دیکھو جان! اگر میں مارا جاؤں تو اُسے موت کے گھاٹ اتار دینا۔ منگل پانڈے نے اچانک بندوق کا رُخ اپنی طرف کرلیا۔ پاؤں سے لبلبی دبائی اور سخت زخمی ہو کر گر گیا۔ ہیرسی نے اسے فوراً ہسپتال پہنچایا۔ دیکھا گیا تو زخم اگرچہ بہت سخت تھا تاہم مہلک نہ تھا۔

پھر سپاہیوں سے خطاب کیا کہ کیا وجہ ہوئی تم لوگ اس وقت اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام رہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ منگل پانڈے نے بھنگ پی رکھی تھی اور وہ پاگل ہو رہا تھا۔ ہیرسی بولا: پھر اسے اسی طرح موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے تھا، جس طرح مست ہاتھی یا دیوانے کُتّے سے سلوک کروگے۔ ایک شخص بولا کہ اس کے پاس بھری ہوئی بندوق تھی۔ ہیرسی بولا: "واہ تم بھری ہوئی بندوق سے ڈرتے ہو؟"

یقیناً ہیرسی کا یہ کارنامہ بڑی ہی مردانگی اور ہمّت سے معمور تھا۔ اس طرح جان کی بازی لگا کر اس نے نازک صورتِ حال پر بھی قابو پا لیا اور جو شعلہ میگزین میں گرنے والا تھا، اسے بھی بجھا دیا۔[3]

---

[1] REED [2] JOHN HEARSEY, ANDREW WILLIAM HEASAY. [3] یہ تفصیل متعدد کتابوں پر مبنی ہیں مثلاً فارسٹ جلد اوّل صفحہ ۱۸-۲۲ کیی جلد اوّل صفحہ ۵۳۸-۵۴۳ سرکاری دستاویزیں جلد اوّل صفحہ ۱۰۹-۱۱۱

سادر کر کا بیان

سادر کر کا بیان کسی قدر مختلف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ منگل پانڈے نے اوّل باگھ کا گھوڑا گرایا، پھر خود باگھ کو زخمی کیا۔

۲۔ ایک اور انگریز آگے بڑھا۔ ایک سپاہی نے بندوق کے کندے سے اُس کے سر پر ضرب لگائی اور سپاہیوں سے بلند آواز سے کہا: منگل پانڈے کو ہاتھ نہ لگانا۔

۳۔ فوراً کرنیل وھیلر موقع پر پہنچا اور حکم دیا کہ منگل پانڈے کو گرفتار کر لیا جائے۔ سپاہیوں نے جواب دیا کہ ہم اس برہمن کو ہاتھ تک لگانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

۴۔ منگل پانڈے پکارتا رہا: بھائیو! اُٹھو، ہمّت کرو۔

۵۔ جب جنرل ہیرسی کچھ انگریز سپاہی لے کر آگیا اور منگل پانڈے کو یقین ہو گیا کہ وہ گرفتار ہو جائے گا تو اُس نے گرفتاری پر موت کو ترجیح دیتے ہوئے بندوق کی نالی اپنی چھاتی پر رکھ کر لبلبی دبا دی اور زخمی ہو کر گر گیا۔[۲]

۱۹ کی برخاستگی

منگل پانڈے کے واقعے سے پیشتر ۱۹ فوج کو بہرام پور سے بارک پور بلوا لیا گیا تھا۔ ۳۱ مارچ کو وہ فوج بارک پور پہنچی۔ جنرل ہیرسی نے پورے انتظامات کے بعد اسے گورنر جنرل کا حکم سُنا دیا کہ حکومت ہر حال میں کامل فرمانبرداری کی طلب گار ہے اور جو کچھ بہرام پور میں پیش آیا، اس کے بعد ۱۹ پر مزید بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اسے توڑا جاتا ہے۔ لازم ہے کہ ہتھیار رکھ دیے جائیں۔ سب نے ہتھیار رکھ دیے، ان کی تنخواہوں کا حساب کر کے پیسے دے دیے گئے اور گھروں تک کرایے کا انتظام بھی کر دیا گیا۔[۳]

منگل پانڈے کو پھانسی

۶ اپریل کو منگل پانڈے کا مقدمہ ایک فوجی عدالت کے روبرو پیش ہوا جو صرف دیسی فوجی افسروں پر مشتمل تھی۔ صوبیدار میجر جواہر لال تیواڑی اس عدالت کا صدر تھا۔ صوبیدار بھولا اپودیہ، کھڑک سنگھ، رام سنگھ، امانت خاں، سومیر پانڈے، درگارام

---

[۱] WHEELER, WHELLER جیسا کہ سادر کر نے لکھا ہے۔ [۲] سادر کر صفحہ ۸۷، ۸۸ [۳] فارسٹ جلد اوّل صفحہ ۲۳

خدابخش، میردان سنگھ، سکھ لال مصر، اجودھیا تیواڑی، ظالم سنگھ، دیوان علی جمعدار، موہن سنگھ اور رام بخش اس کے ممبر تھے۔

۶؍ اپریل کو گیارہ بجے قبل دوپہر مقدمہ شروع ہوا۔ منگل پر دو الزام تھے، اول بغاوت، دوم افسروں کے خلاف تشدد۔ مختلف شہادتوں میں واقعے کی تفصیلات پیش ہوئیں، ۷ اپریل کو عدالت نے منگل کے لیے پھانسی کی سزا تجویز کر دی اور ۸؍ اپریل کو بارک پور میں اسے پھانسی دے دی گئی۔ موت کے وقت ۲۶ سال کی عمر تھی اور اس کا ریکارڈ بالکل بے داغ تھا۔ ساورکر نے لکھا ہے کہ وہ بڑے اطمینان سے پھانسی کے مقام تک گیا۔ اس سے بار بار پوچھا گیا کہ اپنے ساتھی سازشیوں کے نام بتادے، لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔[1]

ساورکر صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ منگل پانڈے کا یہ فعل کسی ذاتی رنج یا دشمنی کا نتیجہ نہ تھا۔ اس کی تلوار دھرم اور وطن کی حفاظت کے لیے بے نیام ہوئی تھی۔ اگر اُسے کسی کے خلاف ذاتی دشمنی ہوتی تو اس کا نام شہیدوں کے بجائے قاتلوں میں درج ہوتا۔[2] یہاں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ شیخ پلٹو نے جیسے مثالی خدمت انجام دی تھی، اس کے بدلے میں اسے تیسرے درجے کا اعزازی تمغہ ملا۔ مدت کے بعد ایک انگریز افسر نے اس کا سراغ لگایا اور ایک گاؤں جاگیر میں اس کے لیے منظور کرایا۔

ایشوری پانڈے

اب جمعدار ایشوری پانڈے کا معاملہ سامنے آیا۔ فارسٹ نے لکھا ہے کہ اس نے سپاہیوں کو منگل پانڈے کی گرفتاری سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ بعض دوسرے بیانات سے واضح ہے کہ ایشوری موقع پر موجود تھا۔ جب اس سے کہا گیا کہ منگل پانڈے کو گرفتار کر لو۔ تو وہ خاموش اور بے پروا کھڑا رہا۔ حکم دہرایا تو اُس نے جواب دیا کہ منگل پانڈے پاگل ہے۔ خود ایشوری پانڈے نے بیان کیا کہ میں نے سب کو آگاہ کر دیا تھا، منگل پانڈے سے بچو اور درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو جاؤ۔ سارجنٹ میجر نے میری بات نہ سنی اور گولی کھائی۔

بہرحال اس غریب پر بھی ۱۳؍ اپریل کو فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور پھانسی کی سزا تجویز

---

[1] ساورکر صفحہ ۸۹ [2] ایضاً صفحہ ۸۸

ہوئی۔ چونکہ اس بارے میں اوپر سے منظوری لینا لازم تھا، اس لیے سزا کے نفاذ میں تاخیر ہو گئی۔
۲۱۔ اپریل کو شام کے چھ بجے اسے بھی پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

یہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ عظیم کے مقدمات تھے جو بارک پور میں پیش آئے۔ انھیں کی حرارت جگہ جگہ پہنچی، یہاں تک کہ ۱۰۔ مئی کو میرٹھ میں ایک خوفناک اشتعال پیش آیا اور وہ جنگ شروع ہو گئی جسے انگریز اپنے دورِ اقتدار میں "غدر" کہتے رہے، لیکن اہلِ ملک نے ہوش سنبھالتے ہی اسے آزادی کی پہلی جنگ قرار دیا۔

انبالہ کے واقعات

مارچ ۱۸۵۷ء میں کمانڈر انچیف شملہ جاتا ہوا انبالہ میں سے گزرا پہلے بتایا جا چکا ہے کہ انبالہ بھی انفیلڈ رائفل کی ٹریننگ کے تین مرکزوں میں سے ایک مرکز تھا۔ وہاں ایک حوالدار کاشی رام تیواڑی اور ایک نائک جیو لال دوبے بھی ٹریننگ لے رہے تھے، ان کا تعلق جس پلٹن سے تھا، وہ کمانڈر انچیف کے ساتھ جا رہی تھی۔ چنانچہ مذکورہ بالا آدمی اپنی پلٹن کے صوبیدار سے ملے۔ اس نے چکنے کارتوسوں کو استعمال کرنے کی بنا پر اپنے دونوں ساتھیوں سے وہی برتاؤ کیا جو مذہب سے برگشتہ آدمیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ معاملہ لفٹنٹ مارٹی نیو تک پہنچا جو ٹریننگ کا ذمہ دار تھا، اس نے افواہ کی تردید کی لیکن معاملہ کمانڈر انچیف کے گوش گزار کر دیا، جس نے خود معائنہ کے بعد یقین دلایا کہ افواہ بالکل بے بنیاد ہے۔ تحقیقات کے بعد صوبیدار کے طرزِ عمل کو، جس کا نام رگ پال سنگھ تھا، نازیبا قرار دیا گیا، مگر حوالدار اور نائک پر یہ الزام لگا کہ انھوں نے اس طرزِ عمل کو نشر کیا اور دوسروں کے دل میں خطرات پیدا کیے۔ چنانچہ ان کی مذمت کی گئی اور حوالدار کی ترقی روک دی گئی [1]

---

[1] سین کی کتاب ص ۵۲-۵۳

باب ۲

میرٹھ ـــــــ پہلی چنگاری

انگریزوں کی ذہنیت

کارتوسوں کے مسئلے نے تمام دیسی فوجوں میں شدید بے چینی پیدا کر دی تھی، مگر انگریز اس سے بالکل بے پروا تھے۔ جس سرزمین پر وہ زیادہ تر یہاں کی سپاہ اور کمتر اپنی سپاہ کے ذریعے سے حکومت کر رہے تھے، اس کے باشندوں سے اجنبیّت اور بے تعلقی کی ایسی مثالیں بہت ہی کم ملیں گی۔

اس سوال کو بالکل نظر انداز کر دیجیے کہ کارتوس واقعی قابلِ اعتراض تھے یا نہ تھے، لیکن جب سپاہیوں کے دل میں ایک خیال پیدا ہو چکا تو اُسے نرمی، ملائمت اور تفہیم ہی کے ذریعے سے دور کرنا مناسب تھا۔ کارتوسوں کے استعمال پر اندھا دھند اصرار سے غلط فہمی بڑھ ہی سکتی تھی۔ اس میں کمی کا کون سا امکان تھا؟

پورے حالات سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ انگریز یا تو یہاں کے لوگوں کو اس درجہ بے حیثیت اور غیر وقیع سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کے مذہبی جذبات کے لیے بھی کسی نوع کا احترام ضروری قرار نہ دیتے تھے، یا پھر تسلیم کر لینا چاہیئے کہ کارتوس ذریعہ تخریب مذہب تھے یا نہ تھے لیکن انگریزوں کو مذہب کی تخریب میں بھی کوئی باک نہ تھا۔ ان کے خلاف ناراضی کے جو آتش گیر اسباب مدت سے فراہم ہو رہے تھے، یہ تازہ سبب ان میں چنگاری بن کر گر اہ

میرٹھ چھاؤنی

میرٹھ دہلی سے تیس پینتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں کی چھاؤنی بہت بڑی تھی، جس کا محیط پانچ میل بتایا جاتا ہے۔ ٹھنڈی سڑک نے اسے

دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ شمالی حصّے میں گورا فوج مقیم تھی۔ دائیں جانب توپخانے کی بارکیں تھیں، بائیں جانب رسالے کی اور بیچ میں پیادہ فوج رہتی تھی۔ رسالے اور پیادہ فوج کی بارکوں کے درمیان چھاؤنی کا گرجا تھا اور بارکوں کے شمال میں پریڈ کا میدان تھا۔ دیسی سپاہیوں کی لائنیں جنوبی حصّے میں تھیں۔ ان دونوں حصّوں کے درمیان دکانیں اور مکانات تھے۔ ان کے اردگرد باغات اور درخت لگے ہوئے تھے۔ یورپی رجمنٹوں کے افسروں نیز توپخانے کے افسروں کے بنگلے دیسی سپاہیوں کی بارکوں کے قریب تھے۔ برگیڈیر کا بنگلہ دائیں جانب توپخانے کی بارکوں اور سکوٹ کے قریب تھا۔ اس کے برعکس جرنیل کا بنگلہ دیسی سپاہیوں کی لائنوں سے نزدیک تھا۔ برگیڈ کے کمانڈر یعنی برگیڈیر کا نام ولسن اور ڈویژن کے کمانڈر یعنی جرنیل کا نام ہیوٹ[1] تھا

۲۴-اپریل ۱۸۵۷ء اگرچہ حالات خاصے پریشان کن تھے اور فوجی افسروں کے لیے انتہائی احتیاط اور دوراندیشی سے کام لینا ضروری تھا لیکن خدا جانے رسالے کے ایک افسر کرنیل سمائتھ[2] کو کیا سوجھی کہ اس نے یکایک ۲۴- اپریل کو پریڈ کا حکم دے دیا تاکہ سپاہیوں کو نئے کارتوس کے استعمال کا طریقہ سکھائے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بڑا تیز مزاج آدمی تھا اور چاہتا تھا کہ سب سے پہلے اپنی کارکردگی دکھائے۔ جنرل ہیوٹ نے یہ سُنا تو بہت افسوس اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ہائے تم نے پریڈ کیوں کرائی؟ میرا ڈویژن بالکل خاموش تھا۔ ایک مہینا یا کچھ اور انتظار کر لیتے تو مصیبت خود بخود ٹل جاتی[3] یقیناً ایک نازک وقت میں فوج کی وفاداری کا امتحان لینے کا یہ طریقہ سراسر عاقبت نااندیشی پر مبنی تھا۔

۲۴- اپریل کو پریڈ کا حکم جاری ہوا تھا، اسی دن شام کے وقت حوالدار میجر نے کپتان کو اطلاع دی کہ سپاہیوں میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور پریڈ کا حکم منسوخ کر دینا مناسب

---

[1] HEWITT [2] SMYTH, [3] کیئی جلد دوم صفحہ ۳۳

ہوگا۔ سمائتھ کو تمام حالات بتا دیے گئے، لیکن اس نے کہا کہ پریڈ ضرور ہوگی۔

چنانچہ ۲۴ کو پریڈ ہوئی۔ ہر پلٹن میں سے پندرہ پندرہ آدمی بلائے گئے اور کل نوّے آدمی پریڈ میں موجود تھے۔ سمائتھ نے کارتوسوں کی تقسیم کا حکم دیا۔ پانچ کے سوا سب نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم بدنام ہو جائیں گے، البتہ پوری فوج کارتوس لے لے تو ہمیں بھی انکار نہ ہوگا۔

اُن کا عذر بالکل بجا تھا۔ اگر وہ کارتوس لے لیتے تو باقی فوجی انھیں الزام دیتے کہ کیوں اپنا مذہب خراب کیا۔ اگر سب میں کارتوس تقسیم کیے جاتے اور وہ لے لیتے تو کسی کو بھی الزام دینے کی گنجائش نہ رہتی، لیکن سمائتھ جوش اور غصے میں بھرا ہوا تھا۔ اُس نے فوجیوں کو واپس کر دیا اور ان کے خلاف عدالت میں مقدمہ چلانے کی تجویز پیش کر دی۔ ان پچاسی آدمیوں میں سے انچاس[۴۹] مسلمان اور چھتیس[۳۶] غیر مسلم تھے۔ یہ بتانا اس لیے ضروری ہوا کہ بے چینی کسی ایک طبقے تک محدود نہ تھی، بلکہ عام تھی۔

برج موہن سنگھ

جن پانچ آدمیوں نے کارتوس قبول کر لیے تھے، ان میں پیش پیش برج موہن سنگھ تھا۔ اس کے باپ کا پیشہ سؤر پالنا تھا۔ یہ پہلے پیادہ فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ وہاں اس پر چوری کا مقدمہ بنا اور قید کی سزا ہوئی۔ رہا ہونے کے بعد اس نے نام بدلا اور رسالے میں بھرتی ہو گیا۔ از سرِ نو ملازمت اختیار کرتے ہی اپنے آپ کو کرنیل سمائتھ سے اس درجہ وابستہ کرایا کہ اکثر اسی کے بنگلے پر رہتا[۱]۔

انگریز اس کے سابقہ حالات سے ناواقف ہو سکتے تھے، دیسی کیوں کر ناواقف ہو سکتے تھے؟ جس شخص کے باپ نے انگریزوں کے لیے سؤر پالنے کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا، اُسے مذہب سے کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ پھر وہ چوری میں قید ہو چکا تھا۔ گویا اس کی اخلاقی حیثیت بھی خاصی مشتبہ تھی۔ سب سے آخر میں یہ کہ وہ خوشامد کے ذریعے سے سمائتھ کی ناک کا بال بن چکا تھا۔

---

[۱] کیئی جلد دوم صفحہ ۲۴ - ۲۵۔

یہ بھی خیال تھا کہ اُس کی اُلٹی سیدھی باتوں نے سمائتھ کو جوش دلایا اور وہ ہر مصلحت کو پس پشت ڈال کر پریڈ کرانے پر آمادہ ہُوا۔

۲۴۔ اپریل کی پریڈ کے بعد اس شخص کے مکان کو سپاہیوں نے آگ لگادی۔

انگریزوں اور دیسیوں کے مشورے

حکم سے انکار کا واقعہ پیش آچکا تو ظاہر ہے کہ دیسی سپاہیوں کا رجحان نافرمانی کی طرف بہت بڑھ گیا ہوگا یقین ہے کہ وہ باہم مشورے بھی کرتے رہتے ہوں گے۔ یہ بھی یقین ہے کہ سب لوگوں نے انکار کرنے والوں کے اس فعل کو سراہا ہوگا۔ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کی خبر دہلی بھی بھیج دی گئی تھی۔ نہ بھی بھیجی جاتی تو آس پاس کی چھاؤنیوں میں اس کا پہنچ جانا عین قرین قیاس تھا۔ چونکہ بے چینی عام تھی اس لیے ہر جگہ کے سپاہیوں نے باہم مشورے شروع کر دیے ہوں گے کہ کیا کرنا چاہیئے۔

میرٹھ کے انگریز افسروں کا خیال تھا کہ کرنیل سمائتھ کی حد درجہ غیر دانشمندانہ بے احتیاطی سے ایک غیر مناسب واقعہ پیش آگیا اور اسے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔

بے شک، ذمہ دار افسر دانشمندی سے کام لیتے تو اشتعال رک جاتا اور اغلب ہے صورت بالکل بدل جاتی، لیکن تعجب اس امر پر ہے کہ بریگیڈیر ولسن یا جنرل ہیوٹ میں سے کسی نے بھی سمائتھ کی حد درجہ احمقانہ حرکت کے بُرے اثرات مٹانے کی کوشش نہ کی، بلکہ اسے مزید تشویش انگیز اقدامات کی اجازت دیتے گئے تاآنکہ حالات نزاکت کی آخری منزل پر پہنچ گئے

فوجی عدالت

چنانچہ میرٹھ سے یہ تجویز منظوری کے لیے صدر میں بھیجی گئی کہ پچاسی سپاہیوں کے حالات کی چھان بین کے لیے دیسی افسروں کی فوجی عدالت قائم کی جائے۔

اس عدالت کے لیے پندرہ افسروں کو نامزد کیا گیا، جن میں سے چھ مسلمان اور نو ہندو تھے۔

۶۔ مئی سے مقدمہ شروع ہُوا۔ الزام یہ تھا کہ ملزموں نے انفراداً اور اجتماعاً کارتوس لینے سے انکار کر کے کمان افسر کی حکم عدولی کی۔

ملزمین میں سے ایک حوالدار مانادین سنگھ بھی تھا۔ اس نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے بیان کیا کہ ہمیں کسی غیر مناسب ارادے کا شبہ ہو گیا تھا۔ اگر کارتوسوں میں کوئی ناجائز شے استعمال نہیں کی گئی تھی تو ہمارے کمانڈر نے ان کے استعمال پر انتہائی اصرار کیوں کیا؟

کیئی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ دلیل ایسی نہ تھی، جسے سراسر غیر معقول اور غیر منطقی قرار دیا جاتا[1]

بنیادی امر

حق یہ ہے کہ فوجی عدالت کو صرف انکار یا حکم عدولی پر نظر نہیں رکھنی چاہیئے تھی، بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے تھا کہ انکار کن حالات میں اور کس بنا پر ہوا؟ فوجی سمجھتے تھے کہ کارتوسوں کے استعمال سے ان کے مذہب پر زد پڑے گی اور وہ برادریوں سے نکال دیے جائیں گے۔ اگر انگریز ان کے مذہب پر حملے کے خواہاں نہ تھے تو انھیں فوراً اندازہ کر لینا چاہیئے تھا کہ حکم سے انکار کا سبب سراسر معقول ہے، پھر انھوں نے معاملے کو ختم کیوں نہ کر دیا؟

سزا

جیسا کہ اندیشہ تھا، فوجی عدالت نے پچاسی آدمیوں کو مُجرم قرار دیا اور سب کے لیے دس دس سال قید با مشقت کی سزا تجویز کی۔ ساتھ ہی سفارش کر دی کہ اس معاملے پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ سپاہیوں کا سابقہ چلن بہت اچھا تھا اور وہ زیرِ بحث معاملے میں کارتوسوں کے متعلق جن افواہوں سے متاثر ہوئے، وہ ایسی نہ تھی کہ انھیں بالکل نظر انداز کر دیا جاتا۔

مجھے یقین ہے کہ یہ فیصلہ انگریز افسروں کی مرضی کے مطابق ہُوا ہو گا یا سمجھ لینا چاہیے، دیسی افسروں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ انگریزوں کی خوشنودی کے لیے سزا تجویز کر دی جائے۔

انگریزوں نے دیسی افسر اس لیے نامزد کیے تھے کہ معاملے کو غیر جانبداری کا رنگ دیا جا سکے لیکن جو افسر دیسی تجویز ہوئے تھے، وہ یقیناً ایسے ہی ہوں گے جو انگریزوں کی رائے اور مرضی پر چلنے میں بہت آزمودہ اور ثابت قدم ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ سزا بہت سخت تھی اور اصل فعل سے اسے کوئی بھی مناسبت نہ تھی، لیکن جنرل ہیوسٹ نے اس سزا کی تصدیق کر دی، حالانکہ اسے بہت رحم دل اور سپاہیوں کا خیر خواہ بتایا جاتا تھا۔

---

[1] کیئی جلد دوم صفحہ ۳۵-۳۶

تجویز سفارش کے متعلق اس نے لکھا کہ سپاہی قیدیوں کا طرزِ عمل کسی تخفیف یا نرمی کے لیے گنجائش پیدا نہیں کرتا۔ آخر میں ان لوگوں کی سزا نصف کر دی گئی جن کی مدت ملازمت پانچ سال یا اس سے کم تھی۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ مجوزہ سزا ۹ مئی کی صبح کو علی الاعلان نافذ کی جائے۔

سنگ دلی کا حیرت انگیز مظاہرہ

۹ مئی کی صبح طلوع ہوئی۔ دیسی رسالے کو پیدل پریڈ کے میدان میں آنے کا حکم مل گیا۔ گورا فوج اور توپ خانے کو اس طرح کھڑا کیا گیا کہ اگر کوئی سپاہی مزاحمت کی خفیف سی بھی حرکت کرے تو توپوں کے منہ کھول دیے جائیں۔ اور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ پچاسی مجرموں کو پہرے میں لایا گیا۔ پریڈ کے میدان میں پہلے اُن کی وردیاں اتاری گئیں۔ پھر لوہاروں کو حکم دیا گیا کہ ان مجرموں کو بیڑیاں پہنائی جائیں چنانچہ اس پر عمل ہُوا۔ کیئی نے لکھا ہے:

> یہ منظر بڑا دردناک تھا۔ ان بدنصیب آدمیوں کے یاس انگیز اشارے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے دل میں ہمدردی کے جذبات متحرک ہو گئے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو فوج کے گل سرسبد سمجھے جاتے تھے، یعنی وہ سپاہی جنھوں نے حد درجہ امتحانی حالات اور اجنبی مقامات میں حکومتِ برطانیہ کی خدمات انجام دی تھیں اور ان کی وفاداری میں کبھی تزلزل نہ آیا تھا۔ قیدی ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور بلند آواز کے ساتھ جرنیل سے التجائیں اور التماسیں کر رہے تھے کہ ہم پر رحم کیجیے اور ایسی ذلت آمیز سزا نہ دیجیے۔ جب انھیں امید کی کوئی بھی کرن نظر نہ آئی تو وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بُرا بھلا کہنے لگے کہ کیوں چپ چاپ کھڑے ہمیں ذلت کا نشانہ بنتے دیکھ رہے ہو؟[1]

ظاہر ہے کہ گرد و پیش توپیں لگی ہوئی تھیں اور ان کی امداد کے لیے ایک بھی حرکت سب کی یقینی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ لہٰذا اگرچہ دلوں میں غیظ و غضب کا طوفان متلاطم تھا تاہم صبر و ضبط کے

---

[1] کیئی جلد دوم ص ۳۸

سوا چارہ نہ تھا

انگریزوں کا اعتراف ذمہ دار انگریزوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ فعل سراسر احمقانہ تھا اور اس درجہ احمقانہ جو تصور میں نہیں آسکتا۔ فارسٹ لکھتا ہے کہ سپاہیوں کی حماقت کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کی جائے:

> جو طرزِ عمل میرٹھ میں اختیار کیا گیا، اس کی حماقت میں مبالغہ مشکل ہے۔ اس سے سپاہیوں میں سکون پیدا نہ ہوا بلکہ وہ مشتعل ہو گئے۔ ان کی وفاداری ختم ہو گئی اور وہ مرعوب بالکل نہ ہو سکے۔[1]

اس وقت جنرل این سن سپہ سالارِ اعظم تھا۔ اس کے پاس فوجی عدالت کی کارروائی کی تفصیل پہنچی تو اگرچہ اس نے فیصلے کی تصدیق کر دی تاہم غیر معمولی طریقِ عمل کے اختیار پر اظہارِ افسوس کیا۔[2]

> آدمیوں کو پریڈ میں بیڑیاں پہنانا جس میں کئی گھنٹے صرف ہوئے اور ان لوگوں کی موجودگی میں یہ سب کچھ کرنا جن میں سے بہتیروں کی طبیعتیں برگشتہ تھیں اور وہ کارتوسوں کی داستان کو درست سمجھتے تھے یقین ہے کہ اس سے بریگیڈ کے دل پر سخت ضرب لگی ہو گی۔ فوج کے مزاج اور ان لوگوں کے جرم کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں ایسی رسم کی بجاآوری کے بعد محض دیسی گارد کی حفاظت میں جیل بھیجنا ناقابلِ تصور حماقت تھی۔[3]

ذمہ داری کا مسئلہ اس اظہارِ رائے سے فائدہ کیا جس پر عمل نہ ہو؟ اگر یہ فعل انتہا درجے کی حماقت پر مبنی تھا تو جو لوگ اسے حماقت سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس کی تلافی کے لیے کیا قدم اٹھایا؟ کیا کسی فعل کو احمقانہ سمجھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی تصدیق کی جائے؟ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انگریزوں کا طرزِ عمل اوپر سے نیچے تک

---

[1] فارسٹ جلد اول صفحہ ۴۴ — [2] ANSON

[3] فارسٹ جلد اول صفحہ ۴۴ — [4] ایضاً صفحہ ۴۴

غیر ہمدردانہ اور جانبدارانہ تھا؛ وہ اپنے کسی ذمہ دار افسر کی حماقت کو بھی بے تکلف نظر انداز
کر دینا ضروری سمجھتے تھے اور فوجیوں کے صحیح انسانی جذبات کے لیے بھی ان کے دل میں کوئی
احترام نہ تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ آگ جلاتی ہے۔ جس شخص نے آگ لگائی، اسے پکڑنا چاہیئے۔
جلنے والے ایندھن کو ذمہ دار قرار دینا کہاں کا انصاف ہے؟

جن اسباب کی تفصیل پہلے پیش کی جا چکی ہے، ان کی کارفرمائی یقیناً ایک خاص نتیجے پر پہنچنے
والی تھی۔ جنگ آزادی ضرور بھڑکتی البتہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب بھڑکتی اور اس کی صورت کیا
ہوتی، لیکن اگر میرٹھ کو اس کا اولین باعث قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہاں سپاہی نہیں بلکہ
انگریز افسر مجرم تھے، جنھوں نے پہلے سپاہیوں کے جائز مذہبی جذبات سے بے پروائی اختیار
کی، پھر انھیں ایک ایسے فعل پر مجبور کیا جو مذہباً حرام تھا۔ سب سے آخر میں انھیں مجرم قرار
دے کر نہایت ہی افسوس ناک، رنج دہ اور اشتعال انگیز انداز میں سزائیں دیں۔ اگر حق و انصاف
کی طرف سے آنکھیں بالاہتمام بند کر کے انگریز افسروں کی پاسداری کو نصب العین نہ بنا لیا جاتا تو
۱۸۵۷ء پاک و ہند کی تاریخ میں غالباً آگ اور خون کے حروف سے ہرگز نہ لکھا جاتا۔

سپاہیوں کا فیصلہ

پریڈ میں بیڑیاں پہنانے کا معاملہ ۹ مئی کو پیش آیا تھا اور ہفتے کا
دن تھا۔ انگریز غالباً بالکل مطمئن تھے کہ انھوں نے اپنی، فرمانفرمائی
کے متزلزل حصار کو خوب مستحکم کر لیا۔ وہ اس بے پناہ طوفان سے بالکل بے خبر یا بے پروا تھے،
جو سیکڑوں سپاہیوں کے سینوں میں بپا ہو چکا تھا۔ پریڈ سے واپس ہوتے ہی انھیں مستقبل
کے متعلق فیصلہ کرنا پڑا۔ ان کے پچاسی ساتھی صرف اس لیے ذلت و قید کے مصائب میں
مبتلا ہوئے کہ انھوں نے سب کے مذہبی جذبات کی ترجمانی میں سبقت کی تھی۔ ان کا ساتھ
چھوڑ دینا کھلی ہوئی بے غیرتی تھی۔ نیز انگریزوں نے ۹ مئی کو پریڈ کے میدان میں جس سنگ دلی اور
فرعونیت کا مظاہرہ کیا تھا، اس کے پیش نظر کسی کو اچھے سلوک کا نہیں بلکہ صرف منصفانہ سلوک کی بھی
کیا امید ہو سکتی تھی؟

چنانچہ قیدیوں کو چھڑا لینے کا فیصلہ کر لیا گیا اور اس کے لیے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی شام کا وقت مقرر ہو گیا، جب تمام انگریز جن میں فوجی بھی شامل تھے، گرجے میں ہوتے اور ان کی طرف سے مسلح مزاحمت کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

سید ظہیر دہلوی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ خود سپاہیوں نے بہادر شاہ کے روبرو جو واقعات پیش کیے، ان میں بتایا کہ قیدیوں کو چھڑانے اور ہنگامہ بپا کرنے کی انگیخت مستورات کی طرف سے ہوئی تھی، انھوں نے مردوں کو طعنے دیے کہ سپہ گری کا دعویٰ کرتے ہو مگر نہایت بزدل بے غیرت اور بے شرم ہو، تمھارے سامنے ساتھیوں کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائی گئیں اور تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ لو یہ چوڑیاں تم پہن لو اور ہتھیار ہم کو دو، ہم قیدیوں کو چھڑا لاتی ہیں[1]۔

ڈاکٹر سین لکھتے ہیں کہ شام کے پانچ بجے یکایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ باورچی کے لڑکے نے سپاہیوں کی بارکوں میں پہنچ کر بتایا کہ توپ خانہ اور گورا فوج سپاہیوں سے ہتھیار لینے کے لیے آ رہے ہیں، بس اس پر سپاہی پریشان ہو گئے، انھوں نے نہ تو وردیاں پہنی ہوئی تھیں اور نہ ان کے پاس ہتھیار تھے۔ رسالے کے سواروں نے قیدی چھڑا لیے[2]۔

۱۰ مئی کی شام

۱۰ مئی کی شام کو گرجے کا گھنٹہ بجنا شروع ہوا تو رسالے نے جیل خانے پر دھاوا بول دیا۔ قیدیوں کے چھڑانے کے باب میں روایتیں مختلف ہیں۔ ایک میں بتایا گیا ہے کہ رسالہ موقع پر پہنچا تو دیسی گارد کے سپاہی قیدیوں کو رہا کرا چکے تھے۔ اور انھوں نے دوسرے قیدیوں کو بھی آزاد کر دیا۔ کمشنر کا بیان یہ ہے کہ رسالے نے موقع پر پہنچ کر اس بارک کی کھڑکیاں اکھاڑیں جس میں ان کے ساتھی بند تھے، لیکن دوسرے قیدیوں کو نہ چھڑایا۔ البتہ پیادہ فوج اٹھی تو اس نے پرانے جیل خانے کے سات سو بیس قیدی رہا کر دیے۔

ہمیں اختلاف پر بحث میں وقت صرف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا جان لینا کافی

---

[1] داستان غدر صفحہ ۴۸-۴۹ [2] سین کی کتاب صفحہ ۵۹

ہے کہ قیدیوں کو رہا کرا لیا گیا اور جنگ آزادی شروع ہو گئی۔ دوسرے دیسی دستے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

کرنیل میکنزی نے لکھا ہے کہ فوجی گورے اس زمانے میں اپنے ہتھیار گرجے میں نہیں لے جاتے تھے اور دیسی فوجیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ سب لوگ گرجے پہنچ جائیں تو میگزین پر قبضہ کر کے سامان جنگ لے لیا جائے، پھر انگریزوں کو گرجے ہی میں ختم کیا جائے۔ اتفاق یہ ہوا کہ گرجے کا وقت اس روز نصف گھنٹہ موخر کر دیا گیا تھا اور دیسی سپاہیوں کو اس تبدیلی کا علم نہ تھا۔ یعنی گورا فوج ابھی گرجے نہیں گئی تھی اور بروقت حفاظت کے لیے تیار ہو گئی۔

میرے نزدیک یہ بیان صحیح نہیں۔ رسالے کے لوگوں نے قطعاً میگزین کا رخ نہ کیا بلکہ وہ سیدھے جیل خانے پہنچے اور قیدیوں کو چھڑا لائے۔ ان کا فیصلہ غالباً یہ تھا کہ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میرٹھ سے دہلی پہنچ جائیں اور وہاں دوسرے ساتھیوں سے بات چیت کر کے کوئی منظم سکیم بنائیں۔ بلاشبہ اس ہنگامے میں کچھ انگریز مارے گئے۔ لیکن زیادہ تر وہی تھے جنھوں نے فوجوں کو روکنے کی کوشش کی۔ باقی جو لوگ مارے گئے، ان کے ذمہ دار فوجی نہ تھے بلکہ عام لوگ تھے، جو ایسے مواقع پرافراتفری سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سین لکھتے ہیں کہ دوکانداروں نے دوکانیں بند کر دیں، غیر ذمہ دار لوگ اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ چار گھنٹے بعد گوجر بھی ارد گرد کے دیہات سے شہر پہنچ گئے۔[1]

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ کرنیل سمائتھ نے، جو سارے ہنگامے کا ذمہ دار تھا، عجیب طرز عمل اختیار کیا۔ جب سپاہ کے اٹھنے کی خبریں ملیں تو متعدد افسر اپنے جیشوں کو روکنے کے لیے لائنوں کی طرف دوڑے لیکن سمائتھ لائنوں کے قریب بھی نہ گیا۔[2] وہ کمشنر کے ہاں گیا، جنرل کے ہاں گیا، برگیڈیر کے ہاں بھی گیا۔ رات ڈویژن کے صدر مقام میں بسر کی، لیکن پتہ نہ لیا کہ جو آگ اُس نے خواہ مخواہ بھڑکائی تھی، اسے فرو کرنے کی کیا کیا تدبیریں ہو سکتی ہیں۔ گویا وہ غصیلا، شر انگیز،

---

[1] سین کی کتاب ص ۵۹ [2] کیئی جلد دوم ص ۴۷

خود پسند اور متکبر ہونے کے علاوہ بزدل بھی تھا۔

انگریزوں کا اقدام

اب انگریز افسر خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے۔ انھوں نے گورا فوج جمع کی۔ ایک دستے کو خزانے کی حفاظت کے لیے کچہری میں مقرر کر دیا، باقی فوج کو لے کر دیسی پیادہ فوج کی لائنوں کا رُخ کیا، اس لیے کہ خیال تھا وہاں سب لوگ جمع ہوں گے۔ وہ لوگ اِدھر اُدھر ہر جگہ پھر نکلے لیکن کوئی بھی نظر نہ آیا۔ البتہ رسالے کی لائن کے پاس چند آدمی تھے۔ ان پر گولیاں چلائی گئیں تو وہ مکانوں کی اوٹ میں ہو گئے یا بھاگ کر جنگل میں چلے گئے۔ رات ہو چکی تھی اور کسی نے بھی ان کے تعاقب کا خیال نہ کیا، زیادہ تر اس لیے کہ انگریزی فوج تھوڑی تھی اور میرٹھ کو چھوڑ کر باہر نکلتے تو خدا جانے کتنی بڑی سپاہ سے مقابلہ پیش آ جاتا۔ نیز پیچھے عام لوگ ہنگامہ بپا کر دیتے تو سب کچھ برباد ہو جاتا۔

ہنگامے میں مختلف لوگوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر انگریزوں کی جانیں بچائیں۔ کمشنر کے جمعدار گلاب خاں نے پورے خاندان کو بچایا۔ بختاور چوکیدار نے مسز میکڈانلڈ کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ وہ نہ بچ سکی لیکن نصیبن آیا کی مدد سے بچوں کو بچا لیا گیا۔ مسز کورٹنی کو دیسی سواروں نے بچایا۔ اصغر علی کے بنگلے میں جو عیسائی کرایہ دار تھے، ان کی پوری حفاظت کی اور فسادیوں کی دھمکیوں کی کوئی پروا نہ کی[1]

عجیب بات ہے کہ ۱۰ اور ۱۱ مئی کی رات کا نقشہ بڑے ہی ہولناک انداز میں کھینچا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ رات ہوتے ہی مکانوں کو آگ لگنی شروع ہوئی۔ آگ پھیلتی گئی۔ شہتیر جل جل کر گرتے۔ گھوڑے بھاگتے دوڑتے، شور مچا ہوا تھا۔ کیئی کہتا ہے یہ ایسی خوفناک رات تھی کہ تاریخ میں اس کا نقشہ شاذ ہی ملے گا[2]

کیا یہ آگ ان لوگوں نے لگائی تھی، جو انگریزی فرمانبرداری کا جُوا اُتار چکے تھے؟ جب خود ہی بتایا جاتا ہے کہ رات ہو جانے پر کہیں کوئی سپاہی نظر نہ آتا تھا اور یقیناً وہ میرٹھ سے جا چکے تھے، تو

---

[1] سین کی کتاب ص ۶۴ ٭ [2] کیئی جلد دوم ص ۵۱ ٭

آگ کون لگا سکتا تھا؟ یقیناً یہ متفرق آدمیوں کا کام ہو گا، جو بدنظمی کی حالت دیکھتے ہی بروئے کار آجاتے ہیں اور کوئی بھی معاشرہ ان سے پاک نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس رات کے متعلق مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہو یا یہ سراسر افسانہ ہو، جس طرح کال کوٹھری کا واقعہ سراسر افسانہ تھا۔ بلاشبہ سپاہیوں نے سرکشی کی اور جن حالات سے وہ گزر چکے تھے ان میں سرکشی کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ جن انگریز افسروں نے انھیں روکنا چاہا، انھیں قتل کر دیا گیا۔ ممکن ہے جوش کی حالت میں کچھ اور زیادتی بھی ہوئی ہو، لیکن بعد ازاں وہ میرٹھ نکل گئے۔ اوّل اس لیے کہ انھیں گورا فوج کے حملے کا اندیشہ تھا، جن کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی اور وہ فوج خوب مسلح تھی۔ خود سپاہیوں کو اپنی صحیح تعداد کا اندازہ نہ تھا، اس لیے کہ اس وقت تک بھی سب لوگ ایک رائے پر پختہ نہیں ہوئے تھے۔ دوم اس لیے کہ وہ جلد سے جلد محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہتے تھے تاکہ اطمینان سے آیندہ کا پروگرام سوچیں اور قریب ترین محفوظ مقام دہلی تھا، جو تیس پینتیس میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ روہیلکھنڈ چلے جائیں لیکن قرب کے باعث دہلی کو چنا گیا۔ بعض ہاپڑ چلے گئے۔ بعض نے باغپت کا رُخ کیا۔ بعض چند روز بعد گوڑگانوہ کے قریب ملے۔

سفر

ایک سوال یہ بھی ہے کہ انھوں نے رات کے وقت اتنا لمبا سفر کیونکر طے کیا۔ مئی کا مہینا تھا اور اعتدال صیفی پر پونے دو مہینے گزر چکے تھے۔ سورج خاصی دیر سے غروب ہوا ہو گا۔ اندھیرا ہونے کے وقت تک وہ لوگ میرٹھ میں نہ تھے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ آٹھ اور نو بجے کے درمیان میرٹھ سے چلے، نیز یہ فرض کر لیں کہ وہ مسلسل چار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے رہے تو انھیں پورا سفر طے کرنے کے لیے آٹھ نو گھنٹے درکار تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ مسلسل سفر جاری نہیں رکھ سکتے تھے جا بجا تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرے بھی ہوں گے۔ غالباً یہ خیال بھی رکھا ہو گا کہ تعاقب میں کوئی آتا ہے یا نہیں آتا۔ اور وہ صبح ہوتے ہی دہلی کے سامنے موجود تھے۔ یقیناً انھوں نے بڑی ہمت، محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہو گا۔

اب آگے بڑھنے سے پیشتر ہمیں دہلی کے حالات کا سرسری جائزہ لے لینا چاہیے۔

ضمیمہ

جن پچاسی سپاہیوں کو بیڑیاں پہنائی گئی تھیں، ان کے نام بھی محفوظ رہ گئے، جو بہ طور یادگار یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) ماتا دین (۲) میر قدرت علی (۳) شیخ حسن الدین (۴) شیخ نور محمد (۵) تیمار نائک (۶) سیتل سنگھ (۷) جہانگیر خاں (۸) میر محسن علی (۹) علی نور خاں (۱۰) میر حسین بخش (۱۱) متھرا سنگھ (۱۲) نارائن سنگھ (۱۳) لال سنگھ (۱۴) بشن سنگھ (۱۵) بلدیو سنگھ (۱۶) شیخ نندو (۱۷) نواب خاں (۱۸) شیخ رمضان علی (۱۹) درگا سنگھ (۲۰) نبی بخش خاں (۲۱) علی محمد خاں (۲۲) مکھن سنگھ (۲۳) چورامن سنگھ (۲۴) نجو خاں (۲۵) عبداللہ خاں (۲۶) عیسیٰ خاں (۲۷) زبردست خاں (۲۸) مرتضیٰ خاں (۲۹) برجور سنگھ (۳۰) عظیم اللہ خاں (۳۱) کالا خاں (۳۲) شیخ سعد اللہ (۳۳) سالار جس خاں (۳۴) شیخ راحت علی (۳۵) دوارکا سنگھ (۳۶) ٹکا سنگھ (۳۷) رگھبیر سنگھ (۳۸) بلدیو سنگھ (۳۹) درشن سنگھ (۴۰) امداد حسین (۴۱) پیر خاں (۴۲) یوسف علی خاں (۴۳) موتی سنگھ (۴۴) شیخ فضل امام (۴۵) ہیرا سنگھ (۴۶) سیوا سنگھ (۴۷) مراد شیر خاں (۴۸) شیخ امام علی (۴۹) کانشی سنگھ (۵۰) شرف علی خاں (۵۱) قادر داد خاں (۵۲) شیخ رستم (۵۳) بھگوان سنگھ (۵۴) میر امداد علی (۵۵) شیو بخش سنگھ (۵۶) لچھمن سنگھ (۵۷) شیخ امام بخش (۵۸) عثمان خاں (۵۹) مقصود علی خاں (۶۰) شیخ غازی بخش (۶۱) شیخ امید علی (۶۲) عبدالوہاب خاں (۶۳) رام سہائے سنگھ (۶۴) پناہ علی خاں (۶۵) بچھمن دوبے (۶۶) رام سورن سنگھ (۶۷) شیخ ایزد علی (۶۸) سیوا سنگھ (۶۹) سیتل سنگھ

(۷۰) موہن سنگھ (۷۱) ولایت علی خاں (۷۲) شیخ محمد عوض (۷۳) اندر سنگھ (۷۴) فتح خاں (۷۵) لیکھ سنگھ (۷۶) شیخ قاسم علی (۷۷) رام چرن سنگھ (۷۸) دیوا سنگھ (۷۹) نصراللہ بیگ (۸۰) محراب خاں (۸۱) عظیم اللہ (۸۲) اندر سنگھ (۸۳) پرشاد سنگھ (۸۴) دلاور خاں (۸۵) غلام نبی خاں ٭

دہلی

باب ۱

تخت گاہ دہلی ـــ شامِ زوال

آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم
برُد در شامِ زوال آہ! سیاہ کاریِ ما

شاہ عالم ثانی اور انگریز

انگریز مرہٹوں کی فوج کو شکست دے کر ۱۵ ستمبر ۱۸۰۳ء کو کامیاب و کامران دہلی میں داخل ہوئے تھے۔ کچھ کم پندرہ سال گزر چکے تھے، جب غلام قادر خاں نے شاہ عالم ثانی کو بینائی سے محروم کیا تھا۔ اس غریب نے یہ پوری مدت سندھیا کے وظیفہ خوار کی حیثیت میں گزاری تھی۔ امور سلطنت سے اسے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ وہ ایک نوع کا قیدی تھا۔ آنکھیں نکالے جانے پر اس نے کس درد سے کہا تھا:

چشمِ من کندہ شد از جورِ فلک بہتر شد
کہ نہ بینم کہ کند غیر جہانداریِ ما

بادشاہ سے انگریز جرنیل لارڈ لیک کی پہلی ملاقات کا مرقع ان لفظوں میں پیش کیا گیا ہے:

جو شاندار محل شاہ جہاں نے بنوایا تھا، وہاں سپہ سالار (لارڈ لیک) کو حضورِ شاہی میں پیش ہونے کا موقع ملا۔ اس نے دیکھا کہ بدنصیب اور واجب التعظیم بادشاہ کو بڑھاپے، عزت و اقتدار کے زوال، شدید افلاس اور زوالِ بینائی کی مصیبتوں نے سخت بدحال کر رکھا ہے۔ وہ ایک بوسیدہ سے شامیانے کے نیچے بیٹھا تھا۔ یہی اس کی بادشاہی کا آخری نشان رہ گیا تھا۔ بہ ظاہر ہر شے اس کی

رنج افزا حالت کا نشان بنی ہوئی تھی۔

لارڈ ویلزلی کا فیصلہ

لارڈ ویلزلی اس زمانے میں گورنر جنرل تھا اور اس کی خواہش یہ تھی کہ ہندوستان کے چپّے چپّے پر انگریزی اقتدار کی مہر ثبت کر دے اور سابقہ فرمانروائی کے تمام نقوش کو جلد سے جلد محو کر ڈالے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر مغل شاہنشاہ کا آبائی اقتدار بحال رکھا گیا تو ممکن ہے شاہ عالم کا کوئی جانشین بادشاہی کے قصر کی بکھری ہوئی اینٹیں چن چن کر از سرِ نو ایک محل تعمیر کرے اور انگریزوں کے لیے پریشانیاں پیدا ہوں، لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ بے شمار لوگ اس خاندان سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اور اگر ان کے جذبات کو گزند پہنچا تو نتیجہ اُلٹا نکلے گا۔ لہٰذا مجبور ہو کر اس نے درمیانی راستہ اختیار کیا۔ یعنی بہ ظاہر بادشاہی کا ٹھاٹ قائم رکھا اور حقیقتاً پورا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ محل اور شہر دہلی کے اندر بادشاہ کو عمومی اختیار دے دیا گیا۔ کچھ جاگیریں بھی حوالے کر دی گئیں [1] اور وظیفہ بھی مقرر کر دیا گیا۔

ابتدا میں یہ رائے قرار پائی تھی کہ بادشاہ کو دہلی کے لال قلعے سے اٹھا کر منگھیر (بہار) پہنچا دیا جاتے، جو الگ تھلگ سی جگہ تھی اور بادشاہ سے براہِ راست وابستگی رکھنے والے ہزاروں لوگ وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ نیز وہ مقام کلکتہ سے نزدیک تھا۔ ویلزلی کا خیال ہوگا کہ اس طرح لوگ بادشاہ کو جلد بھول جائیں گے، اس لیے کہ جو شے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اس کی یاد زیادہ دیر تک دل میں تازہ نہیں رہتی۔ لیکن جب دیکھا کہ بادشاہ اور اس کے متعلقین اس نقل مکان پر حد درجہ کراہت کا اظہار کر رہے ہیں، تو ویلزلی

---

[1] چارلس تھیوفلس مٹکاف نے لکھا ہے کہ ۱۸۰۳ء میں ان جاگیروں کی آمدنی اکتالیس ہزار اٹھاون پونڈ تھی اور ۱۸۰۴ء میں ایک لاکھ پینتالیس ہزار سات سو چون پونڈ پر پہنچ گئی۔ (دو روزنامچوں کا دیباچہ ص۱۳)

[2] کیٹی جلد دوم ص۵

نے اصرار مناسب نہ سمجھا۔ اسے اندیشہ بھی ہو گا کہ ممکن ہے اس طرح پھر مرہٹوں کو عوام کی حمایت سے برسرکار آنے کا موقع مل جائے اور انگریز بازی ہار جائیں۔

اکبر شاہ ثانی

شاہ عالم ثانی نے ۱۹۔ نومبر ۱۸۰۶ء (۷۔ رمضان ۱۲۲۱ھ) کو وفات پائی اور اس کا فرزند اکبر شاہ ثانی اڑتالیس سال کی عمر میں اس آبائی تخت پر بیٹھا، جو نہ حقیقت میں تخت تھا اور نہ اس میں تخت کی کوئی خصوصیت باقی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گزرے ہوئے شہنشاہوں کے جلوس کی نہایت ناقص اور خاصی مضحکہ خیز یا عبرت انگیز نقل تھی۔ اس زمانے میں آرچی بالڈ سیٹن[1] دربار میں انگریزی حکومت کا نمائندہ تھا۔ وہ خود بھی شریف اور حساس آدمی تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ بادشاہ کی عزت و احترام کو کوئی نقصان نہ پہنچے، لیکن اس کے ساتھی چارلس مٹکاف کو اس مسلک سے شدید اختلاف تھا۔ مٹکاف نے لکھ بھی دیا کہ بادشاہ کے اقتدار کو خواہ مخواہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ گویا انگریزوں کے دل میں نام کے غریب بادشاہوں کا وجود برابر کھٹک رہا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ انھیں جلد سے جلد الگ کر دیں۔

بادشاہ کی سادگی

ادھر بادشاہ حد درجہ سادہ لوح اور زمانے کے حالات سے بالکل بے خبر تھا۔ حاشیہ نشین اسے یقین ہی نہ ہونے دیتے تھے کہ پہلا دور باقی نہیں رہا۔ اب کہ بادشاہی کا وجود ہی شدید خطرے میں تھا، اس کے متعلقات کو وسعت دینے کا نتیجہ کیا نکل سکتا تھا؟ اکبر شاہ نے ایک موقع پر اپنے فرزند کو، جو اودھ میں تھا، لکھا کہ نواب وزیر کے ذریعے سے اس رقم کو بڑھانے کی کوشش کرو، جو انگریزوں نے مقرر کر رکھی ہے۔ لطف یہ کہ اسے "وظیفہ" نہیں بلکہ "خراج ملک" قرار دیا۔ یہ خط اتفاق سے لکھنؤ کے انگریز ریزیڈنٹ نے دیکھ لیا۔ اس نے شہزادے کو سمجھایا۔ دہلی کے انگریزی نمایندے کو خبر ملی تو اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ اس قسم کی حرکتوں سے فائدے کے بجائے نقصان ہو گا۔

---

[1] ARCHIBALD SETON

اس کے بعد ایک ہندو اور ایک مسلمان نے ساز باز کر کے تیسرے شخص کو ہم رائے بنایا اور بادشاہ کے چھوٹے بیٹے میرزا جہانگیر کی ولی عہدی منوانے کی غرض سے کلکتہ جانے کی تجویز پیش کر دی۔ اس تدبیر سے سفر خرچ بھی لیا اور اپنے کنبوں کی معاش کا انتظام بھی کرا لیا۔ کلکتہ سے فرضی خط لکھ لکھ کر بھیجتے رہے۔ پھر لندن جانے کا چکمہ دیا اور مزید خرچ منگوایا۔ یہ راز بھی کھلا اور مٹکاف نے جو اس زمانے میں ریزیڈنٹ تھا، بادشاہ سے کہہ سن کر یہ قصہ ختم کیا۔[1]

آخر میں بادشاہ نے رام موہن رائے کو اپنا وکیل مقرر کر کے انگلستان بھیجا اور اسے راجا کا خطاب دیا۔ اس میں کسی قدر کامیابی ہوئی، لیکن راجا رام موہن رائے کے اچانک انتقال نے معاملہ آخری منزل پر نہ پہنچنے دیا۔

اقتدار میں تنزل

انگریزوں نے وظیفے میں کچھ اضافہ کر دیا تھا جس سے اکبر شاہ نے بعض عمارتیں بنوائیں، فصیل کے ٹوٹے ہوئے حصے درست کرا دیے۔ غازی الدین خاں فیروز جنگ کی حویلی کو فصیل کے اندر لے لیا، لیکن شاہی اقتدار تدریجاً گھٹتا گیا۔ مثلاً:-

۱۔ پہلے تمام انگریز عیدین اور نوروز و جلوس کے جشنوں میں نذریں پیش کرتے تھے۔ لارڈ منٹو نے حکم دے دیا کہ ریزیڈنٹ کے سوا کسی کو نذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ مارکوئس ہیسٹنگز نے چاہا کہ بادشاہ سے ملاقات برابر کی حیثیت میں کرے۔ یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو اس نے اودھ میں غازی الدین حیدر کو بادشاہ بن جانے کی ترغیب دی۔ مدعا یہ تھا کہ اول والی اودھ "نواب وزیر" کی حیثیت میں رسمی طور پر بادشاہ دہلی سے فروتر سمجھا جاتا تھا، بادشاہ بن جائے گا تو اسے مساوی درجہ حاصل ہو گا۔ دوم بادشاہ دہلی پر واضح ہو جائے گا کہ انگریز جسے چاہیں بادشاہ بنا سکتے ہیں۔

---

[1] ذکاء اللہ کی تاریخ، اسلامی عہد جلد نہم ص ۳۴۵ نیز لارڈ مٹکاف جلد اول ص ~~۲۵۱~~-۲۵

بہادر شاہ ظفر اکبر شاہ ثانی نے ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو تقریباً اسی سال کی عمر میں وفات پائی اور بہادر شاہ ظفر مسند نشین ہوئے ان کی عمر چونسٹھ پینسٹھ کے درمیان تھی۔

بہادر شاہ نے بھی باپ کی تقلید میں ایک شخص کو وکیل بنا کر لندن بھیجنا چاہا۔ اس کا نام جارج ٹامپسن[1] تھا۔ مشہور تھا کہ وہ بڑا پُرجوش اور پُرتاثیر مقرر ہے اور اُسے دیسی اقوام کے حقوق کی حفاظت سے خاص دلچسپی تھی۔ وظیفہ بڑھانے کے علاوہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا تھا یعنی لارڈ ایلن برا نے ریزیڈنٹ کو بھی نذر پیش کرنے سے روک دیا تھا[2] گویا ٹامپسن کو ولایت بھیجنے میں روپے کے علاوہ ایک مسلمہ حق کی بحالی کا مقصد بھی پیش نظر تھا۔ انگریز اس بات کے لیے تیار تھے کہ وظیفہ بڑھا دیں، لیکن شرط یہ تھی کہ بادشاہ آیندہ کے لیے انگریزی حکومت سے کوئی مطالبہ نہ کرے، بادشاہ نے یہ قبول نہ کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ۱۱ فروری ۱۸۴۶ء کو آخری جواب مل گیا کہ جب تک مزید دعاوی سے دست برداری کی دستاویز نہ لکھ دی جائے گی، کوئی اضافہ نہ ہو سکے گا۔

ولی عہدی کے جھگڑے خاندان کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ اس حالت میں بھی ولی عہدی کے جھگڑے بڑے زور شور سے جاری تھے، حالانکہ بادشاہی کا وجود خطرے میں پڑا ہوا تھا اور اسے بحال رکھنے کی شکل یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ احتیاط، دور اندیشی اور دانشمندی سے کام لیا جاتا۔ یہ جھگڑے اکبر شاہ ہی کے زمانے سے جاری

---

[1] GEORGE THOMPSON

[2] یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ ۱۸۱۱ء میں شاہی وظیفہ ایک لاکھ روپے ماہانہ یعنی بارہ لاکھ سالانہ مقرر ہوا تھا۔ ۱۸۳۳ء میں اسے پندرہ لاکھ دینے کی تجویز تھی، بہ شرطیکہ بادشاہ آیندہ کے لیے ہر مطالبے سے دست بردار ہو جاتا۔ (گیرٹ، دیباچہ ص۱) نذروں کی بندش سے بادشاہ کو نقصان احترام کے علاوہ نقصان زر بھی تھا۔ انگریزی حکومت نے طے کر دیا تھا کہ آٹھ سو تراسی روپے ماہانہ کی رقم اس نقصان کی تلافی کے لیے الگ دی جائے۔ بادشاہ نے شروع میں یہ رقم لینے سے انکار کر دیا، پھر وصول کرنے لگے۔ انگریزوں نے بقایا ادا نہ کیا۔ (گیرٹ دیباچہ ص۱۱)

تھے، جس نے بہادر شاہ کا حق ولی عہدی ختم کرنے کے لیے میرزا جہانگیر کو، پھر دوسرے بیٹے کو ولی عہد تسلیم کرانا چاہا۔ میرزا جہانگیر کو شہسواری میں ایسا کمال حاصل تھا کہ وہ ملک بھر میں یگانہ مانا جاتا تھا، لیکن اس کے سوا کوئی جوہر نہ تھا۔ اس نے ایک مرتبہ جوش اور سرمستی کے عالم میں سٹین پر گولی چلادی، حسن اتفاق سے گولی خطا گئی اور شہزادے کو نظر بند کر کے الہ آباد بھیج دیا گیا۔ وہیں وفات پائی اور اس کی میت دہلی لا کر احاطہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ میں دفن کی گئی۔

دارا بخت، میرزا فخر اور جواں بخت

بہادر شاہ نے تخت نشینی کے بعد زینت محل سے شادی کی تھی اور خدا نے اسے بچہ بھی دیا، جس کا نام "جواں بخت" رکھا گیا۔ غالب و ذوق کے سہروں کی بدولت اس کے نام کو مستقل شہرت مل گئی۔ بہادر شاہ کی مسند نشینی کے ساتھ ہی اس کے بڑے بیٹے دارا بخت میراں شاہ کی ولی عہدی کا اعلان ہو چکا تھا۔ جواں بخت کی ولادت کے بعد زینت محل کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ اپنے بیٹے کو ولی عہد بنوائے۔ بہادر شاہ زینت محل کی فرمایش کو ٹال نہیں سکتا تھا، لیکن مجبور تھا، اس لیے کہ منظور شدہ ولی عہدی کو تڑوانے کی کوئی شکل نہ تھی۔ ۱۸۴۹ء میں میرزا دارا بخت کا انتقال ہو گیا۔ اب جواں بخت کے لیے پورے زور اور اہتمام سے کوششیں شروع ہو گئیں، لیکن انگریز متعدد بڑے بیٹوں کو نظر انداز کر کے سب سے چھوٹے بیٹے کو ولی عہد ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ نیز دارا بخت سے چھوٹے شہزادے میرزا فخر الدین فتح الملک کے تعلقات انگریزوں سے بہت خوشگوار تھے۔

پھر انگریزوں کے سامنے ایک خاص پروگرام تھا اور وہ یہ کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد لال قلعہ خالی کرا لیا جائے اور خاندان کا سربراہ قطب صاحب میں رہے۔ نیز شاہی خاندان میں صرف وہ لوگ محسوب ہوں، جو بادشاہ کے بیٹے پوتے یا بہت قریبی ہوں، باقی شہزادوں کو خارج کر دیا جائے۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ رئیس کو "بادشاہ" نہیں صرف "شہزادہ" کہا جائے گا۔ میرزا فخرو نے یہ تمام شرطیں ۱۸۵۲ء میں منظور کر لیں اور اس کی ولی عہدی کا اعلان ہو گیا۔ بہادر شاہ

کو ناکامی ہوئی۔ اُس نے زینت محل کے زیر اثر اس سلسلے میں جو جو حرکتیں کیں، وہ بڑی ہی نازیبا اور افسوسناک تھیں۔ میرزا فخرو نے ۱۸۵۶ء میں انتقال کیا تو پھر یہ قضیہ کھڑا ہو گیا۔ حکومت انگلشیہ نے بہادر شاہ کی تحریر کا جواب ہی نہ دیا۔

شہزادوں کی تعداد

اس موقع پر ریزیڈنٹ نے شاہی خاندان کے تمام افراد کی فہرست تیار کی۔ یہ فہرست دو ہزار ایک سو چار افراد پر مشتمل تھی اور ان میں سے صرف شاہ عالم ثانی کے اخلاف آٹھ سو پندرہ سے کم نہ تھے[1]۔ ظاہر ہے انگریز ان سب کے مستقل اور لامتناہی گزارے کا بوجھ اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر اس تعداد میں برابر اضافے کا امکان تھا، اس لیے یا تو بوجھ میں اضافہ ہوتا یا شکایتوں کے نئے نئے طومار تیار ہوتے رہتے اور حکومت کے لیے ایک نئی مشغولیت یا نئی سراسیمگی پیدا ہو جاتی۔

تعجب ہے کہ خود اکبر شاہ ثانی یا بہادر شاہ ثانی نے کیوں یہ نہ سوچا کہ خاندان کے مختلف افراد کو کسی اچھے کام کاج پر لگا دیں تاکہ وہ اپنی روزی خود پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ شہزادگی کے متعلق ایک جھوٹا اور بے بنیاد تصور دماغوں میں جاگزیں تھا یعنی یہ کہ انھیں کوئی کام نہ کرنا چاہیے یا یہ ماننا چاہیے کہ ان بادشاہوں کی بے خیالی، بے حسی اور بدلے ہوئے حالات سے بے خبری آخری منزل پر پہنچ چکی تھیں اور وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ انجام کی دردناکی ہی نہیں بلکہ ہونا کی کا بھی کچھ اندازہ کر سکیں۔

انگریزوں سے ملال

بہادر شاہ، شاہی خاندان اور عام لوگوں یا کم از کم مسلمانوں کو انگریزوں سے یہ ملال تو ہوگا ہی کہ وہ مغلوں کی سلطنت کے مالک بن گئے اور ایسی بادشاہی سے شاہ جہان و عالمگیر کی اولاد محروم ہو گئی، جس کی نظیریں دُنیا میں بہت

---

[1] گیرٹ دیباچہ صفحہ ۱۱۱

ہی کم ملتے ہیں۔ خاص بہادر شاہ کو حکیم احسن اللہ خاں کے بیان کے مطابق، دو وجہ سے انگریزوں کے خلاف بے حد رنج پیدا ہوا تھا:

(۱) ایلین برا نے نذریں بند کر دیں۔

(۲) میرزا جواں بخت کو ولی عہد نہ بنایا[1]

یہ دونوں داغ اس کے دل سے آخری وقت تک نہ مٹے۔

غرض اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ بہادر شاہ اصولاً بھی انگریزوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا تھا اور مذکورہ بالا دو شکایتوں کی وجہ سے اس کے ملال و ناراضی میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خود اپنے بڑھاپے، طبعی کاہلی و آرام طلبی یا فقدان سامان کے باعث کوئی موثر قدم اٹھا سکتا یا نہ اٹھا سکتا لیکن جو ہنگامہ اس کی خواہش یا کوشش کے بغیر بپا ہو گیا تھا، اس سے فائدہ اٹھانے میں اسے قطعاً تامل نہیں ہو سکتا تھا۔ یقیناً ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ بہادر شاہ نے باہر سے سپاہیوں کی آمد کو اپنے لیے بربادی کا ذریعہ قرار دیا۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ دوران ہنگامہ میں بے اختیار ہی رہا لیکن یہ نہیں مانا جا سکتا کہ اس کا دل انگریزی اقتدار کے شیرازے کی برہمی کا خواہاں نہ تھا یا وہ اس برہمی پر خوش نہیں ہو سکتا تھا۔

ایران سے تعلقات

یہی زمانہ ہے جس میں میرزا سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم کا پوتا میرزا حیدر شکوہ اور اس کا بھائی لکھنؤ سے دہلی آئے۔ وہ بہادر شاہ کے اقربا میں سے تھے اور لکھنؤ میں رہنے کے باعث شیعہ مذہب اختیار کر چکے تھے۔ اتفاق یہ کہ بہادر شاہ سخت بیمار ہو گیا۔ ان شہزادوں نے اپنے طریقے کے مطابق شفا کے لیے علم چڑھانے کی منت مانی اور بادشاہ سے منظوری بھی لے لی۔ ان کی تجویز غالباً یہ تھی کہ بہادر شاہ کو شیعہ ظاہر کر کے اولاً لکھنؤ میں خاص اعزاز حاصل کر لیں، دوم شاہ ایران سے

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ انگریزی ص ۲۵۶۔

ہم عقیدگی کا رشتہ پیدا ہو جائے گا تو وہاں سے بہادر شاہ کے لیے امداد حاصل کرنے میں بہت سہولت رہے گی۔ اغلب ہے بہادر شاہ کے سامنے اسی مصلحت کو بطورِ خاص نمایاں کیا گیا ہو۔

اُس دَور کے مسلمانوں کی خوش فہمیوں بلکہ خام خیالیوں پر تعجب بھی ہوتا ہے اور رنج بھی کہ وہ ایران کو بہت بڑی قوت مانے بیٹھے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر ایرانی فوجیں حرکت میں آ گئیں تو انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

بہر حال بادشاہ کی صحت یابی پر ان شہزادوں نے لکھنؤ جا کر عَلَم چڑھایا جس سے بہادر شاہ کی شیعیت شہرت پذیر ہوئی اور دہلی کے سنّی مسلمان بگڑ گئے۔ اس شہرت کی تلافی کے لیے بہادر شاہ کو خاص اہتمام کرنا پڑا جس کی تفصیلات یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

پھر میرزا حیدر شکوہ کا ایک بھائی میرزا نجف ایران گیا۔ بعد میں کہا گیا کہ اس کے پاس بہادر شاہ کا ایک خاص مکتوب بھی تھا جس میں شاہ ایران سے مدد مانگی گئی تھی۔ یہ مسئلہ بہادر شاہ کے مقدمے میں بھی پیش ہوا۔

رُوس رُوس اور انگریزوں کی دشمنی یا ایک دوسرے پر بے اعتمادی معلوم عوام تھی انگریزوں کو ابتدا ہی سے یہ خطرہ تھا کہ روس وسط ایشیا میں پیش قدمی کرتا ہوا کہیں ہندوستان کی سرحد پر نہ پہنچ جائے۔ اسی تشویش و اضطراب کے عالم میں انھوں نے ۱۸۳۹ء میں شاہ شجاع اور رنجیت سنگھ سے معاہدہ کر کے امیر دوست محمد خاں کے خلاف جنگ شروع کی تھی۔ دہلی اور اطراف میں یہ افواہ بھی اُڑ گئی کہ رُوس، ایران کی مدد کرے گا، اس طرح ایک زبردست فوج انگریزوں کے قلع قمع کے لیے ہندوستان آ جائے گی۔

یہ تمام باتیں محض خیال آرائی کا کرشمہ تھیں۔ نہ ایران سے کوئی قابلِ ذکر امداد ملنے کا امکان تھا۔ نہ روس سے رابطہ ضبط پیدا کرنے کے لیے کوئی مستقل بات چیت ہوئی تھی۔ کچھ طے بھی ہو جاتا تو جب تک روس و ایران کی امداد ہندوستان کی سرحد سے قریب تر نہ پہنچ جاتی، یہاں کسی ہنگامے کے آغاز کو کس بنا پر قرینِ مصلحت سمجھا جا سکتا تھا؟

شاہ نعمت اللہ ولی

ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ شاہ نعمت اللہ ولی نام ایک بانسوی بزرگ کی پیش گوئیوں کا خاص چرچا ہوا، جو ایک یا دو قصیدوں کی شکل میں پہلے سے چلی آتی تھیں یا اسی بزرگ کے نام پر کسی اناڑی شاعر نے خود وضع کر لی تھیں ان قصیدوں کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد کوئی بھی سلیم الحواس انسان پیش گوئیاں درست ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ شعر نہایت لغو اور واقعات کی شکل ایسی کہ صاف معلوم ہوتا ہے انھیں وقوع کے بعد نظم کر لیا گیا۔ اُس دور کے عام لوگوں نے انھیں بھی بڑی اہمیت دی

قوموں کی حالت عموماً یہ دیکھی گئی ہے کہ جب وہ زندگی کی رُوح، عزم و ہمت کی استواری اور جد و جہد کی استعداد کھو بیٹھتی ہیں تو ہمیشہ بے سروپا افسانوں کو مدارِ امید بنا لیتی ہیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ فلاں وقت میں یہ ہو گا۔ بس یہ سنا اور اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ وہ وقت کب آتا ہے۔ کسی نے کہہ دیا کہ فلاں موقع پر ایک غیر معمولی شخصیت اُٹھے گی اور تمام دشمنوں کو ملیا میٹ کر کے رکھ دے گی۔ بس اس شخصیت کے لیے ہر شخص چشم براہ بیٹھ جائے گا۔

ہو سکتا ہے بعض اشخاص نے اس خیال سے ایسی باتیں وضع کر لی ہوں کہ لوگوں میں جہاد آرائی کے لیے جوش اور ولولہ پیدا ہو جائے۔ مثلاً اگر یہ کہا گیا کہ سکھ مسلمانوں پر غلبہ حاصل کریں گے، پھر انگریز انھیں شکست دے کر سارے ہندوستان پر مسلط ہو جائیں گے، بعد ازاں ایک عربی سلطان انگریزوں کی بیخ کنی کرے گا تو ممکن ہے کہنے والے کے پیش نظر یہ ایک عام دعوت ہو اور مقصد یہ ہو کہ مسلمانوں اور دوسرے لوگوں میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ لیکن سمجھا یہ گیا کہ کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے اور کیا جائے تو صحیح اصول کے مطابق ہو یا نہ ہو، چونکہ ایک بزرگ پیش گوئیاں فرما چکے ہیں، لہٰذا انھیں تو بہر حال پورا ہونا ہی ہے۔

ایک عجیب واقعہ

سید ظہیر مرحوم دہلوی نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے کہ میں ہنگامے سے چار پانچ ماہ پیشتر بازار پائے والوں میں مولوی عیسیٰ کتب فروش کی دکان پر بیٹھا کتابیں دیکھ رہا تھا۔

یکایک ایک بزرگوار لیم شحیم، دراز قامت، فربہ اندام، دراز ریش، سیہ فام
کرڑی ڈاڑھی، ساٹھ برس کا سن وسال، ڈھیلا انگرکھا، شرعی پاے جامہ
گول ٹوپی، ہاتھ میں عصا، گلے میں تسبیح ڈالے ہُوے وارد ہُوے۔

میں نے اور مولوی عیسٰی نے تعظیم دی۔ وہ ایک قرآن مجید لے کر تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ ایک رکوع پڑھنے کے بعد ان پر حالت جذب طاری ہوئی۔ آنکھیں سُرخ ہو گئیں چہرہ تمتما گیا، گردن کی رگیں پھول گئیں اور حالت غیظ میں بازار کی طرف ہاتھ اٹھا کر فرمانے لگے۔

اے لو، اے لو، وہ مار ڈالا، وہ مار ڈالا، وہ پھانسی دے دیا،
وہ پھانسی دے دیا۔ واہ وا! کیا خوب تماشا ہے!! ایک کو ایک
مارے ڈالتا ہے، ایک کو ایک پھانسی دے رہا ہے۔ اور
کوئی کچھ نہیں کہتا اور مارٹن صاحب بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں۔

پھر خود ہی فرمانے لگے: بس خاموش رہو تمہیں کس نے اذن دیا ہے کہ اسرار الٰہی فاش کرو؟ یہ کہتے ہی گردن جھکا لی اور تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ پھر وہی حالت طاری ہوئی اور وہی باتیں فرمائیں۔ تین مرتبہ کے بعد قرآن مجید کو بوسہ دیا اور میرے حوالے کر دیا۔ نیز فرمایا تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ باہر رجواڑے کی سیر کرو۔ دنیا دار کو گھر میں بیٹھ نہ رہنا چاہیے۔ یہ بھی کہا کہ اپنے والد سے مجھے ایک قرآن مجید ایسا لکھوا دو کہ تیس ورق میں تیس پارے تمام آجائیں۔[1]

وہ سید ظہیر مرحوم کا چشم دید واقعہ ہے۔ اس کی حقیقت سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دہلی کی فضا میں ایک غیر معمولی اضطرابی وہیجانی کیفیت پیدا ہو

---

[1] داستانِ غدر ص ۶۲-۶۳

چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کے در و دیوار پیش آنے والے واقعات کی صداؤں سے قبل از وقت گونجنے لگے تھے۔

یہ حالت تھی جب میرٹھ کی سپاہ انگریزوں سے سرکشی کر کے دہلی پہنچی اور جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔

بہادر شاہ

بہادر شاہ کے بارے میں جو کچھ اُوپر کہا گیا، وہ یقیناً خوش گوار نہیں۔ بایں ہمہ اس میں بعض بڑے نادر اوصاف تھے۔ اس کی غریب پروری کا یہ عالم تھا کہ لنگڑے، لولے، اندھے، بہرے، اپاہج جتنے ملازم تھے، سب کی تنخواہیں گھر بیٹھے پہنچتی تھیں۔ نقصان کی مہریں قلعے میں جاتی تھیں۔ عمر بھر میں شاید ہی کسی ملازم کو موقوف کیا ہو۔ ملازموں سے ہمیشہ محبت کی باتیں کرتا، سخت کلامی سے کبھی پیش نہ آتا۔ مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ دو بدکار لونڈوں کے سر منڈوا دیے اور ایک لونڈی کی ناک کاٹنے کا ارادہ کیا۔

> قاعدہ ہے کہ جب چراغ بجھنے کو ہوتا ہے تو کڑا اٹھتی ہے۔ اسی طرح جب سلطنت تیموریہ کا چراغ گل ہونے کو ہوا اور آخری وقت آیا تو اس نے وہ روشنی چمکائی اور ایسا سنبھالا گیا کہ اس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔[1]

شہر اور قلعے کا انتظام

یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ اس وقت شہر اور قلعے کا عام انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ البتہ بادشاہ اپنے دائرے میں آزاد خود مختار تھا۔ قلعے میں انگریزوں نے ایک محافظ دستہ مقرر کر رکھا تھا، جس کا افسر کپتان ڈگلس[2] تھا۔ دہلی کی کمشنری کے عہدے پر سائمن فریزر[3] مامور تھا۔ مٹکاف

---

[1] عہد اسلامی، جلد نہم ص ۳۴۷
[2] DOUGLAS
[3] SIMON MAZER,

مجسٹریٹ تھا اور ریچن سن کلکٹر۔ دوسرے محکمے بھی انگریزوں ہی کے قبضے میں
تھے۔ شہر کی شمالی سمت میں کشمیری دروازے کے باہر پہاڑی کے شمالی رخ
انگریزی چھاؤنی تھی۔ آیندہ جو حالات بیان ہوں گے، انھیں سمجھنے کے لیے یہ ابتدائی
معلومات مفید ثابت ہوں گی۔

باب ۲

سپاہ میرٹھ کا داخلہ دہلی میں

دہلی میں افواہیں

دہلی میں کچھ تو ایران و روس کے متوقع حملے کی بنا پر اور کچھ نعمت اللہ شاہ دلی کی پیشگوئیوں کے باعث پہلے سے ایک غیر معمولی بے چینی پائی جاتی تھی۔ کلکتہ کے آس پاس جو واقعات پیش آ چکے تھے، ان کی خبریں بھی مل گئی تھیں۔ چونکہ دماغوں میں ایک خاص قسم کا تصور قائم ہو چکا تھا، اس لیے تمام خبروں کو اسی تصور کے آئینے میں دیکھا جاتا تھا۔ میرٹھ کے پچاسی سپاہیوں کے لیے جو فوجی عدالت قائم کی گئی تھی، اس میں دہلی سے کچھ فوجی افسر شامل ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی واپس جا کر اپنے تاثرات مختلف آدمیوں کو سنائے ہوں گے اور ان باتوں کی بھنک باہر پہنچ جانا بالکل اغلب تھا۔ سب سے آخر میں یہ کہ میرٹھ کی سپاہ نے ۹۔مئی کو سرکشی کا آخری فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے لیے ۱۰۔مئی کی شام کا وقت مقرر ہو چکا تھا۔ یہ خبر بھی دہلی کی چھاؤنی میں بھیج دی گئی تھی۔ گویا سارا شہر نہیں تو کم از کم اس کے مختلف افراد کسی نہ کسی ہنگامے کے آغاز کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے، اگرچہ انھیں ٹھیک معلوم نہ ہو گا کہ ہنگامہ کب شروع ہو گا، کس شکل میں شروع ہو گا اور اس کے شعلے کیوں کر بھڑکیں گے۔

سائمن فریزر کو اطلاع

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ میرٹھ کی انگریزی فوج نے بعض خاص مصلحتوں کی بنا پر سرکشوں کا تعاقب نہ کیا، لیکن تار کے ذریعے سے سائمن فریزر کمشنر کو دہلی اطلاع بھیج دی تھی تاکہ وہ سرکشوں کے پہنچنے سے قبل مناسب احتیاطی تدابیر اختیار کر لے۔ یہ تار اس وقت ملا جب فریزر سو گیا تھا۔ نوکر نے جگا کر

تار دے دیا۔ فریزر اسے جیب میں ڈال کر پھر سو گیا اور صبح اس وقت تار دیکھا جب میرٹھ کے سپاہی دہلی پہنچ چکے تھے[1] ایک بیان یہ ہے کہ بہت روپیہ خرچ کر کے ایک چٹھی دہلی بھیجی گئی تھی جو رات کے دس گیارہ بجے مل گئی تھی لیکن فریزر چونکہ سو یا رہا، لہٰذا صبح تک اس نے چٹھی نہ دیکھی اور دفاعی انتظامات کا وقت ہاتھ سے نکل گیا۔

چونکہ فریزر سپاہیوں کے شہر میں داخل ہوتے ہی مارا گیا تھا اس لیے تار یا چٹھی کی تحقیقات بھی نہ ہو سکی اور تحقیقات ہو بھی جاتی تو اس سے نتیجہ کیا نکل سکتا تھا؟

سپاہیوں کی آمد

بہر حال سپاہی بہت سویرے دریائے جمنا پر پہنچ گئے۔ غازی آباد کی طرف کے کنارے کے پاس پرمٹ کی ایک چوکی تھی، اسے آگ لگائی، پرمٹ والے افسر کو مارا۔ پھر کشتیوں کے پل پر پہنچے۔ وہاں تار کے محکمے کا ایک انگریز کارکن ملا جس کا نام ٹاڈ تھا۔ وہ تار کی درستی کے لیے جا رہا تھا، اسے قتل کیا اور کلکتہ دروازے پر پہنچ گئے اسے بند دیکھا تو شاہی جھروکے کے نیچے کھڑے ہو کر شور مچایا کہ ہم نے میرٹھ میں انگریزوں کو قتل کر دیا ہے، دین کی خاطر جنگ کا فیصلہ کر چکے ہیں، ہماری امداد فرمائیے اور سر پر ہاتھ رکھیے۔ حضور ہی ہمارے دین اور دنیا کے نگہبان ہیں۔

بادشاہ تک یہ باتیں پہنچیں تو کپتان ڈگلس کو بلایا جو قلعے کی گارد کا افسر تھا[2] اس نے

---

[1] ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ اگر سرکشوں کا تعاقب کیا جاتا تو بڑی حد تک یقین ہے کہ دہلی کو ضرور بچا لیا جاتا، اگرچہ مختلف مقامات پر متفرق شورشیں ہوتیں اس لیے کہ اسباب موجود تھے (ص ۶۵) [2] ڈاکٹر سین نے خدا جانے کس بنا پر فرض کر لیا کہ بہادر شاہ کو اس ہجوم کے سامنے جانے کا حوصلہ نہ تھا جو کسی ضبط و نظم کا پابند نہ تھا (۷۰)، بہادر شاہ میں اور کتنے ہی عیب ہوں گے، لیکن بزدلی کا عیب قطعاً نہ تھا۔ اصل معاملے کا تعلق انگریزوں سے تھا لہٰذا ڈگلس کو بلایا، ورنہ جو لوگ بہادر شاہ سے سر پر ہاتھ رکھنے کے آرزومند تھے، ان سے کیا ڈر ہو سکتا تھا۔

کیفیت سُن کر کہا کہ میں سپاہیوں کو سمجھاتا ہوں۔ بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں دونوں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور کہا کہ ہم نہ جانے دیں گے۔ ڈر یہ تھا کہ شاید سپاہی گولی چلا دیں۔ چنانچہ ڈگلس نے برآمدے میں آکر سپاہیوں سے کہا کہ یہ بادشاہ کی خواب گاہ ہے۔ تم شور و غل سے حضور کو تکلیف نہ دو۔ یہ فریاد سننے کی جگہ نہیں۔ تم کوٹلہ کی طرف جاؤ۔ وہاں جو کچھ کہنا ہو کہو، ضرور شنوائی ہوگی[1]

راج گھاٹ دروازہ

چنانچہ سپاہی وہاں سے راج گھاٹ دروازے کی طرف چلے گئے کلکتہ دروازے کی طرح راج گھاٹ دروازہ بھی بند تھا۔ کچھ معلوم نہیں کہ اسے کس نے کھول دیا۔ تو پہریداروں میں سے کوئی ان کے ساتھ مل گیا یا ممکن ہے، دروازہ اس لیے کھول دیا گیا ہو کہ ہندو اسی دروازے سے اشنان کرنے کے لیے دریا پر جایا کرتے تھے۔ سید ظہیر دہلوی کا بیان ہے کہ دریا میں اشنان کرنے والے پانسو کے قریب جمع ہو گئے تھے اور دروازہ کھولنے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ آخر نوبت زدوکوب کی پہنچی اور لوگوں نے بلوا کر کے پتھروں سے قفل توڑ ڈالا۔ بعض کہتے ہیں کہ دروازہ پہلے سے کھلا تھا[2]

بس، راج گھاٹ دروازے سے داخل ہوتے ہی انگریزوں کا قتل شروع ہو گیا اور اس پر افسوس کتنا ہی کیا جائے لیکن تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ لوگ میرٹھ میں جو کچھ کر آئے تھے، اس کے بعد انھیں معافی کی کیا اُمید ہو سکتی تھی؟ وہ آخری داؤ لگا چکے تھے اور جو قدم انھوں نے اُٹھا لیا تھا اُسے واپس لینے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اب ان کے لیے بچاؤ کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ حالات کو زیادہ سے زیادہ بگاڑ دیں اور ایسی صورت پیدا کر دیں کہ ہر جگہ آگ بھڑک اُٹھے۔ انگریزوں کا قتل ان کے نزدیک اس لیے ضروری تھا کہ اگر زندہ رہے تو

---

[1] ظاہر ہے کہ اس وقت ڈگلس کو بھی حالات کی نزاکت کا کوئی اندازہ نہیں تھا اور اسے بالکل معمولی معاملہ سمجھا۔ [2] داستان غدر ص ۵۵، ۵۶۔

تادیبی کارروائیاں شروع ہو جائیں گی۔ اس حالت کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عوام بھی تذبذب میں پڑ جائیں گے اگر انگریزی حکومت کا نشان تک مٹ جاتا تو عوام کے لیے دو دلے رہنے کا بظاہر بہت کم امکان تھا، البتہ یہ ضرور کہہ دینا چاہیے کہ عورتوں اور بچوں یا ان لوگوں کے قتل کی کوئی وجہ نہ تھی۔ جو جنگ کے قابل نہ تھے یا جن کے ذریعے سے کسی تادیبی کارروائی کا امکان نہ تھا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ عام ہنگامہ بپا ہوتا ہے تو اکثر آدمی حق و ناحق کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں اور ان پر ایک خاص قسم کی جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سرکشوں پر بھی ایک جنونی کیفیت طاری تھی۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا، اسے ایک غلط فعل کی معذرت نہیں سمجھنا چاہیے۔ مقصود یہ ہے کہ حالات کا نقشہ زیادہ سے زیادہ صحیح صورت میں سامنے آجائے۔

ہمہ گیر افراتفری

کپتان ڈگلس سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کیا جائے، اس اثنا میں اسے سائمن فریزر کمشنر کا پیغام ملا کہ جلد سے جلد کلکتہ دروازہ پر پہنچو۔ وہ گیا تو وہاں سائمن فریزر، ہچن سن (کلکٹر) اور تھیوفلس مٹکاف (مجسٹریٹ) موجود تھے۔ سپاہ پل پر سے گزر کر دروازے پر آ پہنچی تھی۔ اندر کی طرف بھی تماشائیوں کا اجتماع ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فریزر نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مٹکاف نے یہ مناسب سمجھا کہ جلد سے جلد کوتوالی پہنچ کر پولیس گارد کو دروازوں کی حفاظت کے لیے بھیج دے۔ اس اثنا میں ایک گولی سائمن فریزر کے پاس سے گزری۔ اس نے ایک سپاہی کی بندوق لے لی اور گولی چلانے والے کو ختم کر دیا۔ بس اس کے ساتھ ہی اس زور سے غلہ شروع ہوا کہ انگریز افسر پیچھے کی طرف بھاگے۔

میرا خیال ہے کہ اس اثنا میں راج گھاٹ دروازے سے داخل ہونے والے سپاہی آ پہنچے تھے اور انھوں نے پیچھے سے حملہ کر دیا تھا۔ انگریزوں نے بھاگ کر قلعے میں پناہ لی۔ ڈگلس خندق میں کودا۔ اس کا پاؤں زخمی ہو گیا اور چپراسی اسے نیم بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر اندر مکان میں لے گئے۔ ڈگلس کے پاس ایک پادری بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ ساتھ اس کی بیٹی اور ایک اور انگریز لڑکی بھی تھی، فریزر اور ہچن سن بھی وہیں پہنچ گئے۔ اب جو آدمیوں

کاریلا آیا تو اس میں یہ سب لوگ بڑی ہی بے دردی سے قتل کر دیے گئے۔ باقی انگریزوں کو بھی حتی الامکان چھوڑا نہ گیا۔ زیادہ تر انگریز اور عیسائی دریا گنج میں رہتے تھے، جو راج گھاٹ کے دروازے سے قریب تھا اور جہاں سپاہی پہلے پہنچے تھے۔ ان میں سے اکثر ختم کر دیے گئے۔ سب سے پہلے پہلے ایک ہندوستانی ڈاکٹر چمن لال مارا گیا۔ یہ دریا گنج ہی میں تھا۔

مٹکاف کی داستان بڑے انگریز افسروں میں سے صرف تھیوفلس مٹکاف بچ نکلا۔ اس کی سرسری کیفیت یہ ہے کہ پہلے میگزین کے پہریداروں میں سے چوبیس کو دروازوں کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ پھر وہ کلکتہ دروازہ کی طرف آیا تو ہجوم کو دیکھ کر گاڑی بھگائی۔ کوتوال کو کوتوالی کی حفاظت کے لیے ہدایت کی اور خود دریا گنج کی طرف گیا۔ راستے میں تین سوار ملے۔ ان سب نے پستول چلانے چاہے۔ مٹکاف تازیانے مار مار کر انھیں پیچھے ہٹاتا رہا۔ پھر گاڑی سے کود کر اُترا۔ کوٹ اتارا، پتلون اتاری اور گلیوں کے اندر بھاگا۔ اتفاق سے جھجر کا ایک سوار محمد خاں نظر آیا۔ اس سے گھوڑا مانگا۔ محمد خاں نے انکار کیا تو مٹکاف نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر نیچے گرا دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر چاوڑی بیں سے ہوتا ہوا اجمیری دروازے کی طرف گیا۔ اجمیری دروازے کے دکانداربانس لے کر اُسے مارنے نکلے لیکن وہ بہ خیر و عافیت پہاڑ گنج پہنچ گیا[1] بعد ازاں چند روز ایک میواتی کے پاس چھپا رہا۔ پھر جھجر گیا۔ وہاں سے بڑی پریشانی کی حالت میں نکلا اور چھپتا چھپاتا سکر کے مقام پر بہ مقام ہانسی چلا گیا۔ تفصیلات یہاں غیر ضروری ہیں۔

بنک دوپہر سے پہلے پہلے بہت سے بڑے بڑے انگریز افسر مارے جا چکے تھے۔ اب لوگوں کی توجہ بنک کی طرف ہوئی حملے کے آغاز ہی میں کشت و خون کا ہنگامہ عام شروع ہو گیا تھا۔ بیرس فورڈ منیجر نے یہ حالت دیکھی تو اپنی بیوی بچوں کو لے کر بنک کی چھت پر چڑھ گیا اور کچھ دیر مزاحمت جاری رکھی۔ آخرت عمارت کو آگ لگا دی گئی اور اس کے شہتیر جل جل کر گرنے

---

[1] غدر کے دو روزنامچے (انگریزی) ص ۴۵

گئے۔ بنیجر اور اس کے کُنبے کے افراد بھی مارے گئے۔ مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ بنک کے روپے لُٹنے کی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ بعض مقطع اور ثقہ آدمی اندر گھسے اور توڑے بغلوں میں لے کر نکلنے لگے۔ سب توڑے یا تو سپاہیوں نے چھین لیے یا بدمعاشوں نے رکھوا لیے۔ بدمعاشوں کے توڑے بھی آخر کار سپاہیوں کے ہی قبضے میں آئے۔ دفتر کے کھاتے بھی لٹ گئے، لیکن بعد فتح دہلی جب بنک نے رجسٹروں کے بہم پہنچانے کا اشتہار دیا تو تمام رجسٹر مل گئے۔[1]

غرض ایک مخصوص انگریزی ادارہ ہدف یورش بننے لگا۔ بنک کے بعد دہلی

"دہلی گزٹ" پریس

گزٹ پریس کی باری آئی۔ وہاں عیسائی کمپوزیٹر کام میں مصروف تھے۔ وہ صبح اخبار کی ایک غیر معمولی اشاعت میں یہ خبر چھاپ چکے تھے کہ میرٹھ سے سپاہ سرکشی کر کے دہلی پہنچ رہی ہے۔ دوپہر کے وقت آدمیوں کا ایک گروہ پریس کی عمارت میں جا گھسا۔ کمپوزیٹر مارے گئے۔ سامان تباہ کر دیا گیا۔ ٹائپ کے لیے جو سیسہ ملا اسے اُٹھا کر لے گئے کہ گولیاں بنا کر گوروں کو ماریں گے۔ گرجا بھی دستبرد سے نہ بچ سکا۔ اس کے اوپر جو صلیب لگی ہوئی تھی، گولیوں سے چھلنی کر دی گئی۔ دیواروں پر جا بجا یادگاری سلیں نصب تھیں، ان سب کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ گھنٹے کی رسیاں کاٹ دیں اور وہ پتھروں پر گرا تو ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر گیا۔[2]

چھاؤنی کا علاقہ، کشمیری دروازہ، موری دروازہ، تیلی واڑہ اور کشن گنج کے پاس سے

چھاؤنی

شروع ہو کر پہاڑی کے ساتھ ساتھ دور تک جاتا تھا۔ اس جگہ اب یونیورسٹی بن گئی ہے۔ خاص چھاؤنی پہاڑی کے اوپر تھی اور شہر سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ہوگی۔ انگریز افسروں کی کوٹھیاں زیادہ تر ایک جگہ تھیں۔ سرکش افواج کے داخلے کی خبر سن کر وہاں سے کچھ دستے شہر کے اندر بھیجے گئے۔ لیکن جب انھیں سرکشوں پر آتشبازی کا حکم دیا گیا تو دیسیوں میں سے کسی نے بھی اس حکم کی تعمیل نہ کی، اس طرح ان کی بھی سرکشی آشکارا ہو گئی۔ اس میں بھی متعدد انگریز افسر

---

[1] ذکاء اللہ ص ۴۱۳ ۔ [2] ذکاء اللہ ص ۵۱۴ ۔

مارے گئے، لیکن بعض انگریز افسروں کو سپاہیوں نے محفوظ واپس پہنچا دیا اور کہا کہ اب آپ اپنی حفاظت کا خود بندوبست کر لیں، ہم بے بس ہیں۔

میگزین

سب سے آخر میں میگزین کی باری آئی، جس میں ہر قسم کا سامان جنگ بافراط موجود تھا۔ اس کا افسر اعلیٰ لفٹنٹ ولوبی[1] تھا اور لفٹنٹ فارسٹ[2] اس کے معاونوں میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ شروع میں کوشش کی گئی تھی، میگزین سے دو توپیں لے کر ایسی جگہ نصب کر دی جائیں کہ سرکش فوج جمنا کے پل پر سے گزر کر شہر کے دروازے پر نہ آ سکے، لیکن جب توپیں نکالی گئیں تو معلوم ہوا کہ سپاہ پل سے گزر کر دروازے پر آ چکی ہے، نیز ایک دستہ راج گھاٹ دروازے سے اندر داخل ہو چکا ہے۔ اس وقت توپیں لگانا بالکل بے سود تھا۔

جب شہر کو بچانے کی تمام امیدیں زائل ہو گئیں تو میگزین کے دفاع کا پختہ انتظام کر لیا گیا۔ ولوبی کے پاس صرف آٹھ فرنگی تھے، نواں وہ خود تھا۔ کاروان سپاہی سب کے سب اس فوج سے تعلق رکھتے تھے، جو سرکشی اختیار کر چکی تھی اور جن پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جتنے دیسی کاریگر میگزین میں کام کرتے تھے، ان میں سے کوئی بندوق چلانا نہیں جانتا تھا۔

غرض میگزین کا دروازہ بند کر کے اندر کی طرف مٹی کے بورے بھر کر رکھ دیے گئے تاکہ دروازہ آسانی سے نہ کھولا جا سکے، نیز سپاہی بوروں کے پیچھے بیٹھ کر گولیاں چلا سکیں۔ دو توپیں بھی نصب کر دی گئیں۔ یوں حفاظت کے پورے انتظامات کر کے مقابلے کی تیاری کر لی گئی۔ جب اطلاع ملی کہ سیڑھیاں آ رہی ہیں، جن کے ذریعے سے حملہ آور اندر آ جائیں گے تو بارود کے ذخیرے سے باہر دُور تک بارود بچھا دی گئی تاکہ دور ہی سے آگ دے کر بارود اور ساز و سامان کو اڑایا جا سکے اور ذخیرہ سرکشوں کے قبضے میں نہ جانے پائے۔

جب میگزین کے بچاؤ کی کوئی صورت نہ باقی رہی تو آگ لگا دی گئی۔ انگریزوں میں

---

[1] WILLOUGHBY [2] FORREST، اس کے بیٹے نے ۱۸۵۷ء پر ایک مفصل کتاب لکھی تھی۔

سے صرف پانچ زندہ بچے۔ بہت سے حملہ آور بھی مارے گئے۔ اگرچہ میگزین کے اڑنے سے سامان کو اتنا نقصان نہ پہنچا جتنا کہ پہنچانا منظور تھا، تاہم ان انگریزوں کے کارنامے کو ۱۸۵۷ء کے چند بہت بڑے کارناموں میں شمار کیا گیا۔

متفرق واقعات

میگزین کے قریب لوہاروں کا کارخانہ تھا جسے "لوہا خانہ" کہتے تھے۔ اس میں ہلکے اوزار بنتے تھے۔ یہ بھی لوٹا گیا۔ لالہ ٹھاکر داس قید خانے کا داروغہ تھا۔ صبح ہی سے اس کے جیل میں تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ پانچ بجے شام تک تو اس نے معاملات کو بگڑنے نہ دیا۔ پھر جب واضح ہو گیا کہ سپاہی نہیں رکیں گے۔ تو لالہ ٹھاکر داس جیل خانہ چھوڑ کر چلا گیا۔ یہاں معاملہ قیدیوں کی رہائی تک محدود رہا۔ خزانہ محفوظ کا محفوظ بادشاہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔

چھاؤنی میں جتنے انگریز محفوظ رہے تھے، انھوں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ نکل جائیں۔ سواریاں ان کے قبضے میں تھیں۔ ان میں بال بچوں کو بھی بٹھایا اور خود بھی بیٹھے۔ بعض نے کچھ اسباب بھی رکھ لیا اور نکل پڑے۔ کچھ کرنال اور انبالہ کی طرف چلے گئے، کچھ میرٹھ پہنچ گئے۔ بعض راستے ہی میں مارے گئے۔ جو انگریز قید ہوئے تھے اور ان میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے، انھیں پہلے حرم شاہی کے ایک حصے میں رکھا گیا اور چند روز بعد سرکشوں نے انتقاماً انھیں قتل کر ڈالا۔

چند ضروری سوالات

یہ ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کے واقعات کی سرسری سرگزشت ہے اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ضروری سوالات پر غور کریں۔ مثلاً:

۱۔ کیا یہ سب کچھ شاہ دہلی یا اس کے خاص مشیروں کے ساتھ ساز باز کی بنا پر ہوا تھا؟

۲۔ کیا شاہ دہلی کو انگریز افسروں یا دوسرے افراد کے قتل کے لیے کسی بھی درجے میں

ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے؛

۳۔ کیا شاہ دہلی اس ہنگامے یا سرکشی کو واقعی اپنے مستقبل کے لیے مفید سمجھتا تھا اور آیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے چار مہینے میں جو کچھ کیا، وہ آزادی وطن کے لیے تھا؟

ان سوالوں کا جواب زیادہ تفصیل کا طلب گار نہیں۔ بادشاہ یا اس کے مشیروں کو اس ہنگامے کے آغاز یا اس کے بارے میں ساز باز سے قطعاً کوئی علاقہ نہ تھا، بلکہ جب تک میرٹھ کی سپاہ دہلی نہ پہنچ گئی، کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ باہر کوئی ہنگامہ بپا ہو چکا ہے۔ اس وقت تک اکثر لوگوں کو یقین ہوگا کہ انگریز جلد سے جلد تعاقب میں پہنچیں گے، اس لیے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ لوگ سرکش سپاہ کے خیر مقدم کے لیے بھی دل سے تیار نہ ہوں گے۔ تاہم جب تک معاملات کی باگ ڈور سپاہ کے ہاتھ میں تھی، ان کے لیے عافیت کی راہ یہی تھی کہ اپنی دلی بے اطمینانی یا نارضامندی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔

انگریزوں کا قتل

اس حقیقت میں شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں کہ بادشاہ کو انگریزوں کے قتل سے ہرگز کوئی تعلق نہ تھا۔ بے شک وہ انگریزوں کو اچھا نہیں سمجھتا تھا، لیکن کسی کو بُرا سمجھنا ایک ادنیٰ بات ہے اور اسے قتل کرا دینا یا اس کے قتل پر خوش ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ سپاہیوں میں بعض بہت تیز مزاج تھے اور ان کا خیال تھا کہ جب تک ایک ایک انگریز کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیا جائے گا، ہندوستان کی آزادی کا مطلع صاف نہ ہوگا۔ یہ خیال صحیح نہ تھا لیکن ہنگامی عوامی تحریکوں میں اس قسم کی بے احتیاطیاں اکثر پیش آتی ہیں۔ انقلاب فرانس کی حالت دیکھیے۔ وہاں معاملہ اجنبیوں کا نہ تھا بلکہ ہم وطنوں کا تھا۔ پہلے ان امیروں کو بے امتیاز مارا گیا، جن سے عوام تنگ تھے، پھر خود عوامی لیڈروں کے مختلف گروہ ایک دوسرے کے ہاتھ سے ذبح ہوتے رہے۔ طبیعتوں پر شکوک غالب تھے اور جذبات مشتعل، ہر چھوٹی بڑی مخالف خبر سن کر پریشانی بڑھ جاتی تھی، پھر بعض اوقات اپنے کسی عزیز یا دوست یا ہم وطن و ہم شہر کی موت انتقام کشی کا ایک عجیب و غریب جنون پیدا کر دیتی

تھی۔ یقیناً یہ افعال نازیبا تھے، لیکن بہادر شاہ کسی بھی درجے میں ان کے لیے ذمہ دار نہ تھا، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی جان دے دینے میں کیوں تامل کیا؟ لیکن زیر غور معاملہ اخلاقی یا قانونی ذمہ داری کا ہے، نہ کہ درجات، ایثار کے تعین کا!

بہادر شاہ اور جہادِ آزادی

بہادر شاہ نے چار مہینے کی حکومت میں جو کچھ کیا اس کے بارے میں ذرا تفصیلی گفتگو آگے چل کر ہوگی۔ یہاں صرف یہ بتا دینا چاہیے کہ جو موقع ہمارے سامنے آیا ہے، اس میں مختلف رنگوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انگریزوں کی طرف سے تعاقب میں دیر ہوئی، دہلی میں بکثرت فوج جمع ہو گئی۔ اور جا بجا ہنگامے ظہور پذیر ہو چکے تو بہادر شاہ کو امید پیدا ہو گئی ہوگی کہ انگریزوں کی بساط حکومت لپیٹی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک قومی آزادی کے وہ تصورات مانوس میں موجود ہی نہ تھے جو اب رواج عام پا چکے ہیں اور آزادی کا تصور ملکی حکمران ہی کی شکل میں کیا جاتا تھا۔ بہادر شاہ نے سمجھنا شروع کر دیا ہوگا کہ اس کی حکومت بحال ہو جائے گی اور انگریز ہمیشہ کے لیے نکال دیے گئے۔ بعض ایسی مستند اطلاعات بھی ہمارے سامنے موجود ہیں کہ بہادر شاہ اس سارے ہنگامے کو اپنی بربادی کا سامان قرار دیتا تھا[1]

میرا خیال ہے کہ یہ دراصل وقتی تاثرات تھے۔ جب حالات سازگار ہو جاتے تھے تو سمجھا جاتا تھا کہ انقلاب کامیاب ہو رہا ہے۔ جب باہر سے شکست کی خبریں آتیں اور خود عساکر دہلی کی بدنظمی پر نظر پڑتی تو دل پر یہ اثر ہوتا کہ یہ چند روزہ کھیل ہے۔ بہادر شاہ تو خیر بوڑھا تھا اور اس سے سرگرم جدوجہد کی توقع ہی نہ ہو سکتی تھی، شہزادوں میں سے بھی کوئی صاحب ہمت پیدا نہ ہوا۔ ایک فیروز شاہ مستثنیٰ شخصیت کا مالک تھا، لیکن وہ دہلی میں نہیں تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دہلی میں ہوتا تو دوسرے شہزادوں کی رقابتوں سے اس کی سرگرمیوں پر

---

[1] داستان غدر ص ۱۰۰ — ۱۰۱۔

کیا اثر پڑتا۔

بیانات کا دُوسرا مرقع اوپر ہم نے واقعات کے متعلق جو کچھ لکھا، وہ اُردو اور انگریزی کی مستند کتابوں کے بیانات کا خلاصہ ہے۔ سید ظہیر دہلوی نے بعض ایسی تفصیلات بتائی ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں۔ ان کا خلاصہ ذیل میں درج ہے:

۱۔ بہادر شاہ جھروکے میں بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ نیچے سواری کی تیاری تھی۔ یکا یک جھروکے پر سے ہنکارے کی آواز آئی۔ میر فتح علی ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔ اشارۂ سابہ سے دریا کے پُل کی جانب ایما ہُوا۔ دیکھا تو دریا پار میر بحر کے بنگلے میں آگ لگی ہوئی تھی میر فتح علی نے رسالدار کو حکم دیا کہ سوار بھیج کر خبر منگواؤ۔

۲۔ سواروں نے کوئی پانچ منٹ میں واپس آکر خبر دی کہ غنیم ونّی پر چڑھ آیا ہے۔ اس کی فوج نے تاخت و تاراج پر کمر باندھی ہے۔ بنگلہ پھونک دیا، میر بحر کو مار ڈالا۔ مال کا صندوق لوٹ لیا۔

۳۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ پُل توڑ دیا جائے، کشتیاں کھینچ لی جائیں، شاہی فوج موقع پر چلی جائے، کوتوال تمام دروازے بند کرا دے۔ اس اثنا میں سوار سلیم گڑھ کے نیچے سے ہوتے ہوئے جھروکہ کے نیچے پہنچے۔ جو لوگ مختلف دروازوں سے باہر نکلے تھے وہ سب گرتے پڑتے اندر چلے گئے اور دروازے بند کر دیے۔

۴۔ سواروں نے اپنی شکایات تفصیل سے پیش کیں۔ وہ تمام حالات بتائے، جو سرکشی کا موجب بنے تھے۔ بادشاہ نے اپنی بے بسی اور بے مائگی پیش کی اور کہا نہ میرے پاس خزانہ ہے، نہ نوکر رکھ سکتا ہوں، البتہ بیچ میں پڑ کر انگریزوں سے صفائی کرا دیتا ہوں۔

۵۔ سائمن فریزر نے جھروکے پر سے سپاہیوں کے ساتھ لمبی گفتگو کی۔ اس اثنا میں ایک

سپاہی نے فریزر پر بندوق چلادی۔ گولی حکیم احسن اللہ خاں کے برابر میں سے نکل کر تسبیح خانے کے ستون پر جا لگی اور سنگ مرمر کا ٹکڑا ٹوٹ کر گر پڑا۔

۶۔ بادشاہ نے اپنے آدمی ساتھ کرنے چاہے، فریزر نے کہا کہ دربار کی سو جھلکے آدمی ہیں، ڈیوڑھی کی حفاظت کو رہنے دیجیے۔ حضور کا اقبال کافی ہے، حضور خاطر جمع رکھیں۔

۷۔ سائمن فریزر اور ڈگلس باہر گئے۔ سواروں نے بگھی کو آگھیرا۔ صاحب نے بگھی کے گھوڑے کی باگ قلعے کے دروازے کی طرف پھیری، ایک سوار کو پستول سے قتل کیا اور کھڑکی کے راستے دونوں اندر پہنچ گئے۔ چھتے سے ہوتے ہوئے یہ زینے پر چڑھ رہے تھے۔ ڈگلس ہلکا پھلکا تھا، پہلے چڑھ گیا۔ فریزر جسیم تھا لہذا پیچھے رہا۔ سرکشوں نے ان کا کام تمام کر دیا۔[1]

ہنگامے کی خبریں دہلی سے ہنگامے کے متعلق جو پہلا تار بھیجا گیا، اُس کا متن یہ تھا:

ہمیں دفتر سے چلے جانا چاہیے۔ تمام بنگلے جل رہے ہیں۔ میرٹھ کے سپاہیوں نے انھیں آگ لگائی ہے۔ وہ آج صبح آئے تھے۔ ہم جا رہے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ سی ٹاڈ مارا جا چکا ہے۔ وہ صبح گیا تھا۔ اب تک واپس نہیں آیا۔ معلوم ہوا ہے کہ اب تک نو فرنگی مارے جا چکے ہیں۔

یہ تین بجے کا تار تھا۔ چار بجے یہ تار گیا:

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو داستانِ غدر ص ۴۲، ۵۶۔ میرٹھ سے مراد بدیہی طور پر دہی بریگیڈ کی چوکی والا افسر مراد ہے۔

چھاؤنی محصور ہے۔ میرٹھ کے باغی، نمبر ۳ لائٹ رسالہ۔ تعداد معلوم نہیں۔ کہا جاتا ہے کل ڈیڑھ سو آدمی۔ میرٹھ سے سلسلہ مخابرت کاٹ دیا گیا۔ کشتیوں کے پُل پر قبضہ کر لیا گیا۔ نمبر ۵۴ دیسی سپاہ ان کے مقابلے پر بھیجی گئی تھی، لیکن وہ کچھ کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ بہت سے افسر مقتول و مجروح ہُوئے۔ شہر میں افراتفری پھیلی ہوئی ہے فوجیں بھیجی گئیں، لیکن کچھ معلوم نہیں کیا ہُوا۔ اطلاع ملے گی تو پہنچا دی جائے گی۔[1]

---

[1] کیئی جلد دوم ص ۳۰۱ حاشیہ۔ مسٹر سی ٹاڈ C. TODD تار کے محکمے کا رکن تھا۔ یہ دونوں تار دہلی سے جنرل این سن سپہ سالار کے نام بھیجے گئے تھے اور اس نے ہنگامے کے متعلق جو خط گورنر جنرل کے نام لکھا اس میں یہ تار بھی نقل کر دے۔

باب ۴

دہلی پر انگریزوں کی یورش

جنرل این سن

جنرل این سن[1] سپہ سالارِ اعظم اس وقت شملہ میں تھا۔ بیشتر انگریزی دستے بھی پہاڑوں ہی پر پہنچے ہوئے تھے۔ ۱۲ مئی کو اسے میرٹھ کے ہنگامے کی خبر ملی۔ اگرچہ اس خبر سے حالات کی نزاکت کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا تاہم اس نے کسولی، ڈگشائی اور سباتھو کی پلٹنوں کو تیار رہنے کا حکم بھیج دیا۔ مزید دو روز میں بہت سی تفصیلات مل گئیں، جن سے ہنگامے کی وسعت و شدت کا اندازہ ہو گیا چنانچہ "فیروزپور" امرت سر، جالندھر اور پھلور کے میگزینوں کو حفاظت میں لے لینے کے احکام جاری کر دیے گئے۔ ۱۴ مئی کو جنرل این سن شملہ سے چلا اور ۱۵ کی صبح کو اسّی میل کا فاصلہ طے کر کے انبالہ پہنچ گیا۔

اس اثنا میں جتوک کی گورکھا پلٹن کو حکم بھیج دیا گیا کہ فی الفور پھلور چلی جائے اور وہاں سے توپ خانہ لے کر انبالہ پہنچے۔ نور پور اور کانگڑہ کی فوجوں کو بھی یہی حکم بھیجا گیا۔ رڑکی اور ڈیرہ کی سفر مینا اور گورکھا پلٹن کو میرٹھ پہنچنے کی ہدایت ہوئی۔

مختلف فوجیں انبالہ پہنچیں، ۱۷ کو این سن نے کچھ سامانِ جنگ اور حمل و نقل کا

---

[1] ADSON بتایا گیا کہ این سن کو جنگ کا زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ وہ جنگ واٹرلو (۱۸۱۵ء) میں شریک تھا، پھر دارالعلوم کا ممبر بن گیا۔ ۱۸۵۳ء میں اسے فوج بنگال کی کمانداری کا عہدہ ملا، ۱۸۵۴ء میں فوج مدراس کا کماندار بنا اور ۱۸۵۶ء میں اسے سپہ سالار بنا دیا گیا۔

بندوبست کر کے ایک دستے کو کرنال کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ دہلی کی جانب پیش قدمی کا مقدمہ تھا۔

تذبذب

یہ اطلاع مل ہی چکی تھی کہ دہلی میں معتدبہ فوج جمع ہوگئی ہے، اس لیے این سن سمجھتا تھا کہ جب تک انگریزی فوج خاصی تعداد میں جمع نہ ہو جائے گی، دہلی پر حملہ مناسب نہ ہوگا۔ توپوں کی گولہ باری سے فصیل کو توڑ لینا مشکل نہ تھا لیکن شہر کی پُرپیچ گلیوں میں تھوڑی فوج کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پنجاب میں اس وقت سر جان لارنس حاکم تھا۔ اس کی رائے تھی کہ دہلی پر فوراً حملہ کیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ انگریزی فوج کو دیکھتے ہی شہر کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔

انگریزی اقتدار کی تاریخ میں یہ بڑا ہی نازک موقع تھا۔ بلاشبہ این سن یا کوئی بھی سپہ سالار تھوڑی سی فوج لے کر دہلی پر یورش نہیں کر سکتا تھا اور کرتا تو اس فوج کے تباہ ہو جانے کا خطرہ بہت زیادہ تھا۔ اس موقع پر اسے جیند اور پٹیالہ کے سکھ راجاؤں کی امداد نے بڑی تقویت پہنچائی۔ ان کی وجہ سے کمک بھی مل گئی، انبالہ اور پانی پت کے درمیان وسائل حمل و نقل بھی محفوظ ہو گیے اور این سن کو انبالہ کی حفاظت کے انتظامات مکمل کر کے آگے بڑھنے کا موقع بھی مل گیا۔

سکھوں کی پوزیشن

جیند، نابھہ اور پٹیالہ کی ریاستیں ایسی جگہ واقع تھیں کہ اگر وہاں کے رئیس ذرا صبر کرتے تو دہلی سے ستلج تک کا علاقہ انگریزوں کے لیے غیر محفوظ ہو جاتا اور انبالہ بھی خطرے میں پڑ جاتا۔ اگر وہ قومی آزادی کی جنگ میں معاون بن جاتے تو انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بکھرے رہتے اور اُن کے لیے اکٹھے ہونے یا آپس میں سلسلہ مخابرت قائم کر لینے کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ یقیناً مارے جاتے اس کے بعد انگریز انگلستان سے بڑی فوج لا کر ہندوستان کو از سرِ نو فتح کرنے کے لیے اگر کوئی قدم اٹھاتے تو یقیناً اس میں کامیاب ہونا آسان نہ ہوتا، لیکن ان سکھ ریاستوں کی انگریز

دوستی اور وطن دشمنی نے صورتِ حال بگاڑ دی۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے مختلف وجوہ بیان کیے جاتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ وہ اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ دہلی از سرِ نو مسلمان بادشاہوں کی تخت گاہ بن جائے۔

۲۔ ان کی مذہبی روایات میں یہ پیش گوئی موجود تھی کہ ایک وقت آئے گا، جب سکھ فرنگیوں کی امداد سے دہلی کو فتح کریں گے۔

۳۔ انگریزوں نے سکھوں کو جھانسہ دیا تھا کہ دہلی کا تخت ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔

افسوسناک طرزِ عمل

ان میں سے ایک بھی وجہ کسی غیور قوم کے لیے باعثِ عزت نہیں سمجھی جا سکتی۔ ہندوستان میں مختلف قومیں آباد تھیں۔ ان میں سے تمام لوگ بہ یک وقت حکمران نہیں بن سکتے تھے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ کسی ایک کو بادشاہ تسلیم کر لیا جاتا۔ چونکہ مغلوں کی حکومت سوا تین سو سال سے چلی آتی تھی اور زیادہ تر لوگ انھیں کے راج پر مطمئن تھے، اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ صرف مسلمان بادشاہ کی مخالفت کے جنون میں سکھ اپنے وطن کو اجنبی محکومی کی زنجیریں پہنانے کے لیے پیش قدمی کرتے۔ پیشگوئی والا افسانہ مضحکہ خیز بھی ہے اور لغو بھی۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس قسم کی ادہام طرازیاں انھیں قوموں کا شیوہ ہیں، جو عزم و ہمّت سے عاری ہو چکی ہوں؛ آخر سکھوں کی پہلی ناکامی کے بارے میں کیوں مذہبی روایات نے کچھ نہ بتایا؟ یہ کیوں نہ بتایا کہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ آپس میں لڑ بھڑ کر فنا ہوں گے اور دلیپ سنگھ سے پنجاب چھن جائے گا؟ یہ کیوں نہ بتایا کہ سکھوں کے مقدر میں اپنی حکومت نہیں بلکہ تنخواہ دار اور مواجب خور کی حیثیت میں انگریزی سلطنت کے استحکام کی خدمت ہے؟ محض اس امر میں سکھوں کے لیے فخر کا کون سا پہلو تھا کہ انگریزوں کو کامیاب بنانے کے لیے دہلی پہنچے،

لوٹ مار یا قتل و غارت کے بعد محکوم بن کر گھروں میں جا بیٹھے اور باقی ملک کو بھی محکوم بنا دیا؛
تیسری وجہ بھی سراسر لغو تھی، جن لوگوں نے چکمہ دیا تھا، بہرحال مختار وہی رہتے تھے
ان کی مختاری کو پختہ کر کے دہلی لے لینے میں اعزاز کی کوئی بات نہ تھی، لیکن بعض دوسرے
طبقوں کی طرح سکھ راجاؤں نے بھی اپنے لیے ایک دردناک ننگ قبول کیا اور اس کی
وجہ سے ملک کو مزید نوّے سال کے لیل و نہار محکومی کی ذلت و نامرادی میں گزارتے پڑے۔

ساورکر کا تبصرہ

ساورکر نے لکھا ہے کہ شاہنشاہ دہلی نے ان ریاستوں کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے، جنھیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا:

ان ریاستوں کو موقع حاصل تھا کہ انقلاب کی بنیادیں مستحکم کر دیتیں یا اسے ختم کر ڈالتیں۔ یہ انبالہ اور دہلی کے درمیان واقع تھیں اور ان کی امداد کے بغیر انگریزوں کا عقب حفاظت سے بالکل محروم تھا۔ اگر یہ ریاستیں خاموش بیٹھی رہتیں، جس طرح کہ دوسری خاموش بیٹھی رہیں تو اس حالت میں بھی انقلاب کی کامیابی کے خاصے امکانات موجود تھے، لیکن جب پٹیالہ، نابھہ اور جیند نے انقلاب پر انگریزوں سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ ضربیں لگانی شروع کیں تو دہلی اور پنجاب کے درمیان تعلقات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان ریاستوں نے شاہنشاہ دہلی کی دعوت ٹھکرا دی۔ جو سول پیغام لے کر آئے تھے، انھیں قتل کر دیا گیا۔ اپنے خزانے انگریزوں پر نثار کیے۔ اپنی فوجیں جمع کیں اور جن علاقوں میں سے انگریزوں کو گزرنا تھا، انھیں بچائے رکھا۔ پھر انگریزوں کے ساتھ ہو کر دہلی پر حملہ کیا۔ جب پنجاب کے انقلابی گھر بار چھوڑ کر قومی جھنڈے کی حفاظت کے لیے دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو گورو گوبند سنگھ کے ان پیروؤں نے انھیں بے دردی سے اذیتیں بھی پہنچائیں اور قتل بھی کیا۔[1]

---

[1] ساورکر ص ۱۱۰۱

ضروری انتظامات

بہرحال ان ریاستوں کی وجہ سے انگریزوں کی پوزیشن بہت بہتر ہوگئی۔ والیٔ پٹیالہ نے اپنے بھائی کو فوج دے کر بھیجا تاکہ تھانیسر والی سڑک کی حفاظت کرے۔ والیٔ جیند نے پانی پت کی چوکی سنبھال لی۔ اس طرح نہ محض دہلی اور انبالہ کی سڑک ہی محفوظ ہوگئی، بلکہ پنجاب سے انگریزوں کا ربط و تعلق بھی بہ دستور استوار رہا اور پنجاب ہی وہ علاقہ تھا جہاں سے دہلی پر کامیاب یورش کے لیے زبردست توپ خانہ اور لشکر بھیجا گیا تھا۔

این سن کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میرٹھ کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کرے۔ اس غرض سے ایک من چلے آدمی کو بھیجنا لازم تھا، جو مشکلات سے بے پروا ہو کر تمام خبریں میرٹھ پہنچائے اور وہاں سے ضروری پیغامات لے آئے۔ یہ کام ہوڈسن نے انجام دیا۔ اسے جنرل این سن نے کرنال بھیج دیا کہ وہاں بے قاعدہ رسالہ بھرتی کرے۔ اسی کو اس رسالے کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ کرنال کے نواب نے بھی انگریزوں کی امداد میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔ حق یہ ہے کہ سکھ راجاؤں نے جو روش اختیار کی تھی، اس کے بعد کسی کے لیے انگریزوں سے موافقت میں تامل کا موقع ہی کب رہا تھا؟

حملے کی تجویز

این سن نے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ تین جیش دہلی پر پیش قدمی کریں۔ ایک انبالہ برگیڈ ۱، دوسرا انبالہ برگیڈ ۲، تیسرا میرٹھ برگیڈ۔ پہلے کا سالار برگیڈیر ہیلی فیکس مقرر ہوا، دوسرے کا برگیڈیر جونز اور تیسرے کا برگیڈیر ولسن۔ پوری فوج میں تین ہزار گورے تھے اور ایک ہزار دیسی سپاہی۔ ان کے ساتھ بائیس میدانی توپیں تھیں۔

انبالہ کے دونوں جیشوں کے لیے لازم قرار دیا گیا تھا کہ ۳۰۔ مئی تک کرنال پہنچ جائیں اور میرٹھ کا جیش باغ پت کے گھاٹ پر دریا کو عبور کرے۔ پھر تینوں جیش مل کر آگے بڑھیں۔ یہ اطلاع میرٹھ پہنچا دی گئی تھی[1]۔

---

[1] فارسٹ جلد اول ص ۹۲۔

این سن کی جگہ برنارڈ

جنرل این سن ۲۴۔ کو انبالہ سے روانہ ہو کر ۲۵ کی صبح کو کرنال پہنچ گیا۔ ۲۶۔ کو وہ ہیضے میں مبتلا ہو گیا۔ ۲۷ کو سر ہنری برنارڈ انبالہ سے کرنال پہنچا تو این سن پر نزع کی حالت طاری تھی۔ برنارڈ کو دیکھتے ہی اس نے پہچان لیا اور کہا:

> برنارڈ! میں فوج کی کمان تمھارے حوالے کرتا ہوں تم اس امر کے گواہ رہو کہ میں اپنا فرض بجا لانے کے لیے کس درجہ مضطرب تھا۔ میں اب بچ نہیں سکتا۔ میری دعا ہے کہ تمھیں کامیابی نصیب ہو۔ خدا تمھیں برکت دے۔ خدا حافظ۔

۲۷۔ کو سوا دو بجے کے بعد دوپہر این سن نے وفات پائی۔ دیکھو یہ کتنا اچھا موقع تھا کہ اوّل انگریزی فوج بہت کم تھی، دوم وہ آگے بھی بڑھتی تو اس کے لیے کامیابی کی کوئی خاص اُمید نہ تھی اور پیش قدمی کے دوران میں انگریز جرنیل وفات پا چکا تھا۔ برنارڈ نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اگرچہ بڑی توپیں نہیں پہنچی تھیں، لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ پیش قدمی جاری رکھی جائے۔

جیش میرٹھ

جیش میرٹھ ۲۷۔ مئی کو روانہ ہوا۔ وہ راتوں کو سفر کرتا تھا۔ تین راتوں کے بعد ۳۰۔ مئی کو غازی آباد پہنچا۔ چونکہ راستے میں اسے کہیں مزاحمت سے سابقہ نہیں پڑا تھا* اس لیے خیال تھا کہ وہ بہ آسانی منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ غنیم نے ایک بلند مقام پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ خبر ملی تو لشکر کو ہتھیار سنبھال لینے کا حکم بھی نہ دیا جا سکا کہ بھاری توپیں آگ برسانے لگیں۔ یہ جنگ ہینڈن ندی کے کنارے شروع ہوئی، جو غازی آباد اور دہلی کے بیچ میں اوّل الذکر سے قریب بہتی ہے۔ اس پر سے گزرنے کے لیے لوہے کا پُل بنا ہوا تھا۔

جنگ ہینڈن

انگریز سالار نے ایک دستہ اس پُل کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔ یہ غنیم کے دائیں جانب تھا اور جنگی نقطہ نگاہ سے اسے کلیدی مقام کی

---

* ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ غازی الدین نگر (غازی آباد) میں بھی اسے مقابلہ پیش آیا تھا (۹۰)

حیثیت حاصل تھی۔ ساتھ ہی ایک دستہ چار توپیں دے کر ندی کے کنارے کنارے دائیں جانب روانہ کر دیا۔

سخت گولہ باری ہوتی رہی۔ انگریزوں نے اعتراف کیا ہے کہ غنیم کے توپ خانے نے بڑا اعلیٰ کام کیا لیکن انگریزی توپ خانہ قدم بہ قدم ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد غنیم نے مراجعت کی اور وہ پانچ توپیں، گولے اور دوسرا ساز و سامان انگریزوں کے قبضے میں چھوڑ گیا۔

دوسرے دن پھر ایک فوج جنگ کے لیے آئی۔ اس مرتبہ بھی توپوں کی آتشبازی کے بعد وہ واپس چلی گئی، لیکن جو توپیں پہلے دن انگریزوں کے قبضے میں رہ گئی تھیں، وہ واپس لے گئی۔

تعجب ہوتا ہے کہ دہلی کی سپاہ تعداد میں خاصی بڑی تھی۔ اس کے پاس سامان بھی خاصا تھا۔ لڑائی کی جگہ بھی اس نے اپنی مرضی سے منتخب کی تھی۔ پھر شدید گرمی کا موسم تھا، جس میں گوروں کے لیے لڑنا سخت مشکلات کا باعث تھا، بایں ہمہ وہ سپاہ واپس چلی گئی یا کہنا چاہیے کہ پسپا ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ وہی بات جو آئندہ بار بار پیش آئے گی کہ کہیں سپہ سالار موزوں نہ تھا اور کہیں سپاہیوں نے باقاعدہ تربیت نہیں پائی تھی۔ ایسی لڑائیاں شاید ہی ہوئیں، جن میں ہندوستانی سپاہ اور ان کے سپہ سالار دونوں بلند حیثیت کے مالک تھے۔

میرزا معین الدین کا بیان

میرزا معین الدین حسن خاں نے لکھا ہے کہ بادشاہ کو میگزین میں سے قریباً ایک لاکھ روپے کی قیمت کے ہتھیار تو مل گئے تھے، لیکن بارود نہ تھی۔ اس کی تیاری کے لیے خاص ہدایت کی گئی۔ بادشاہ کا اصرار شروع ہی سے یہ تھا کہ میرٹھ پر حملہ کیا جائے تاکہ انگریز وہاں سے نکل جائیں۔ لیکن سپاہ لیت و لعل کرتی رہی۔ آخر بہادر شاہ کا پوتا شہزادہ میرزا ابوبکر ۲۵۔ مئی کو فوج لے کر انگریزوں سے لڑنے کے لیے نکلا۔ ہینڈن ندی کے آس پاس مورچے قائم کر لیے گئے۔ اس فوج میں سوار بھی تھے۔ بڑی میدانی توپیں بھی اور چھوٹی توپیں بھی، جو گھوڑوں پر سوار کی جاتی ہیں۔

لڑائی توپوں کی آتشبازی سے شروع ہوئی۔ شہزادے نے ہینڈن کے کنارے پل سے قریب ایک مکان کی چھت اپنے لیے منتخب کر لی تھی اور اس پر کھڑے ہو کر جنگ کا نظارہ کرتا رہا۔ پل سے قریب بھی ایک بیٹری نصب تھی۔ اچانک گوروں کی توپ کا ایک گولہ بیٹری کے قریب پھٹا جس سے توپچی گرد و غبار میں اٹ گئے۔

شہزادے کے لیے گولے کے پھٹنے کا یہ پہلا نظارہ تھا۔ اس پر اتنا اثر ہوا کہ چھت پر سے اترا اور گھوڑے پر سوار ہو کر تیزی سے بھاگ نکلا۔ ہر چند اسے روکا گیا، لیکن نہ ٹھہرا۔ اس سے سراسیمگی پیدا ہو گئی اور سپاہ بھی بھاگ گئی۔ جب دہلی خبر پہنچی کہ سپاہ نے شکست کھائی تو حکم دے دیا گیا کہ دروازے بند کر دیے جائیں تاکہ میدان سے فرار ہونے والی سپاہ باہر ہی رہے۔ افراتفری میں گزرتے وقت پل بھی ٹوٹ گیا اور دو سو سپاہی ڈوب گئے۔
دوسرے دن انگریزی سپاہ نے ہینڈن کو عبور کر کے چھوڑی ہوئی توپوں پر قبضہ کر لیا۔ دہلی کی سپاہ دوبارہ لڑائی کے لیے نکلی اور میدان میں مقابلہ کیا۔ کامیابی کی امید تھی۔ لیکن کچھ نہ بن سکا۔[1] منشی جیون لال نے بھی اس واقعہ کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔[2] اب دیکھیے اگر میرزا ابوبکر ذرا ہمت اور مردانگی سے کام لیتا یا سپہ سالار اعظم کی حیثیت میں فوج کے پیچھے رہتا تو اس کے فرار پر سپاہ میں سراسیمگی پیدا نہ ہوتی۔

فوجوں کا اتصال

دو روز کی جنگ نے جیش میرٹھ کو خاصا مضمحل کر دیا تھا۔ یکم جون کو گورکھا فوج جیش میرٹھ سے آملی۔ یہ کمک بے حد غنیمت معلوم ہوئی۔ ۱۰ اب ولسن کو یہ پریشانی دامن گیر ہوئی کہ کیا کرے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی احکام کے سمجھنے یا پہنچانے میں کچھ غلطی ہو گئی تھی۔ ولسن کا خیال تھا کہ دہلی پر بہ یک وقت دونوں جانب سے حملہ ہو گا، ایک طرف سے برنارڈ کی فوج آگے بڑھے گی اور دوسری طرف خود ولسن جیش میرٹھ کے

---

[1] دو روزنامچے انگریزی ص ۲۱-۲۲ ؎ [2] ایضاً ص ۱۰۸ ؎

ساتھ پیش قدمی کرے گا۔ ۳۔جون کو پھر خبر ملی کہ غنیم کا حملہ ہونے والا ہے۔دفاع کی تیاری کر لی گئی لیکن کوئی فوج نمودار نہ ہوئی۔

۴۔جون کو اطلاع آگئی کہ برنارڈ فوج کے ساتھ علی پور میں خیمہ زن ہو گیا ہے اور عیش میرٹھ کو باغ پت کے گھاٹ سے دریا عبور کر کے ساتھ مل جانا چاہیے۔ ۶جون کو محاصرے کی توپیں بھی آگئیں اور جنرل ولسن بھی بہ اطمینان دریا کو عبور کر گیا۔ اس کے بعد جنرل برنارڈ نے پیش قدمی کا حکم دے دیا۔

اب انگریزی فوج کی حیثیت اس سے کہیں بہتر اور مستحکم تر تھی، جبکہ اس نے انبالہ سے کوچ کیا تھا یا جب این سن کی وفات پر برنارڈ نے کمان سنبھالی تھی۔علی پور سے آگے بڑھتے ہی بادلی کی سرائے میں غنیم سے مڈبھیڑ ہوئی۔

دفاعی انتظامات

یہاں اس حقیقت پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ اگرچہ سپاہیوں کو اچھے جرنیل بہت کم مل سکے، خصوصاً دہلی میں اس جنس کا بے حد قحط تھا، لیکن وہ دفاعی ضروریات سے نہ ناواقف تھے اور نہ غافل۔ میرٹھ کی جانب تو پیش قدمی کرنے کی تجویز خود بہادر شاہ بار بار بہ اصرار پیش کر چکا تھا۔ پھر جب معلوم ہوا کہ گورا سپاہ غازی آباد پہنچی ہوئی ہے یا پہنچنے والی ہے تو مدافعت کے لیے فوج گئی بلکہ بعد میں بھی پورشوں کا سروسامان ہوتا رہا۔ انبالہ کی سمت سے بھی انگریزوں کی یورش کا قوی اندیشہ تھا۔ جب پٹیالہ، جیند اور نابھہ نے قوم وملک کا ساتھ چھوڑ کر انگریزوں سے رشتہ جوڑ لیا تو یقین ہو چکا تھا کہ ادھر سے ضرور حملہ ہو گا۔ انگریزی پیش قدمی کی خبریں بھی ملتی رہتی ہوں گی، لہٰذا سپاہ دہلی کی طرف سے بادلی کی سرائے میں مدافعت کے انتظامات کر لیے گئے تھے۔ یہ مقام شہر دہلی سے کوئی آٹھ میل پر ہو گا۔

فارسٹ لکھتا ہے کہ سپاہ دہلی نے اس مقام پر حفظ و دماغ کے جو انتظامات کیے تھے، وہ پیش قدمی کرنے والی بڑی فوج کے مقابلے میں یقیناً موثر ہوتے۔ سرائے

ان کے قبضے میں تھی۔ یہ کرنال، پانی پت اور علی پور سے دہلی جانے والی سڑک کے بائیں جانب واقع تھی۔ سرائے کی چار دیواری حصار کا کام دیتی تھی اور اس کا دروازہ بہت مستحکم تھا۔ اس کے ارد گرد کیمپ تھا۔ سرائے کے سامنے سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ایک اونچی جگہ تھی۔ اس پر ریت کے بورے رکھ کر مورچہ قائم کر لیا گیا تھا، جس میں چار بھاری توپیں اور ایک مارٹر[1] رکھ دی گئی تھی۔ گویا سرائے اور بادلی گاؤں کے درمیان جو سڑک کے دائیں جانب تھا، ایسے استحکامات کر لیے گئے تھے کہ انگریزی فوج کے لیے گزرنا بہت مشکل تھا۔ سڑک کے دونوں طرف بہت سے کھالے تھے، جن کی وجہ سے زمین صاف و ہموار نہیں رہی تھی، بلکہ خاصی دلدلی بن گئی تھی۔ گاؤں سے بھی آگے مغربی جانب میل بھر یا اس سے کم فاصلے پر جمنا کی غربی نہر بہہ رہی تھی، جس پر گزرنے کے لیے جا بجا پُل بنے ہوئے تھے۔

بادلی کی سرائے کا معرکہ

انگریز سالار نے اپنی سکیم کے مطابق ایک جیش کو سڑک سے دائیں جانب اور دوسرے کو بائیں جانب بھیج دیا تاکہ وہ چکر کاٹ کر غنیم کے عقب میں پہنچ جائیں، پھر خود براہ راست حملہ کیا۔ مجاہدین نے بڑی مردانگی سے جنگ شروع کی، لیکن انگریزوں کے پاس زیادہ بھاری توپیں تھیں، جن کا جواب وہ نہ دے سکے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں ان کی توپوں کا مورچہ اور سرائے انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔ فارسٹ نے سرائے کی جنگ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ نہایت تیز و شدید تھی مگر صرف تھوڑی دیر جاری رہی۔ سپاہی مردانہ وار لڑے اور گوروں نے سنگینیں مار مار کر انھیں ختم کر دیا۔[2] اگرچہ اس وقت تک بھی انگریزی فوج کی وضعیت خاصی پریشان کن تھی، اس لیے

---

[1] مارٹر چوڑے منہ والی چھوٹی سی توپ ہوتی ہے، جس کا گولہ بہت بھاری ہوتا ہے۔

[2] ڈاکٹر سین کے بیان کے مطابق اس لڑائی میں انگریزوں نے مجاہدین سے چھبیس توپیں بھی چھین لیں (۹۷)

کہ جو جیش دائیں اور بائیں جانب سے پیچھے گیے تھے، وہ نمودار نہیں ہوئے تھے، اچانک وہ بہ یک وقت سامنے آ گئے۔ یوں دائیں، بائیں اور سامنے کے حملے نے مجاہدین کو منتشر ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ لڑائی ۸۔ جون کو ہوئی۔

پیش قدمی

لڑائی میں اگرچہ انگریزی فوج تھک کر چُور ہو گئی تھی، لیکن برنارڈ نے ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر تھوڑی سی بھی مہلت دے دی گئی تو مجاہدین پھر اکٹھے ہو کر حملہ آور ہو جائیں گے اور دہلی کی طرف بڑھنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے فوج کے دو حصے کر لیے۔ خود ایک حصے کو لے کر پہاڑی کی جانب اس مقام کی طرف بڑھا جہاں انگریزی چھاؤنی تھی اور دوسرے حصے کو ولسن کی سرکردگی میں پہاڑی کے غربی گوشے کی طرف سبزی منڈی کی جانب بھیجا۔ مقصود یہ تھا کہ اردگرد کے تمام مقامات کو مزاحمت سے پاک کر کے محاصرہ کا بندوبست کر لیا جائے، پھر سوچا جائے کہ شہر میں داخلے کی کیا کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔

باب ۴

شہر کا محاصرہ

گورہ فوج کا مقام

گورا فوج شہر دہلی کے شمالی حصے میں مقیم ہوئی تھی اور اس کی زد براہ راست کشمیری دروازے، موری دروازے اور کابلی دروازے پر پڑتی تھی، اگرچہ اثر لاہوری دروازے تک جاتا تھا۔ اب سب سے پہلے اس مقام کی مختصر سی کیفیت ذہن نشین کر لینی چاہیے تاکہ آیندہ واقعات کے سمجھنے میں سہولت رہے۔

دہلی سے کوئی دو اڑھائی میل کے فاصلے پر شمالی جانب دو میل کے قریب ایک لمبی پہاڑی واقع ہے، جس کی اونچائی ساٹھ فٹ کے قریب ہوگی۔ اس پہاڑی کے عقب میں انگریزی چھاؤنی تھی۔ اس مقام پر شہر کی طرف سے حملوں کا بھی خطرہ تھا اور یہ خطرہ بھی تھا کہ دائیں جانب کے مورچوں کو توڑ کر سپاہی آگے بڑھیں گے تو انبالہ اور پنجاب سے گورا فوج کا تعلق منقطع ہو جائے گا۔ اسے محفوظ رکھنے کے لیے برنارڈ نے بڑے پختہ انتظامات کر لیے تھے۔

حفاظتی انتظامات

پرانی چھاؤنی کے ارد گرد گورا فوج کا کیمپ تھا۔ جس مقام پر آج کل فتح کی یادگار میں مینار بنا ہوا ہے، وہاں توپوں کا ایک مورچہ تھا، یعنی سینے کے برابر تک دیوار بنا کر توپیں رکھی گئی تھیں تاکہ توپیں اور توپچی غنیم کی گولہ باری سے حتی الامکان محفوظ رہیں۔ یہ مورچہ شہر کی فصیل سے کوئی بارہ سو گز کے فاصلے پر ہوگا۔ اس کے شمالی جانب پہاڑ کی ڈھلان میں مارٹر توپیں نصب تھیں۔ ان توپوں سے ذرا پیچھے ہٹ کر ہندو

راؤ کا مکان تھا۔ یہ دراصل سنگین کوٹھی تھی اور اس کے باہر مضبوط دیوار بنی ہوئی تھی۔ ہندو راؤ گھوڑکے گوالیار کی مشہور رانی بیجا بائی کا بھائی تھا اور یہ مکان پہاڑی کے جنوبی و مغربی حصے میں تھا۔ اس کے سامنے بھی توپوں کا ایک مورچہ تھا۔ اس سے شمالی سمت میں جہاں غالباً یعنی رصدگاہ اور اس سے ذرا آگے پٹھانوں کے عہد کی ایک مضبوط و مستحکم مسجد تھی، جس کا نام غالباً چوبرجی مسجد مشہور تھا۔ اس سے ذرا آگے باوٹر یعنی فلیگ سٹاف تھا۔ وہاں پیادوں کی ایک چوکی قائم کردی گئی تھی اور اس کے ساتھ دو توپیں تھیں۔

غرض اس جگہ کو محفوظ کر دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی گئی، لیکن جنوبی و مغربی سمت یقیناً کمزور تھی، اس حصے میں پہاڑی کے ختم ہوتے ہی جرنیلی سڑک واقع تھی۔ توپوں کے پہلے بڑے مورچے کے عقب میں سبزی منڈی اور اس کے ملحقات تھے، یعنی مکانوں اور درختوں کے جھنڈ جن کی اوٹ میں سے ہو کر کسی وقت بھی یورش کی جا سکتی تھی۔ ذرا آگے بڑھ کر پھر پہاڑی اوپر اُٹھ آئی تھی، جس پر عیدگاہ بنی ہوئی تھی۔ دونوں کے بیچ میں جو ہموار جگہ تھی، وہاں کشن گنج اور پہاڑی پور کی آبادی تھی۔

چھاؤنی والی پہاڑی اور شہر کے درمیان بھی بہت سی پرانی عمارتیں، درختوں کے جھنڈ اور باغات تھے۔ ان کی اوٹ میں سے بھی ہو کر مجاہدین کے لیے حملہ مشکل نہ تھا۔

شہر کی کیفیت

شہر کے اردگرد فصیل تھی، جس کی لمبائی سات میل سے کم نہ ہو گی اور اونچائی کم از کم چوبیس فٹ تھی۔ یہ بڑی چوڑی اور مستحکم تھی اور اس میں بہت سے برج اور گرگج بنے ہوئے تھے، جن میں سے ہر ایک پر بارہ بارہ چودہ چودہ توپیں رکھی جا سکتی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ باہر کی طرف خاصی چوڑی اور تقریباً چوبیس فٹ گہری خندق تھی۔ شہر کے مشرقی حصے کے ساتھ ساتھ دریا بہتا تھا اور اس طرف سے حملہ ممکن نہ تھا، باقی تین طرفوں میں سے صرف شمالی یا ایک حد تک مغربی سمت ہی پر انگریز دباؤ ڈال سکتے تھے۔

جنوبی سمت ان کی دسترس سے بالکل باہر تھی۔ اسی طرح مغربی سمت کے بڑے حصّے کے خلاف بھی وہ کوئی اقدام نہیں کر سکتے تھے۔

جدال و قتال کا آغاز ۹ جون کو انگریزوں نے دہلی کے سامنے پہنچ کر اپنے مورچے قائم کیے اسی دن وہ کمکی فوج دہلی پہنچ گئی، جس نے مردان اور یوسف زئی سے پانسو اسی میل کا فاصلہ بائیس دن میں طے کیا تھا۔ اسی روز مجاہدین نے شہر سے نکل کر ہندو راؤ کی کوٹھی پر نہایت تیز و تند حملہ کیا اور دست بہ دست لڑائی کی نوبت بھی آئی۔ بعد ازاں مجاہدین واپس چلے گئے۔ گوروں نے فصیل تک ان کا تعاقب کیا۔

دہلی میں آزاد حکومت قائم ہونے کے بعد انگریزوں کی کامیابی تک چار مہینے کی مدت میں کتنی لڑائیاں ہوئیں؟ اس سوال کا صحیح جواب دینا مشکل ہے، اس لیے کہ تعداد میں نمایاں اختلاف ہے۔ بعض اصحاب نے صرف بڑی بڑی لڑائیاں شمار کی ہیں، بعض نے تمام چھوٹی بڑی جھڑپیں گن لی ہیں۔ سید ظہیر دہلوی کے نزدیک کل سات لڑائیاں ہوئیں۔ ان میں ہنڈن ندی کی لڑائی بھی شامل ہے اور بادلی کی سرائے کا معرکہ بھی، جسے سید مرحوم علی پور کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ لڑائیوں کی تفصیلات اور بعض کی تاریخوں کے باب میں بھی انھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وجہ یہ کہ خود ناظر و شاہد نہ تھے، شہر کے اندر بیٹھے بیٹھے جو کچھ سن لیا تھا، لکھ دیا۔ غالباً مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے کل لڑائیاں بہتّر یا تہتّر بتائی ہیں اور یہ بیان زیادہ قرینِ صحت ہے انگریزوں نے دورانِ محاصرہ میں جن لڑائیوں یا یورشوں کا ذکر کیا ہے، ان کی صحیح تعداد میں متعیّن نہ کر سکا، لیکن بیس کے لگ بھگ ضرور ہے۔ دو تین زیادہ ہی ہوں گی، کم نہ ہوں گی۔

اچانک حملے کا مسئلہ جو انگریز شہر سے دُور بیٹھے تھے، ان کی رائے تھی کہ شہر پر فوراً حملہ ہونا چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ حملے کے ساتھ قومی قوت مضمحل ہو جائے گی۔ پھر سب کچھ سنبھال لینا مشکل نہ ہوگا لیکن جو لوگ موقع پر موجود تھے، وہ ہر شے کو حربی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس نقطۂ نگاہ سے فوری اور اچانک حملہ کامیابی کی مبالغہ آمیز

توقعات کے باوجود خلاف دانش و تدبیر تھا، اس لیے کہ اوّل شکست کی حالت میں کوئی ایسی محفوظ فوج موجود نہ تھی، جس کا سہارا لے کر شکست کے مضر اثرات سے بچاؤ کا بندوبست کیا جا سکتا۔ دوسرے شہر پر قبضہ کر لینے کے ممکنات سامنے رکھتے ہوئے بھی یہ امید نہ تھی، کہ قبضہ بحال رکھا جا سکے گا۔

برنارڈ کا بیان

چنانچہ حملے کے متعلق انگریز افسروں میں ابتدائی مشورہ ہو چکا تو اگرچہ اس تجویز کو رد کیا گیا، تاہم سپہ سالار برنارڈ کا خیال تھا کہ باہر بیٹھے ہوئے لوگ مجاہدین کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس نے ۱۳۔ جون کو لارڈ کیننگ کے نام جو خط لکھا، اس میں صاف صاف بتا دیا۔

> شہر اس درجہ مستحکم اور میرے وسائل اس حد تک ناکافی ہیں کہ حملہ یا باقاعدگی کے ساتھ شہر کے قریب پہنچنا یکساں مشکل بلکہ کہنا چاہیے غیر ممکن ہے اور میرے لیے اس کے سوا راستہ بھی نہیں کہ سب کچھ اس داؤ پر لگاتے ہوئے یورش کر دوں۔ اسی کا میں مصمم ارادہ کیے بیٹھا ہوں۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن شکست مہلک ہو گی، اس لیے کہ میرے پاس محفوظ فوج نہیں، جس کے سہارے پر پیچھے ہٹوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں نے حد عرلی کی مشکلات کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ یہاں ہر دروازے اور آس پاس کے گرجوں پر چوبیس چوبیس پونڈ کے گولے پھینکنے والی توپیں چڑھی ہوئی ہیں اور توپچی ان کے چلانے میں خوب مشاق ہیں۔ ان میں اور ہم میں پانچ اور ایک کا فرق ہے۔ ہم نے صرف چھ بھاری توپیں مقابلے پر نصب کر رکھی ہیں اور ہماری توپیں غنیم کی توپوں کو بند نہیں کر سکتیں[1]

---

[1] کیٹی جلد دوم ص ۳۹۸۔ ۳۹۹ ٭

حملے کی سکیم

حملے کی جو سکیم خاصے غور و فکر کے بعد تیار ہوئی۔ یہ تھی کہ کابلی دروازے اور لاہوری دروازے کے آس پاس بارود کے بورے رکھ کر انھیں اڑا دیا جائے۔ مدافعین کی توجہ اس طرف ہو جائے تو کشمیری دروازے پر حملہ کیا جائے اور اسے توڑ کر شہر میں داخلے کا انتظام کر لیا جائے۔ اس کے بعد فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کر کے پیش قدمی کی جائے۔ دو دستے دائیں اور بائیں جانب سے فصیل کے ساتھ ساتھ بڑھیں اور تمام برجوں، گرگوں دروازوں اور توپوں کو قبضے میں لے لیں۔ باقی دستے شہر کے بڑے بازاروں میں سے قلعے کی جانب جائیں۔ اس طرح یا تو مدافعین شہر سے باہر نکل جائیں گے یا قلعے میں جمع ہو جائیں گے، پھر انھیں ختم کرنا آسان ہوگا۔

بلاشبہ برنارڈ کے پاس فوج بہت کم تھی اور حملے کی صورت میں خطرے زیادہ تھے، مثلاً ایک نہایت زبردست خطرہ یہ تھا کہ مدافعین شہر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ تو اجتماعی صورت میں انگریزی کیمپ پر ہلہ بول دیں گے۔ وہاں دفاع کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس طرح انگریزی فوج ہر طرف سے منقطع ہو کر شہر میں محصور ہو جائے گی لیکن مختلف اہلِ نظر یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اگر حملے میں تاخیر ہوئی اور شہر جلد فتح نہ ہُوا تو باہر سے مزید ساز و سامان اور فوجیں آتی جائیں گی اور مدافعین کی قوت میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جائے گا۔

دوسری جنگی کونسل

غالباً ۱۶۔ جون کو دوسری مرتبہ جنگی کونسل منعقد کی گئی۔ اس میں بعض افسروں نے یہ رائے ظاہر کی کہ تاخیر کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ مثلاً گریٹ ہیڈ[1] کا اصرار تھا کہ تاخیر نہ کی جائے۔ دو ہفتے کی دیر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امیدیں ٹوٹ جائیں گی اور ملک میں فسادات پھیل جائیں گے۔ احاطہ بمبئی کے مسلمان پہلے ہی مضطرب ہیں، ان کے اضطراب میں اضافہ ہو جائے گا اور ہمارے دیسی حلیفوں کے دل میں بے اعتمادی کا بیج بویا جائے گا۔[2] اکثریت کو اس

---

[1] GREAT HEAD [2] کیی جلد دوم ص ۴۰۰

رائے سے اختلاف تھا۔ مثلاً ولسن نے کہا،

شہر ایک میل چوڑا اور کشمیری دروازے سے ... دروازے تک دو میل لمبا ہے۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد شبے کا میابی اور ناکامی دونوں سے سخت خوف لگتا ہے۔ ہماری چھوٹی سی فوج جو صرف دو ہزار بندوقچیوں پر مشتمل ہے۔ شہر کی وسعت میں گُم ہو جائے گی اور باغیوں نے ہمارے مورچوں پر مسلسل اور ہمت ورانہ حملوں سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ آڑ میں بیٹھ کر کس خوبی سے لڑ سکتے ہیں اور کس طرح لڑیں گے۔ شہر پر حملے کی صورت میں گلیوں کے اندر انھیں جگہ جگہ آڑ مل جائے گی۔ اس وقت ہر باغی سپاہی ہر فرنگی کے برابر ہوگا۔ انھوں نے بھاری توپیں فصیل پر چڑھا رکھی ہیں (تیس سے چالیس تک) دروازوں پر حملے کی صورت میں بھی ہمیں سخت نقصان کے لیے تیار رہنا چاہیے، اس لیے کہ ان کی توپیں فصیل کے آس پاس سات آٹھ سو گز کے رقبے میں خوب گراب چلا سکیں گی۔

اس کے بعد کہا کہ سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی حملہ مناسب نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تاخیر کی صورت میں دیسی رؤسا ہمارے سرگرم حامی نہ رہیں گے۔

لیکن انھوں نے اب تک ہمارے لیے کیا کیا ہے؟ گوالیار اور بھرت پور کی فوجوں نے مدت سے ایسی روش اختیار کر رکھی ہے کہ ہمارے لیے اپنے وسائل کی بنا پر یورش کے بغیر چارہ نہیں رہا۔ جے پور کی فوج سے بھی ہمیں اس وقت تک کوئی خاص امید نہ رکھنی چاہیے جب تک ہم باغیوں پر پوری فتح حاصل نہ کر لیں[1]۔

---

[1] کیئی جلد دوم ص ۴۱ - ۴۴۳۔

۳۔ جولائی

جب برنارڈ کے پاس مزید کمک پہنچ گئی، نیویل چیمبرلین اور ہیرڈ سمتھ بھی آ گئے، جو فوج میں نامور مانے جاتے تھے تو پھر شہر پر حملے کی تجویز زیرِ غور آئی بلکہ ایک نقشہ بھی تیار کر لیا گیا۔ عین اس موقع پر اطلاع ملی کہ روہیل کھنڈ سے بخت خاں کے ساتھ جو فوج دہلی پہنچی ہے، وہ انگریزی چوکیوں پر زبردست حملہ کرنے والی ہے۔ برنارڈ نے خود لکھا ہے، یہ حملہ اوّل اس لیے ملتوی کرنا پڑا کہ خود ہم پر اسی روز بھاری فوج سے حملہ ہونے والا ہے۔ دوسرے چارلس نکلسن[1] کی رجمنٹ میں سخت بے چینی پھیل گئی اور پوری رجمنٹ سے ہتھیار رکھوا لینے پڑے، نیز دو آدمیوں کو پھانسی بھی دے دی گئی[2] ایک اور رجمنٹ میں بھی بے چینی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ناقابلِ اعتماد آدمیوں کو نہ حملے کے دوران میں ساتھ لیا جا سکتا تھا اور نہ پیچھے کیمپ کی حفاظت کے لیے چھوڑا جا سکتا تھا۔

مدافعین کی یورشیں

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مدافعین نے محاصرہ کے دوران میں یورشوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ مثلاً ۹۔ جون کے حملے کے بعد ۱۰۔ جون کو انھوں نے اجمیری دروازے سے نکل کر انگریزی لشکر کے عقب میں حملے کی کوشش کی۔ ۱۲۔ جون کو انگریزی فوج کے میسرے پر نہایت سخت یورش کی۔ ۱۷۔ جون کو انگریزوں نے مٹکاف ہاؤس پر قبضہ کر کے وہاں چوکی بٹھا دی۔ اسی دن معلوم ہوا کہ سامنے کی پہاڑی پر عیدگاہ میں کچھ سرگرمیاں جاری ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجاہدین وہاں توپیں جما کر انگریزی لشکر گاہ کو نشانہ آتش بازی بنانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو انگریزوں کی حالت بے حد نازک ہو جاتی۔ ان پر جوابی حملہ کیا گیا اور عیدگاہ سے نکال دیا گیا۔ ۲۳۔ جون کو جنگ پلاسی کی سوبرس سالگرہ تھی، اس روز بڑا ہی سخت حملہ ہوا۔

---

[1] یہ شخص جان نکلسن کا بھائی تھا۔

[2] کیئی جلد دوم ص ۲۴۹ حاشیہ برنارڈ کا خط لارنس کے نام۔

بخت خاں کی فوج یکم یا ۲- جولائی کو دہلی پہنچی تھی۔ کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا تھا کہ انگریزی فوج میں سے زخمیوں کا ایک قافلہ انبالہ جا رہا ہے اور فیروز پور سے خزانہ و رسد لے کر ایک قافلہ پہنچ رہا ہے۔ اسے روکنے کے لیے ۳- جولائی اور ۴- جولائی کی درمیانی شب میں بخت خاں چار پانچ ہزار آدمی لے کر نکلا اور رات کی تاریکی میں علی پور کی طرف بڑھا ۴- جولائی کی صبح کو اس کا سراغ ملا۔ کوئی خاص لڑائی تو نہ ہوئی۔ بخت خاں کچھ سامان لے کر واپس آ گیا۔ فریقین کو معمولی نقصان پہنچا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز عقب کے دفاع کے متعلق بہت پریشان ہو گئے انھوں نے نجف گڑھ والی نہر کے تمام پل تڑوا دیے، صرف ایک باقی چھوڑا جو ان کی لشکرگاہ سے قریب تھا۔[1]

اسی طرح جولائی اور اگست میں یورشیں ہوئیں، کبھی ہندو راؤ کے مکان پر اور کبھی دوسرے مقامات پر۔ ۲۳ جولائی کو مجاہدین نے لدلو کیسل پر قبضہ کر لیا اور ۸- ستمبر تک یہ مقام انھیں کے قبضہ میں رہا۔ اس وجہ سے انگریزوں کو بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ اس مقام سے مٹکاف ہاؤس کی پکٹ پر سخت گولہ باری کی جاتی تھی۔

یکم اگست کو بقر عید تھی۔ نماز کے بعد مجاہدین نے "ذبح عظیم" کا اہتمام کیا کہ خود بھی راہ حق میں جانیں دیں اور دشمن کو بھی تا بہ حد امکان نقصان پہنچایا۔ ان کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ ۷- اگست کو کسی وجہ سے بارود خانے میں آگ لگ گئی۔ اس کے بعد یورشوں کا زور کم ہو گیا۔ بہ ظاہر یہ بارود کی کمی کا نتیجہ تھا۔

بارود خانے کی تباہی

سید ظہیر دہلوی نے لکھا ہے کہ بارود خانہ چوڑی والوں کے محلے میں سمرو بیگم کی حویلی میں تھا۔ وہاں سات سو آدمی کام کرتے تھے اور روزانہ سات سو من بارود تیار ہوتی تھی۔ ۷- اگست کو تین بجے بعد دوپہر آگ لگی

---

[1] کیئی جلد دوم ص ۴۲۵ - ۴۲۷

اور ایسا دھماکا ہوا جیسے ایک سو توپیں ایک دم چلیں۔ سب کا رگن اڑ گئے۔

عزیز الدین خاں، احسن اللہ خاں کے بھانجے گھبرائے ہوئے منتشر الحواس دوڑتے ہوئے آئے اور ان کے ہمراہ ان کے گھر کی سواریاں تھیں۔ خیر سواریاں تو گھر میں اتروالیں اور ان سے تفتیش حال کی کہ خیر باشد، کیا معاملہ ہے ؟ انھوں نے بیان کیا کہ ادھر تو میگزین اڑا، اُدھر پوربیے حکیم جی (حکیم احسن اللہ خاں) کے گھر پر چڑھ گئے کہ حکیم جی انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں۔ انھوں نے میگزین اڑا دیا[1]

یہ الزام درست ہو یا نہ ہو لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ شہر میں انگریزوں سے ساز باز رکھنے والے آدمی موجود تھے اور حکیم جی کے خلاف شبہ بالکل بے بنیاد نہ تھا۔

دہلی سے مراجعت کا مسئلہ

این سن کی طرح برنارڈ بھی ۴۔ جولائی کو ہیضے سے انتقال کر گیا۔ اس کی جگہ ریڈ مقرر ہوا۔ وہ صرف بارہ تیرہ دن کام کرنے کے بعد بیماریوں کے ہجوم کے باعث استعفیٰ پر مجبور ہو گیا۔ اور ۱۷۔ جولائی کو آرچ ڈیل ولسن نے سالاری کا عہدہ سنبھالا۔

اس اثنا میں حملے کے بجائے یہ سوال سامنے آ گیا تھا کہ اتنی بڑی فوج کو کیوں اور کب تک شہر دہلی کے سامنے روک رکھا جائے اور کیوں محاصرہ چھوڑ کر دوسرے حصوں کی تسخیر کا انتظام نہ کیا جائے؟ ادھر سے فراغت کے بعد دہلی کا فیصلہ بہت سہل ہو گا۔ جو فوجی افسر پہلے دفعتاً حملہ کر کے شہر کے لینے پر زور دے رہے تھے، ان میں سے بھی اکثر کی رائے یہی ہو گئی تھی کہ محاصرے سے عارضی طور پر دستبردار ہو جانا بہتر ہو گا۔ البتہ بیرڈ سمتھ نے اس تجویز

---

[1] داستانِ غدر ص ۱۰۵-۱۰۶ مرتبہ۔ اس سے پیشتر بھی حکیم صاحب اور محبوب علی خاں خواجہ سرا پر یہ الزام لگا تھا کہ وہ بارود انگریزوں کو بھجوانے کی فکر میں ہیں۔ (دو خفیہ روزنامچے انگریزی ص ۱۰۷)

کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ اگر ہم واپس ہوئے تو پورے ملک میں شور مچ جائے گا کہ ہم نے شکست کھائی ہے۔ اگر ہم بیٹھے رہے تو ہماری وجہ سے پنجاب کی حفاظت ہوتی رہے گی۔ پنجاب کے ساتھ حمل و نقل کے وسائل محفوظ رہیں گے۔ سرکشوں کی بہت بڑی قوت دہلی میں مجتمع رہے گی۔ اگر ہم پیچھے ہٹ گئے تو وہ لوگ مطمئن ہو کر ملک کے ہر حصے میں پھیل جائیں گے اور ہماری غیر محفوظ چوکیوں پر حملے شروع کر دیں گے۔[1]

جنگ نجف گڑھ

محاصرے کے دوران کا آخری بڑا معرکہ نجف گڑھ میں ۲۵ اگست کو پیش آیا۔ نکلسن ۷ اگست کو دہلی پہنچا تھا۔ پھر وہ اپنے متحرک کالم کو لینے کے لیے واپس گیا، جو اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ کالم کے پہنچ جانے کے بعد شہر پر حملے کے لیے تیاریاں ہوتی رہیں۔ فیروز پور سے بڑی توپیں منگوائی گئی تھیں۔ مدافعین کو بھی اس بات کا علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۲۴ اگست کو ان کی ایک فوج اٹھارہ توپوں کے ساتھ محاصرے کی توپوں پر قبضہ جمانے کے لیے نکلی۔ اس میں دو مختلف فوجوں کے منتخب آدمی شامل تھے، ایک بریلی کی فوج، دوسری نیمچ کی فوج۔ یہ فوج پہلے روز پالم پہنچی دوسرے روز اس کا ایک حصہ جو نیمچ کے فوجیوں پر مشتمل تھا، نجف گڑھ چلا گیا۔ اگر اسے موقع مل جاتا تو یقیناً محاصرے کی توپیں انگریزوں کے پاس نہ پہنچ سکتیں۔

نکلسن کو اس فوج کی روک تھام اور محاصرے کی توپوں کے بچاؤ کی غرض سے بھیجا گیا۔ وہ پہلے نانگلوئی گیا، جو دہلی سے نو میل پر تھا، پھر تفصیلات معلوم کر کے دوسرے دن چار بجے کے قریب نجف گڑھ پہنچ گیا۔ غنیم نے انگریزی فوج کی پیش قدمی کے راستے سے بائیں جانب دو میل میں مورچے قائم کر رکھے تھے۔ نکلسن نے اسی وقت حملہ کیا اور رات ہونے سے پیشتر بڑے حصے کو شکست دی۔ وہ خود لکھتا ہے کہ بریلی کی فوج اس جنگ میں شامل نہ ہوئی بلکہ پالم

---

[1] کیئی جلد دوم ص ۴۴۳۔ ۴۴۵۔

ہی میں بیٹھی رہی۔ اگر میرے پاس پوری خبریں فراہم کرنے والا کوئی آدمی ہوتا اور وقت پر اطلاع مل جاتی تو میں اگلے دن یعنی ۲۶ - کو پالم پہنچ جاتا اور رہریلی کی فوج کو بھی برباد کر ڈالتا۔[1]

بہرحال اس طرح محاصرے کی توپوں کا راستہ محفوظ ہو گیا۔ اس سے دو روز پیشتر ہوڈسن نے اپنے بے قاعدہ رسالے کے ساتھ رہتک کی طرف پیش قدمی کر کے بشارت خاں رسالدار کے سواروں کو کھرکھودہ میں شکست دی۔ پھر آگے بڑھ کر رانگھڑوں کے سردار بر خاں پر حملہ کیا،[2] یہ تمام یورشیں اس غرض سے کی گئیں کہ خطوط حمل و نقل محفوظ رہیں اور دہلی کی طرف آنے والی کمک یا رسد یا ساز و سامان جنگ کو نقصان نہ پہنچے۔

---

[1] کیی جلد دوم ص ۴۹۳

[2] ذکاء اللہ ص ۶۲۰

باب ۵

بہادر شاہی حکومت کا نقشہ

چار مہینے اور چار دن

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شہر پر انگریزوں کے آخری حملے اور تسخیر سے پیشتر چار مہینے، چار دن کی آزاد شاہی حکومت کا سرسری نقشہ پیش کر دیا جائے۔ اس نقشے کو نہ مکمل سمجھا جا سکتا ہے اور نہ چار ماہ چار دن کے اضطراب انگیز دور میں مستقل نقشۂ نظم تیار کر کے نافذ کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں صاف صاف کہنا چاہیے کہ جو کچھ بھی ہمارے سامنے آیا ہے، وہ چنداں خوشگوار نہیں، اس لیے کہ اسے سامنے رکھ کر دل پر یہ اثر نہیں پڑتا کہ ارباب اختیار کے دل و دماغ کو نظم و ترتیب سے کوئی مناسبت تھی یا وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے تھے یا انھیں خیال تھا کہ عوام کو انگریزی دور کے مقابلے میں زیادہ آرام پہنچائیں یا اتفاق کی بنا پر انگریزی دور سے نجات کی جو صورت پیدا ہو گئی تھی اس میں استقلال و استحکام پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے اسباب وہی تھے جن کی طرف پہلے بارہا اشارے کیے جا چکے ہیں، یعنی بہادر شاہ اپنی عمر اور ضعف قویٰ کے باعث اس منصب کی ذمہ داریوں کو پورا ہی نہ کر سکتا تھا، جو اسے مل گیا تھا اور مغل شہزادوں میں سے ایک بھی صاحب جوہر نہ تھا، لیکن بادشاہ کے فرزند یا قریبی ہونے کے باعث وہ ہر شے میں تقدم و سبقت کے حق دار بن گئے تھے۔ پھر یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ وقت کے حالات کی بنا پر نہایت اعلیٰ صلاحیتوں کے کارفرماؤں کی ضرورت تھی اور یہاں چند قدم آگے دیکھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ بادشاہ ضعف کے علاوہ شہزادوں کے زور اور بیگم کے غلط مشوروں کے زیر اثر دب گیا تھا۔ شہزادے اگرچہ

شے پر قبضہ کر لینے کے حریص تھے، مگر حرص کے سوا ان میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔

سپاہیوں کی حالت

سپاہیوں کی حالت بڑی عجیب تھی۔ وہ انگریز افسروں کو قتل کر کے آئے تھے اور ابتدا میں ان کے خیالات خواہ کچھ ہوں لیکن ان کے دماغوں اور دلوں میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ وہ حقیقی قوت و طاقت کے مالک ہیں، جسے چاہیں بادشاہ بنا دیں۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ تلنگے بعض اوقات کہتے تھے، ہمیں ہم جائیں کے سر پہ ہنڈا رکھ دیئی، وہی باس سا ہو جائی (بھائی، ہم جس شخص کے سر پر جو تار رکھ دیں، وہی بادشاہ ہو جائے) یہ قول غیر اغلب نہیں۔ خود بادشاہ نے اپنے بیان میں لکھا کہ سپاہی مجھے تخت سے اتار کر میرزا مغل بیگ کو بادشاہ بنانے کے لیے تیار تھے۔[۱] بعض بیانات میں بتایا گیا ہے کہ میرزا مغل نہیں بلکہ میرزا ابوبکر کو بادشاہ بناتے تھے۔[۲] چنانچہ تلنگوں کا یہ قول بھی منقول ہوا ہے: بڑھو ساسر کے گولی مار دو، دوسرے مئی کو باس سا کر دی جائی (بوڑھے یعنی بادشاہ کو گولی مار دو اور دوسرے کو بادشاہ بنا لو)۔[۳]

سید ظہیر دہلوی نے بھی لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک پوربیا فربہ اندام، ادھیڑ، پچاس پچپن کی عمر کا، منہ پر داڑھی، گاڑھے کا کرتا، دھوتی بندھی ہوئی، سر پر ایک انگوچھا لپٹا ہوا، چندیا نکلی ہوئی آیا اور بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا: "سنو بڑھیو ہم نے تمھیں باس ساکیا۔"[۴] (سنو بڑے میاں ہم نے تمھیں بادشاہ بنایا)

ان میں سے کوئی بھی امر تعجب انگیز نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان حالات میں نظم و نسق کیوں کر پختگی، پائیداری اور استحکام اختیار کر سکتا تھا؟ انتظام کرنے والوں کی کمزوری عوام پر واضح تھی۔ اور عوام کی سینہ زوری انتظام کرنے والوں کو معلوم تھی۔

---

[۱] مقدمہ بہادر شاہ مرتبہ گیریٹ ص ۶۲۹۔ [۲] ذکاء اللہ ص ۶۸۳۔ [۳] یہ اور پہلا قول واقعات دارالحکومت دہلی جلد اوّل ص ۶۹۱۔ [۴] داستان غدر ص ۱۰۲

بادشاہ کی بے مایگی

بادشاہ صرف عمر اور قربی ہی میں مگر و رنہ تھا اس کے پاس کوئی بھی چیز نہ تھی، جو نظم و نسق کو چلانے میں معاون بن سکتی۔ نہ روپیہ تھا، نہ ساز و سامان جنگ، نہ شہر میں بڑی فوج کے لیے رسد کا کوئی بندوبست تھا، نہ سپاہیوں کو تنخواہ دی جا سکتی تھی۔ ان حالات میں وہ سب پیش نظر مقاصد کے لیے جانبازی کی بنا پر زیادہ دیر تک کام نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ بعض نے لوٹ مار میں بھی تامل نہ کیا اور کھانے پینے کی چیزیں تو عموماً زبردستی ہی اُٹھائی جاتی تھیں۔ بعض نے پاس اتفاقات کی بنا پر بہت بڑی رقمیں جمع ہو گئیں اور وہ نرخ سے زیادہ روپے دے کر اشرفیاں خریدتے رہے تاکہ ان کے رکھنے میں سہولت رہے۔ اغلب ہے بعض موقع پا کر گھروں میں جا بیٹھے ہوں۔ بہرحال بادشاہ کی بے مایگی اور تہی دستی نے حالات اور زیادہ نازک بنا دیے۔ وہ غالباً سمجھ رہا ہو گا کہ سپاہیوں نے مجھے بادشاہ بنایا ہے، اب روپے اور ساز و سامان کا انتظام انھیں کو کرنا چاہیے۔ اغلب ہے اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہو کہ بادشاہی میرے سوا کوئی کر نہیں سکتا اور اب اس بادشاہی کی قیمت بھی سپاہ کو ادا کرنی چاہیے۔ سپاہی سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم نے جانیں لڑا دینے کا فیصلہ کیا ہے، اگر بادشاہ کی طرف سے کھانا اور تنخواہ بھی نہ ملے تو ہمیں قربانی کے لیے کیوں تیار ہونا چاہیے؛ خیالات و افکار کا یہ تصادم بھی نظم و نسق میں خرابی کا باعث بنا۔

مختلف حصّوں سے روابط

حکیم احسن اللہ خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل مقامات سے قاصد یا سفیر آئے یا عرضیاں اور فوجیں آئیں یا فرامین و شقہ جات بھیجے گئے یا روپے طلب کیے گئے (رنیچ، جھانسی، داناپور، الہ آباد، علی گڑھ، متھرا، بلند شہر، رڑکی، فرخ آباد، ہانسی، سرسہ، نصیر آباد، بریلی، ساگر، جبل پور، فیروز پور، انبالہ، پھلور، جالندھر، جہلم، سیالکوٹ، راولپنڈی، لدھیانہ، گوڑ گانوی، ریواڑی، بادشاہ پور، حصار، بجنور، بریلی، متھرا، آگرہ، مین پوری اور الہ آباد۔

پٹیالہ، جے پور، جودھ پور، الور، بیکانیر، گوالیار، جیلسمیر کے نام شقّے بھیجے گئے۔ گوالیار کی رانی بیجا بائی کے نام دو شقّے گئے لیکن کسی کا جواب نہ آیا۔ اودھ سے باقاعدہ سفارت آئی تھی۔ بعض مقامات کی سپاہ نے یہ سمجھ کر دہلی ہی کو مرکز بنانا ضروری خیال کیا کہ مرکزیت کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا یا ممکن ہے ان کے دل میں بہادر شاہ کی بادشاہی کے متعلق کوئی ایسا تصوّر ہو جو حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، لیکن اکثر مقامات کے پیغامات صرف زبانی یا تحریری اظہار اطاعت ہی تک محدود رہے اور یہ امر تعجب انگیز نہیں سمجھا جا سکتا تھا، اس لیے کہ سپاہی اُٹھے تو انھوں نے پیغام بھیج دیا، پھر وہ بچارے مقامی کشمکشوں میں اُلجھ کر تباہ ہو گئے، جیسا کہ مختلف مقامات کے ذکر میں تفصیلاً بیان ہو گا۔

عہدیداروں کا تقرر

بہادر شاہ نے بعض عہدیدار بھی مقرر کیے تھے، مثلاً:

۱۔ ولی داد خاں	حاکم بلند شہر
۲۔ ڈاکٹر وزیر خاں	حاکم آگرہ
۳۔ خان بہادر خاں	حاکم روہیل کھنڈ
۴۔ مولوی لیاقت علی	حاکم الٰہ آباد
۵۔ جنرل بخت خاں	گورنر جنرل

دہلی میں پہلے معین الدین حسن خاں کو کوتوال بنایا گیا تھا، پھر یہ عہدہ قاضی فیض اللہ کو دے دیا، بعد ازاں سیّد مبارک شاہ رام پوری اس پر مامور ہوئے۔ جگہ جگہ تھانیدار بھی مقرر کیے گئے۔ پلول، ہوڈل اور شاہدرہ میں تحصیلدار اور گوڑگانوہ میں ذیلدار متعین ہوئے یہ بھی حکم دے دیا گیا تھا کہ عدالت کا کام مفتی اور صدر الصدور انجام دیں۔ فوج یا دیوانی کے افسروں کو مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ تاہم ظاہر ہے کہ چار مہینے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی اور معاملہ جہاں تھا، وہیں رہا۔

انتظامی مجلس ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ انتظامات کے لیے دس آدمیوں کی ایک مجلس بن گئی تھی، جس میں چھ آدمی فوج کے نمائندے تھے، دو پیادہ فوج کے، دو رسالے کے، دو توپ خانے کے، ان کا کام یہ تھا کہ فوج کا خیال رکھیں۔ چار آدمی ملکی اور دیوانی انتظام کے لیے تھے۔ یہ مجلس سپہ سالارِ اعظم کے تابع تھی۔ سپہ سالار کی تصدیق کے بغیر مجلس کا کوئی حکم جاری نہیں ہو سکتا تھا۔ جن فیصلوں سے سپہ سالار کو اختلاف ہوتا، وہ مجلس کو واپس بھیج دیتا۔ اگر مجلس کو اس فیصلے پر اصرار ہوتا تو معاملہ بادشاہ کے پاس پہنچ جاتا۔[1]

بادشاہ نے ایک لاکھ روپیہ ساہوکاروں سے قرض لیا تھا۔ پھر رہتک سے پورے دو لاکھ کی رقم آگئی۔[2] یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بخت خاں اور غوث خاں۔ سالارِ جیش نیمچ کے درمیان کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔[3]

انتظامی مجلس کوئی خاص قابلِ ذکر کام نہ کر سکی۔ شہزادے اپنے طور پر جو چاہتے کرتے جو روپیہ فراہم کیا گیا تھا، وہ وسیع ضروریات وانتظامات کا کفیل نہیں ہو سکتا تھا اور خود مجاہدین میں خفیف سی کشمکش بھی اصل مقصد و مدعا کے لیے سخت نقصان رساں تھی۔

شہر کا انتظام فوج شہر میں آئی تھی تو بہت لوٹ مار مچی تھی۔ اس لوٹ مار کی ذمہ دار تنہا فوج نہ تھی، بلکہ بعض مقامی بدمعاش بھی تھے، جن میں گامی خاں کا نام بہت مشہور ہوا۔ آخر کار اُسے فتح دہلی کے بعد پھانسی کی سزا ملی۔ ان کی خواہش یہی تھی کہ بدنظمی قائم رہے تاکہ لوٹ مار میں کمی نہ آنے پائے۔ اہلِ شہر نے لوٹ مار کے خوف سے دکانیں بالکل بند کر دی تھیں۔ بادشاہ نے سپاہیوں سے امن و نظم کا اقرار لے کر دکانیں کھلوا دیں، پھر کوئی خاص ہنگامہ نہ ہوا۔ اس لیے کہ دکاندار خود سپاہیوں

---

[1] سین کی کتاب ص ۸۷ [2] ایضاً ص ۸۸ [3] ایضاً ص ۹۱

کی خاطر تواضع کرتے رہتے تھے۔

البتہ انگریزوں سے تعلق کا الزام بہت خطرناک تھا جس پر یہ الزام لگ جاتا، اسے پناہ نہ ملتی۔ حکیم احسن اللہ خاں پر شروع ہی سے یہ الزام تھا اور اس کا گھر لٹ گیا۔ ایک مرتبہ جان مشکل سے بچی، بعض بدمعاشوں نے بے گناہوں پر یہ الزام لگا کر ان کے گھر یا دکانیں لٹوا دیں۔ کشمیری اور موری دروازے کے نان بائیوں کو اس الزام میں قتل کر دیا گیا کہ وہ ڈبل روٹیاں تیار کر کے انگریزوں کو بھیجتے ہیں۔ اناج کے چھکڑوں میں سے کچھ گولے وغیرہ نکلے، اس کا الزام محبوب علی خاں، خواجہ سرا اور احسن اللہ خاں پر لگا۔ سلیم گڑھ کی توپوں میں ایک دفعہ کنکر بھرے ہوئے نکلے، دوسری دفعہ میخیں ٹھکی ہوئی نکلیں۔ ان کے لیے بھی محبوب علی خاں اور احسن اللہ خاں ملزم ٹھہرے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ایک سنتری کا کام تھا۔[1]

بخت خاں کی کوشش

جنرل بخت خاں اوائل جولائی میں دہلی پہنچا۔ وہ اپنے ساتھ منظم فوج لایا تھا اور اسے چھ مہینے کی تنخواہ پہلے ادا کر دی تھی۔ ساز و سامان بھی لایا تھا اور روپیہ بھی خزانہ سرکار میں داخل کیا تھا۔ اس میں جنگی اور انتظامی "دونوں قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں، لیکن اس کے پہنچنے سے پیشتر شہزادے تمام امور اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔ بادشاہ نے اگرچہ بخت خاں کو پورے اختیارات دے دیے تھے لیکن شہزادوں کو کب منظور تھا کہ کوئی اور شخص دہلی میں مختار بن جائے۔ وہ ہر کام میں روڑے اٹکاتے رہے، یہاں تک کہ انتظام درست ہو ہی نہ سکا۔ بخت خاں کے خلاف شکایات بھی ہوتی رہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں نے بھی بیان کیا ہے کہ تمام سپاہی اس کے ماتحت جنگ کے لیے آمادہ نہ تھے اور اس کے گورنر جنرل بنائے جانے پر ناراض تھے۔ کہتے تھے کہ میرزا مغل کو تمام اختیارات دیے جا چکے ہیں اور وہ ہر فرض

---

[1] ذکاء اللہ ص ۶۶۵

انجام دینے کا اہل ہے[1]۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شکایتیں شہزادوں ہی کے ایماء پر ہوتی ہوں گی۔

عوام کی یک آہنگی ابتدا میں ہندو اور مسلمان ہم آہنگ تھے اور ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ سپاہیوں میں کثرت ہندوؤں کی تھی۔ شہر کی آبادی میں بھی انھیں کا تناسب زیادہ تھا۔ مغل بادشاہ ہمیشہ جائز حدود میں تمام فرقوں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے رہے تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا موقع ایسا تھا کہ اس احترام کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دے دیا کہ گائے ذبح نہ کی جائے ۱۶ جولائی کو ڈھنڈورا پٹوا دیا گیا کہ جو شخص گائے ذبح کرے گا، اُسے پھانسی دے دی جائے گی۔ پھر تلنگوں نے حکم جاری کرا دیا کہ حلال خور ٹوکرا اور کوڑا کرکٹ بیلوں پر نہیں بلکہ گدھوں پر لادا کریں۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ اس طرح سے ہندوؤں کی دلداری میں حد سے تجاوز ہو رہا ہے، حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ چنانچہ مولوی محمد سعید صاحب نے جامع مسجد میں محمدی جھنڈا کھڑا کر دیا[2]۔ بادشاہ کو اطلاع ملی تو اسے بڑا تعجب ہوا کہ انگریز تو رہے نہیں، پھر یہ جھنڈا کس کے خلاف ہے۔ مولوی محمد سعید سے کہا کہ یہ عجیب حماقت ہے۔ سپاہیوں میں زیادہ زور پر یہی ہندو ہیں۔ اس طرح ان سے لڑائی شروع ہو جائے گی اور نتیجہ حد درجہ الم ناک ہوگا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوؤں کا میلان انگریزوں کی طرف ہے اور مسلمانوں

---

[1] مقدمہ بہادر شاہ مرتبہ گیرٹ ص ۲۸۱۔ [2] قومیں جب نیچے گرتی ہیں تو ان کی نظر و فکر کے پیمانے بھی بہت پست ہو جاتے ہیں۔ پورے ہندوستان میں بیلوں سے ہر قسم کا کام جاتا تھا، یہاں تک کہ کھاد کے چھکڑے بھی بیل ہی کھینچتے تھے، مگر سمجھا گیا کہ یہی موقع بیل کی عزت کرانے کا ہے اور سوال اٹھا دیا گیا۔ ادھر مسلمانوں کی حالت دیکھیے کہ اس کو ہندو نوازی کا معیار بنا لیا گیا حالانکہ سب سے پہلی چیز آزادی تھی نہ کہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں۔

سے قطعاً ہمدردی نہیں۔ پھر ہندوؤں کا ایک وفد شکایت لے کر بادشاہ کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے اُسے یقین دلادیا۔ کہ جنگ انگریزوں کے خلاف ہے، نہ کہ ہندوؤں کے خلاف[1]۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح شبہات بڑھتے گئے اور آخری دور میں شہر کے ہندوؤں کا میلان انگریزوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ مسلمانوں کے بارے میں ان کے وہ خیالات نہیں رہے تھے، جو ابتدا میں تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے بیان کیا کہ ابتدا میں دہلی اور باہر کے ہندو بھی اتنے ہی انگریزوں کے دُشمن تھے، جتنے مسلمان، پھر بخت خاں نے آکر جہاد کے فتوے کا انتظام کیا تو مسلمان بہت تیز اور مشتعل ہو گئے[2]۔ یہی وجہ ہے کہ بعد فتح دہلی ہندوؤں کو انگریزوں نے پہلے آباد ہونے کی اجازت دے دی اور مسلمانوں کو خاصی مدت تک زیرِ عتاب رکھا۔ پھر امراء کا اختلاف بھی بالکل واضح تھا۔ ہر گز وہ اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ کرنا چاہتا تھا اور کسی دوسرے کے دخل کا روادار نہ تھا۔

ڈھنڈورا اور سکّہ

یہاں صرف دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ اوّل ۱۱۔ مئی سے پیشتر ڈھنڈورا یوں پیٹا جاتا تھا: "خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم سرکار کمپنی بہادر کا۔" "حکم سرکار کمپنی بہادر کا" ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ حکم بادشاہ کا رکھ دیا گیا[3]۔

دوسرے سکّہ جاری کیا گیا، جس پر یہ بیت منقوش تھی:

بہ زر زد سکّهٔ نصرت طرازی　　　سراج الدین بہادر شاہ غازی

بعض عجیب بیانات

حکیم احسن اللہ خاں کے بیان میں سے دو ضروری امور قابلِ اندراج ہیں: اوّل یہ کہ ٹونک سے "وہابی" آئے۔ نواب ٹونک نے انھیں

---

[1] دو روزنامچے (انگریزی) ص ۹۸، نیز ذکاء اللہ ص ۶۶۰۔　[2] بہادر شاہ کا مقدمہ مرتبہ گیرٹ ص ۲۸۲۔　[3] ذکاء اللہ ص ۶۷۵۔

کوئی مالی امداد نہ دی۔ دوسرے مقامات مثلاً جے پور، بھوپال، ہانسی، حصار سے بھی "وہابی" دہلی پہنچے۔ جنرل بخت خاں، محمد غوث خاں رسالدار، مولوی امام خاں رسالدار، مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی بھی "وہابی" تھے۔ بخت خاں کی آمد پر بہت سے "وہابی" شامل ہوئے۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ "وہابی" سے حکیم صاحب کا مقصود کیا ہے۔ غالباً سیاسی افکار کی طرح ان کی مذہبی معلومات بھی بہت معمولی تھیں۔

ایک حیرت انگیز بیان یہ ہے کہ اخوند صاحب سوات نے خود تو کوئی تحریر نہ بھیجی لیکن ان کی طرف سے دو آدمی آئے، جنھیں بخت خاں کی تحریک پر پیرزادہ حسن عسکری نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ ایک آدمی نے اخوند کی طرف سے تلوار پیش کی۔

مجاہدین کا سامان رسد

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں کہ جہاد کا فتویٰ شائع ہوا تو دیکھا گیا کہ اکثر جہادی بھوکے مرتے تھے۔ ان کے بدن پر کپڑے بھی ثابت نہ تھے، مگر بغل میں تلوار یا کمر میں خنجر یا کندھے پر توڑے دار بندوق ضرور تھی۔ بادشاہ نے انتظام کرا دیا کہ اہل شہر خیرات کی روٹیاں کھلایا کریں۔ نواب بڈھے صاحب نے انھیں دو ہزار روپے دیے۔ دہلی کے نامور مصوّر محمد شریف نے سارے گھر کا اسباب اور مکان خیرات میں دے دیے۔ خود بھی جہادیوں میں شریک ہوا۔ پھر اُس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی آئے تھے اور قلعے کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اُترے تھے۔ جب دیکھا کہ جہاد کی صورت اچھی نہیں تو چلے گئے۔

باب ۶

آخری حملہ

صورتِ حال اب انگریزوں کی پوزیشن خاصی مضبوط ہو چکی تھی۔ ان کے پاس جتنی کمک جلد از جلد پہنچ سکتی تھی، پہنچ چکی تھی۔ ساز و سامان ہی نہیں بلکہ محاصرے کی بڑی توپیں بھی آ گئی تھیں اور آخری فیصلہ کن حملے کا نقشہ انتہائی تیزی سے مکمل ہو رہا تھا۔ سفر مینا کے آدمی انجینئروں کی ہدایات کے مطابق جگہ جگہ توپیں نصب کر رہے تھے تاکہ حملے کی سکیم کے مطابق قلعہ شکن توپوں کی گولہ باری شروع ہو جائے۔

ضروری امور اس کے برعکس مدافعین کی حالت اچھی نہیں رہی تھی۔ اس کے متعدد وجوہ تھے۔ مثلاً

۱۔ فوج خاصی تعداد میں شہر کے اندر پہنچ چکی تھی، لیکن اس کے لیے رسد، تنخواہ اور دوسری ضرورتوں کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شہر کی صرف جنوبی سمت سے رسد آ سکتی تھی لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ باہر سے بڑی فوج کے لیے روزانہ جنسیں خریدنے اور پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا۔

۲۔ سپاہی ضرورت کی بنا پر جہاں سے جو کچھ ملتا، جبراً لے لیتے تھے۔ اس وجہ سے اہلِ شہر میں اور سپاہیوں میں خیر سگالی کے تعلقات باقی نہیں رہے تھے۔

۳۔ بادشاہ نے بڑے بڑے عہدے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو دے دیے تھے یا کہہ لیجیے کہ انھوں نے خود یہ عہدے سنبھال لیے تھے، لیکن ان میں نہ کوئی فوجی صلاحیت تھی، نہ وہ نظم و نسق کو چلانے کے اہل تھے اور نہ ان میں اور کوئی جوہر تھا، جس کی وجہ

سے سپاہ کی نظروں میں اعتماد حاصل کر سکتے۔

۴۔ بادشاہ کے گرد و پیش ایسے آدمی جمع ہو گئے تھے، جو یا تو طبعاً انگریزی راج کی طرف مائل تھے یا آزادی کے دور کی بدنظمیوں نے انھیں نتائج کے متعلق بدگمان کر دیا تھا اور وہ بوڑھے بادشاہ کی رائے پر اثر انداز ہوتے رہتے تھے، مثلاً حکیم احسن اللہ خاں، بیگم زینت محل، میرزا الٰہی بخش بلکہ مختلف خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا الٰہی بخش اور بیگم نے خفیہ خفیہ انگریزوں سے نامہ و پیام بھی شروع کر دیا تھا۔

تفرقہ اور بے عملی

حقیقت یہ ہے کہ اولوالعزمی کے کام انتہائی محنت و مشقت اور جانبازی و سرفروشی کے محتاج ہوتے ہیں۔ عالمگیر کی ابتدائی تاجپوشی جنگ کھجوہ سے پیشتر دہلی میں ہو چکی تھی۔ جب جنگ کھجوہ میں اس نے سخت خطرات کے مقام پر لڑنا شروع کیا تو بعض ساتھیوں نے کہا کہ بادشاہ کو خطرات سے بچ کر رہنا چاہیے عالمگیر نے جواب دیا کہ میں ابھی تک بادشاہ نہیں ہوا، البتہ ایسے کارناموں کی بدولت بادشاہی مل جاتی ہے۔ بہادر شاہ بیچارہ نہ مشقت و محنت کا عادی تھا، نہ اس کی عمر ایسی تھی کہ اس سے زیادہ سرگرمیوں کی امید رکھی جا سکتی۔ شہزادوں کی حالت اور بھی یاس افزا تھی، پھر مصیبت یہ تھی کہ جو آدمی کچھ کارنامے انجام دے سکتے تھے انھیں مختاری کا درجہ حاصل نہ رہا۔ جنھیں مختاری کی مسند پر بٹھا دیا گیا تھا، وہ کچھ کر ہی نہ سکتے تھے۔ سب سے آخر میں یہ کہ بعض کوتہ اندیش آدمیوں کی حماقت کے باعث شہر کی آبادی میں اک گونہ تفرقہ پیدا ہو چکا تھا، جس سے انگریزوں اور ان کے بہی خواہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

تصدیقات

ان امور کی تصدیق ایسے اصحاب کے بیان سے بھی ہوتی ہے، جو موقع پر موجود تھے اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے دانستہ غلط بیانی کی ہو گی۔ مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی کے تاثرات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ دآمر و حاکم اعمر کی کافی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی حدوں میں قدم رکھ چکا تھا اور سچ پوچھیے تو آمر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی شریک حیات اور وزیر کا محکوم تھا۔[1]

۲۔ سردار ایسا ضعیف الرائے اور ناتجربہ کار تھا کہ کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اس سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں۔ کوئی کام اپنی رائے سے نہیں کر سکتا تھا۔[2]

۳۔ ناتجربہ کار سردار نے اپنے بعض عاقبت نااندیش، سفیہ، خائن اور بزدل بیٹوں، پوتوں کو امیر لشکر بنا دیا۔ یہ لوگ دیانت دار عقلمندوں سے متنفر تھے۔[3]

۴۔ انھیں نہ تو میدان کارزار ہی سے کبھی واسطہ پڑا تھا اور نہ کبھی شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا موقع ملا تھا۔ انھوں نے بازاری لوگوں کو اپنا ہم نشین و جلیس بنا لیا۔[4]

۵۔ لشکر مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا۔ بعض گروہوں کا کوئی جرنیل ہی نہ تھا۔ بعض کو جائے پناہ بھی میسر نہ تھی۔ بعض کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب کر کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا۔ بعض تھوڑا سا مال غنیمت ہاتھ لگنے کے باعث بے نیاز ہو گئے تھے۔[5]

۶۔ مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ تو نصاریٰ کا جانی دشمن تھا، دوسرا گروہ ان کی محبت میں اس درجہ غلو رکھتا تھا کہ اس نے ہندوستانی لشکر کی بربادی، مجاہدین کے وقار و شوکت کی خواری اور ان کے قلع قمع میں مکر و حیلہ سے کام لینے میں کسی نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔[6]

اس پریشان کن ماحول، اس ناسازگار فضا اور ان حوصلہ فرسا مواقع کے باوجود مجاہدین نے جو کچھ کیا، وہ یقیناً بڑا ہی حیرت انگیز اور قابل صد ستایش ہے۔

---

[1] الثورۃ الہندیہ یا باغی ہندوستان ص ۳۶۲ شریک حیات سے مراد زینت محل ہے اور وزیر سے حکیم احسن اللہ خاں۔

[2] ایضاً ایضاً۔ [3] ایضاً ایضاً۔ [4] ایضاً ایضاً۔ [5] ایضاً ایضاً۔ [6] الثورۃ الہندیہ یا باغی ہندوستان ص ۳۶۲۔

انگریزوں کی حالت قیادت عالیہ کی صلاحیت کے اعتبار سے انگریزوں کی حالت بھی قطعاً باعث رشک نہ تھی۔ پہلے اینسن سپہ سالار تھا۔ بہت سے جوشیلے انگریز اسے بے عملی اور افسردہ دلی کے طعنے دیتے رہتے تھے۔ پھر ہنری برنارڈ نے سپہ سالاری کا عہدہ سنبھالا۔ اس نے اگرچہ بادلی کی سرائے کا معرکہ جیتا تھا، لیکن دہلی پہنچ کر محاصرے پر قناعت کر بیٹھا، اس لیے اس پر بھی نکتہ چینی ہوئی۔ جب ولسن سپہ سالار بن گیا تو نہ صرف اس کی بلکہ ایک خاصے فوجی گروہ کی رائے یہ تھی کہ دہلی کے محاصرے میں انگریزی فوج کو معطل بنا کر بٹھائے رکھنا فضول ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ محاصرہ چھوڑ دیا جائے اور اس فوج سے دوسری جگہ کام لیا جائے۔ بعض افسروں کی مخالفت کے باعث اس رائے پر عمل نہ ہو سکا، لیکن ولسن آخری وقت تک فیصلہ کن حملے میں متذبذب تھا۔

جب نکلسن پہنچ گیا اور اس نے ولسن کا تذبذب دیکھا تو رابرٹس کے بیان کے مطابق نکلسن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ فوجی کونسل میں ولسن کو کمان سے معزول کر دینے کی تجویز پیش کرے۔ رابرٹس نے جب نکلسن کو بتایا کہ جنرل چیمبرلین زخمی ہے اور اس کے بعد کمانداری کے لیے آپ کا نمبر آتا ہے تو نکلسن نے جواب دیا کہ میں انکار کر دوں گا اور کیمبل کی کمانداری کی تجویز پیش کر دوں گا۔ گویا مقصود ذاتی ترفع نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ دہلی کی تسخیر میں تامل نہ کیا جائے۔

حملہ ہو جانے کے بعد جب ابتدائی دنوں میں زیادہ پیش قدمی نہ ہو سکی تو ولسن اس وقت بھی مراجعت کا حکم دینے پر آمادہ تھا۔ نکلسن زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا تو بولا: ابھی مجھ میں اتنی قوت ہے کہ ولسن کو گولی سے اڑا دوں۔

غرض یہ ہے کہ انگریزوں کی حالت بھی مجاہدین سے بہتر نہ تھی۔ لیکن ان کی فوج میں سپہ سالاروں کے علاوہ قابل اور ہمت ور فوجی افسر موجود تھے، جنھوں نے نقشۂ جنگ بگڑنے نہ دیا۔ مجاہدین میں جو قابل اصحاب تھے، انھیں غالباً کوئی قدم اٹھانے کا موقع ہی نہ دیا گیا۔

قلعہ شکن توپوں کے مورچے

جب کمک کے علاوہ قلعہ شکن توپیں بھی پہنچ گئیں تو انگریزوں نے فیصلہ کن حملے کا عزم کر لیا۔ چنانچہ بیرڈ سمتھ اور الیگزانڈر ٹیلر نے حملے کا منصوبہ تیار کیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ حملہ شہر کے شمالی حصّے پر کیا جائے یعنی موری دروازے، کشمیری دروازے اور پانی کے مورچے کی سمت سے۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ حملہ آور فوج کا میسرہ دریا کی وجہ سے محفوظ تھا۔ اور میمنہ کی حفاظت ہندو راؤ کے مکان اور آس پاس کے مورچوں کے ذریعے سے ہو سکتی تھی۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ مجاہدین نے اس حصّے کے استحکام پر توجہ نہ کی۔ اگر یہاں کے کھنڈروں پر دمدمے بنا کر توپیں لگا دی جاتیں اور مسلسل گولہ باری ہوتی رہتی تو حملہ آور فوج کو بڑی مشکلات سے سابقہ پڑتا۔

> باغی لیڈروں نے اس موزوں مقام سے فائدہ اٹھانے میں معمول کے مطابق غفلت برتی۔ اس طرح متعدد سابقہ مثالوں میں ایک اور مثال کا اضافہ ہو گیا کہ ان کے مشوروں میں کوئی واقعی لائق کماندار موجود نہ تھا۔ یہ غفلت دفاع کے لیے مہلک ثابت ہونے والی تھی کیونکہ محاصرین کو اپنی گولہ باری درمیانی حصّوں پر مرتکز کر دینے کا موقع مل گیا، جس سے مدافعین کی گولہ باری بند ہو گئی۔ جگہ جگہ فصیل میں شگاف ڈال دیے گئے جن سے پیادہ فوج شہر کے اندر پہنچائی جا سکتی تھی۔[1]

توپوں کے چار دمدمے

انگریزوں نے خوب دیکھ بھال کے بعد چار جگہ توپوں کے لیے مورچے تجویز کیے اور ۷۔ستمبر سے ان کے لیے کام شروع ہو گیا۔

۱۔ مورچہ ۱: اس کے دو حصّے تھے، ایک دایاں، دوسرا بایاں۔ دائیں حصّے کی توپوں کا

---

[1] میلی سن جلد چہارم ص ۷۶۔

مقصد یہ تھا کہ موری دروازے کے گرد گِرد کی توپوں کو خاموش کرا دیں۔ بائیں حصّے کی توپوں کو کشمیری دروازے کے گرد گِرد پر گولہ باری کرنی تھی۔ پہلے دائیں جانب کا حصّہ تیار ہُوا اور گولہ باری شروع کر دی گئی۔ پھر بائیں جانب کے حصّے کی درستی ہونے لگی، لیکن ایک ہی توپ نصب ہو سکی تھی کہ مدافعین نے انگریزوں کے منصوبے کا اندازہ کر لیا اور اس دمدمے پر مینہ کی طرح گولے برسنے لگے۔

آتش باری اس درجہ مسلسل اور خوفناک تھی کہ جس آدمی نے بھی مورچے کی پناہ گاہ سے سر اُٹھایا وہ ضرب سے محفوظ نہ رہ سکا۔[1]

بلکہ ایک چھوٹا سا دستہ لاہوری دروازے کے راستے ان توپوں پر قبضہ کرنے کی غرض سے بھیج دیا گیا، لیکن دوسرے انگریزی مورچوں کی آتش باری نے اسے مراجعت پر مجبور کر دیا۔ اس مورچے میں ریت کے جو بورے رکھے تھے، انھیں ایک موقع پر آگ لگ گئی جو بڑی مشکل سے بجھائی جا سکی۔

۲۔ مورچہ ۲:۔ ۷ ستمبر ہی کو لڈلو کیسل اور قدسیہ باغ پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ دوسرا مورچہ ان دونوں مقاموں کے قریب تھا۔ پہلے دمدمے کی طرح اس کے بھی دو ہی حصّے تھے، یہ آہستہ آہستہ ۸، ۹ اور ۱۰ ستمبر کو راتوں کی تاریکی میں تیار ہُوا اور ۱۱ ستمبر کو اس سے گولہ باری شروع ہو گئی۔

۳۔ مورچہ ۳:۔ اس کے لیے چنگی خانے کی ایک بیرونی عمارت تجویز کی گئی جو پانی کے مورچے سے صرف ایک سو ساٹھ گز تھی۔ خدا جانے مدافعین نے اسے کیوں غیر محفوظ چھوڑ دیا تھا۔ اس مورچے کی تیاری میں بھی انگریزوں کے بہت سے آدمی مارے گئے۔

---

[1] میلی سن جلد چہارم ص ۱۰۰

۴۔ مورچہ ۴ : یہ قدسیہ باغ میں ایک محفوظ و موزوں مقام پر تھا۔

گولہ باری اور شگاف

چاروں مورچوں سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ ۱۳ ستمبر کو بعد دوپہر معلوم ہُوا کہ فصیل میں دو ایسے شگاف پڑ گئے ہیں، جن سے فوج گزر کر اندر داخل ہو سکتی ہے، لیکن ضروری تھا کہ ذمہ دار افسر موقع پر پہنچ کر ان شگافوں کا صحیح اندازہ کر لیں اور جانچ لیں کہ آیا واقعی ان میں داخلہ ممکن ہو گا۔ نیز ان کے سامنے کی زمین کے متعلق ضروری معلومات فراہم کر لیں تاکہ فوج کو پیش قدمی میں ہر ممکن سہولت رہے۔

چنانچہ شعبہ انجینئری کے چار افسر اس کام کے لیے تجویز ہوئے۔ دو کو کشمیری گڑگج کی طرف اور دو کو پانی کے مورچے کی طرف بھیجا گیا۔ اندھیرا ہو گیا تو دو افسر دیکھنے کے لیے آگے بڑھے۔ مدافعین کو پتہ چل گیا اور انھوں نے آتش بازی شروع کر دی۔ آخر یہ کام دس بجے شب کے بعد پر ملتوی کیا گیا۔ اس اثنا میں توپچیوں کو ہدایت کر دی گئی کہ مسلسل گولے برساتے رہیں اور ٹھیک دس بجے بند کر دیں۔ غرض خوب دیکھ بھال کے بعد اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ شگافوں میں سے داخلہ ممکن ہے۔ اب حملے کے لیے تیاری شروع ہو گئی۔

حملہ آور فوج کی تقسیم

حملہ آور فوج کو پانچ کالموں میں تقسیم کیا گیا۔

۱۔ کالم ۱ : ایک ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا اور جنرل نکلسن کو اس کا کمانڈر بنایا گیا اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ کشمیری دروازے کے گڑگج سے قریب جو شگاف ہے، اس میں سے اندر داخل ہو۔

۲۔ کالم ۲ : اس میں آٹھ سو پچاس آدمی تھے اور بریگیڈ ولیم جونز کو اس کا سالار مقرر کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پانی والے مورچے کے پاس جو شگاف ہو، اس میں سے دخل ہو۔

لہ

۳۔ کالم ۳، اس میں نوسو پچاس آدمی تھے اور کرنیل کیمبل[۱] اس کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا۔
اس کا مقصد یہ تھا کہ جب کشمیری دروازے کو اڑا دیا جائے تو یہ اس میں سے
اندر جائے۔

۴۔ کالم ۴، اس میں آٹھ سو آٹھ آدمی تھے، لیکن کشمیر کنٹنجنٹ کے بارہ سو آدمی بھی
اسی کے ساتھ رکھے گئے۔ اس کالم کا سالار میجر ریڈ[۲] تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کشن گنج
پر حملہ کرتا ہوا لاہوری دروازے سے شہر میں داخل ہو۔

۵۔ کالم ۵، یہ ریزرو کالم تھا اور بریگیڈیر لونگ فیلڈ[۳] اس کا کمانڈار تھا۔ اس کا کام یہ
تھا کہ ریزرو کے طور پر کالم ۱ کے پیچھے پیچھے جائے۔

پانچوں کالموں کا عمومی چارج جنرل نکلسن کے حوالے کیا گیا تھا۔

ولسن کی ہدایات

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ذمہ دار سالار حملے کے وقت عموماً فوجوں کو خاص ہدایات دیا کرتے ہیں کہ دیکھنا کسی غیر مسلح آدمی کو نہ چھیڑنا۔ جو ہتھیار ڈال دے، اسے کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بچائے رکھنا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قتل و غارت، خونریزی اور بربادی کے دائرے کو زیادہ سے زیادہ محدود رکھا جائے۔ میل سن کے بیان کے مطابق ولسن نے حملہ آور فوج کو ہدایات دیتے وقت سب سے پہلے یہ یاد دلایا کہ دیکھو تمھارے افسر، تمھارے ساتھی، تمھاری بیویاں اور تمھارے بچے بڑی بے دردی سے مارے گئے۔

تاہم اگر عورتیں اور بچے تمھارے سامنے آئیں تو انھیں بچا لینا، لیکن
باغیوں کو ہرگز پناہ نہ دینا۔

پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ اس موقع پر انگریزوں کے قتل کا واقعہ یاد دلانے کی کیا ضرورت

---

[۱] CAMPBELL, [۲] REID, [۳] LONGFIELD, JONES.

تھی؛ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ فوج خوب مشتعل ہو جائے۔ دوسرے ولسن کو اور ہر انگریز کو معلوم تھا کہ نہ تمام "باغی" انگریز عورتوں بچوں یا مردوں کے قاتل تھے۔ نہ مقابلہ کرنے والے کے سوا کسی کا قتل اخلاقاً یا قانوناً جائز تھا۔ نہ عورتوں اور بچوں کے سوا دہلی کا ہر فرد "باغی" تھا۔ گویا اس ہدایت ہی میں ایک لحاظ سے قتل عام کی نہ صرف اجازت دے دی گئی تھی بلکہ اس کے لیے تاکید کر دی گئی تھی۔

حملے

۱۴۔ستمبر کی صبح کو تمام کالم بالکل تیار ہو گئے۔ یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ جب پہلا اور دوسرا کالم حملہ کر دیں تو ایک دستہ جا کر کشمیری دروازے کو اڑا دے تاکہ تیسرے کالم کے لیے بھی آگے بڑھنے کا راستہ کھل جائے۔

تمام کالم لڈلو کیسل کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گئے تھے۔ پھر پہلا کالم قدسیہ باغ میں جا کھڑا ہُوا۔ نکلسن نے پیش قدمی کا اشارہ کیا۔ اگرچہ مدافعین کی طرف سے سخت گولہ باری ہو رہی تھی لیکن کالم کے سپاہی نقصان اٹھاتے ہوئے بھی خندق سے گزر کر اندر پہنچ گئے۔ اس اثنا میں دوسرا کالم پانی والے مورچے کے شگاف سے گزر گیا۔ کشمیری دروازہ اڑ گیا تو تیسرا کالم بڑھا اور چاندنی چوک میں سے ہوتا ہُوا شاہی مسجد کے سامنے پہنچ گیا۔ چوتھے کالم کو سخت ناکامی ہوئی۔ نکلسن کا کالم بھی رُک گیا۔ اس لیے کہ آگے گولوں اور گولیوں کا مینہ برس رہا تھا۔ یہیں نکلسن کے گولی لگی اور وہ بے بس ہو کر گرا۔ باقی کالموں کی پیش قدمی بھی رُک گئی۔

۱۴۔ کی شام کو یہ کیفیت تھی کہ پانی والے مورچے سے کابلی دروازے تک فصیل کے ساتھ ساتھ کا حصّہ پہلے اور دوسرے کالم کے قبضے میں تھا۔ تیسرا کالم جامع مسجد تک پہنچنے کے بعد لوٹا اور بیگم کے باغ میں ٹھہرا۔ پھر وہاں سے بھی پیچھے ہٹ آیا۔ چوتھا کالم شکست کھا چکا تھا۔

۱۵۔ اور ۱۶۔ستمبر

اب پھر ولسن تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ حملہ آور فوج کو واپس بلائے، لیکن بیرڈ سمتھ نے اُسے روکا اور کہا کہ ہم

جو مقام حاصل کر چکے ہیں ا سے ہر حال میں سنبھالے رکھنا لازم ہے۔ ۱۵۔ اور ۱۶۔ ستمبر کو بھی جنگ ہوتی رہی۔ ۱۶۔ کو کشن گنج کا تخلیہ ہو گیا۔ ۱۷۔ اور ۱۸۔ کو بھی آہستہ آہستہ پیش قدمی جاری رہی۔ ۱۸ کی شام کو مزاحمت کا زور کم ہو گیا۔ ۲۰۔ کو لاہوری دروازہ بھی لے لیا گیا اور اسی دن میجر برنڈ[1] چاندنی چوک میں سے ہوتا ہوا شاہی مسجد پہنچ گیا۔ اسی وقت لال قلعہ پر حملہ ہوا اور ۲۰ ستمبر کو اسی پر بھی قبضہ ہو گیا۔

جامع مسجد کا معرکہ

سید ظہیر دہلوی نے "داستان غدر" میں جامع مسجد کے ایک معرکے کا ذکر کیا ہے۔ یہ غالباً وہی معرکہ ہے جس کے بعد کیمپل کو پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے لاشیں دیکھیں اور پوچھا کہ کیا ہوا؟ بتایا گیا کہ انگریزی فوج کا ایک بزن مسجد کی سیڑھیوں تک آ گیا تھا۔ کچھ فوجی رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے تھے۔ مسجد میں جو مسافر جمع تھے، انھوں نے سوچا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آ کر کشت و خون کریں گے تو وہ باہر نکل کر سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ فوجیوں نے ان پر بندوقیں سر کیں۔ یہ دیکھتے ہی لوگ لکڑیاں، پلنگ کی پٹیاں اور تلواریں لے لے کر دوڑ پڑے۔ بزن کے کچھ آدمی مارے گئے تھے باقی بھاگ گئے۔[2] اسی طرح ظہیر نے جا بجا لاشیں دیکھیں، یہ سب انگریزی فوج کی تھیں جسے عام لوگوں نے مار بھگایا تھا۔

جامع مسجد کے معرکے کی نسبت ایک اور بیان مظہر ہے کہ مسجد کے اندر جو مسلمان تھے، ان کے پاس تلواریں تھیں، بندوقیں نہیں تھیں۔ ایک شخص نے پکار کر کہا کہ بھائیو امتحان کا وقت آ گیا۔ انگریز مسجد کو بارود سے اڑا دینا چاہتے ہیں۔ تم میں سے کون کون اسے بچانے کے لیے جان دینے پر آمادہ ہے؛ سب ساتھ ہو گئے اور نعرہ ہائے تکبیر لگاتے ہوئے شمالی دروازے سے اتر کر مقابلے پر آ گئے۔ انگریزوں کے حملہ آور دستے کے آگے

---

[1] BRIND [2] داستان غدر ص ۲۱۳

آگے مٹکاف تھا۔ اس نے گولی چلانے کا حکم دیا۔ پہلی آتش باری میں دو سو مسلمان شہید ہوے۔ اس اثنا میں باقی مسلمان انگریزی جیش کے پاس پہنچ گئے اور تلوار کے وار شروع کر دیے۔ انگریزی فوج بھاگی اور کشمیری دروازے کے گرجا تک مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا۔[1]

گولہ باری کی عام کیفیت

اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر امر رہ گیا اور وہ یہ کہ انگریزی توپ خانے کی گولہ باری کے وقت شہر کی کیا حالت تھی۔ سید ظہیر دہلوی فرماتے ہیں کہ ادھر پہاڑی پر فریزر صاحب کی کوٹھی سے باڈے (فلیگ سٹاف) تک انگریزی فوج کے مورچے تھے، ادھر کشمیری دروازے کے برج سے کابلی دروازے کے سیاہ برج تک اور لاہوری دروازے کے برج سے فراش خانے کی کھڑکی کے برج تک توپیں چڑھی ہوئی تھیں اور باہم شبانہ روز گولہ باری ہوتی تھی اور شیل اور بم کے گولے شہر پر برستے تھے۔ بم کا گولہ، خدا پناہ میں رکھے، جس وقت پھٹتا تھا اور صدہا ٹکڑے اس کے اڑ جاتے تھے۔ اگر سات درجے کے مکان پر پڑا تو تہ کو اتر گیا.

> اور سب کا ستیاناس کر دیا۔ اگر زمین پر گرا تو دس گز زمین میں پیوست ہو کر چھوٹا اور تمام مکان کو اڑا دیا۔ غرض ایک قہرِ خدا تھا۔ دس دس گولے برابر کاغذ کے پرچوں کی طرح شب کو اڑتے چلے آتے تھے۔[2]

ایک اور بیان مظہر ہے کہ اہل دہلی غم اور مصیبت کے وقت بھی تفریح اور خوش باشی کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ انگریزی توپوں کی گولہ باری ان کے لیے شب برات کی آتشبازی کی طرح تماشا ہو گئی تھی۔ مکانوں کی چھتوں پر لوگ چڑھ جاتے، گولوں کی سیر دیکھتے۔ جب گولہ

---

[1] دہلی کی جان کنی ص ۳۳-۳۴۔

[2] داستان غدر ص ۹۵۔

آتا تو غل مچاتے وہ آیا، وہ آیا۔ گرتا تو سیکڑوں دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے۔ گوروں سے نقصان بھی بہت کم ہوا۔ خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں، میرے والد فرماتے تھے کہ ہم ہمایوں کے مقبرے کی چھت پر چڑھ کر تماشا دیکھا کرتے تھے[1]

سوٴروں کا ریوڑ

مدافعین شہر سے نکلے تو چلتے چلتے انھوں نے شراب کی بوتلیں مکانوں کے چبوتروں پر ڈال دیں۔ ہومز لکھتا ہے کہ انھیں شراب کے بارے میں گوروں کی کمزوری کا علم تھا۔ بہت سے اس پھندے میں نہیں پھنسے۔

> لیکن بہتیرے پی کر بدمست ہو گئے اور سوٴروں کے ریوڑ کی طرح جگہ جگہ بے خبر اور بے حس و حرکت ہو کر گر گئے۔ اگر دشمن کو انھیں ذبح کر ڈالنے کا احساس ہوتا تو ظاہر ہے کہ چند گھنٹے کی عیش رانی کے لیے انھوں نے اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال دی تھیں، لیکن موقع ضائع کر دیا گیا۔ ولسن یہ سوچ کر ہی کانپ اٹھا کہ خدا جانے کیا ہوتا، لہٰذا اس نے شراب کی تمام باقی بوتلیں توڑ دینے کا حکم صادر کر دیا[2]

مرقع عبرت

۲۰ ستمبر کو بعد دوپہر ولسن لال قلعے میں پہنچ گیا اور دیوان خاص کو اس نے اپنا صدر مقام بنایا۔ اس دن شراب کے ذریعے سے دیوان خاص میں ملکہ وکٹوریہ کا جام صحت نوش کیا گیا۔ لال قلعہ ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوا تھا۔ دو سو نو سال کے بعد اس کے در و دیوار نے پہلی مرتبہ ایک اجنبی حکمران کا جام صحت تجویز ہونے کی صدا سنی۔

---

[1] دہلی کی جان کنی ص ۵۷-۵۸۔

[2] ہومز ص ۳۶۹-۳۷۰۔

باب ۷

بادشاہ کی گرفتاری

لال قلعے کا ترک

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے دہلی پر فیصلہ کن حملہ کیا تھا۔ دو روز تک وہ نمایاں پیش قدمی نہ کر سکے۔ جب انھیں روکنے کی تدبیریں ناکام ہو گئیں تو اہل شہر نے جنوبی سمت کے تین دروازوں یعنی اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ سے نکلنا شروع کر دیا۔

۱۶ ستمبر کو بہادر شاہ خود ہوادار میں بیٹھ کر فوج کے ساتھ نکلا کہ انگریزی فوج کا مقابلہ کرے اور قلعہ سے کوئی دو سو گز لال ڈگی کے پاس ٹھہرا رہا۔ انگریزی فوج کی گولیاں وہاں تک آرہی تھیں، اس لیے افسران فوج نے عرض کیا کہ یہاں حضور کا ٹھہرے رہنا مناسب نہیں ہے[1]

۱۹ ستمبر کو شہر کا بڑا حصہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو بادشاہ کو بھی یہی مناسب معلوم ہوا کہ لال قلعہ سے نکل کر باہر چلا جائے۔

بخت خاں کا مشورہ

بخت خاں سپہ سالار نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ انگریزوں نے اگر دہلی کو فتح کر لیا ہے تو مضائقہ نہیں۔ ہمارے لیے ہندوستان کھلا پڑا ہے۔ میرے ساتھ تشریف لے چلیے، جانبازانہ جنگ کریں گے۔ شہر

---

[1] دی ٹرائل آف بہادر شاہ (بہادر شاہ کا مقدمہ) طبع ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۶۷ (بادشاہ کے میر منشی مکند لال کا بیان) نیز "غدر کا نتیجہ" صفحہ ۲۴

لڑائیوں کے لیے مناسب مقام نہیں ہوتے اور شہر دہلی کا موقع اور محل تو خاصا خراب تھا۔ شہر نشیب میں تھا، انگریزی فوج پہاڑی پر اونچی جگہ تھی۔ جتنی دیر بھی ہم نے مقابلہ کیا، وہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ نیز آپ نے مرزا مغل بہادر کو سپہ سالار بنا دیا تھا جنھیں فنونِ جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ باہر سے رسد لانا بھی سہل نہ تھا۔ اگر ہم باہر نکل جائیں گے تو بہت کچھ کر سکیں گے۔ بادشاہ بخت خاں کی تقریر سے بہت متاثر ہُوا اور کہا کہ اب تو ہم ہمایوں کے مقبرے میں جاتے ہیں، کل وہاں آ کر ملو گے تو آیندہ کے متعلق آخری فیصلہ کر لیا جائے گا۔[۱]

بہادر شاہ کی شخصیت اور ماحول

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس مشورے پر عمل پیرا ہونے کے بعد نتیجہ حسبِ مراد نکلتا یا نہ نکلتا، البتہ مشورہ ہر لحاظ سے صائب تھا۔ گزشتہ چار مہینے میں جو واقعات پیش آ چکے تھے، اُنھیں مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دینا صریح ہلاکت کو دعوت دینا تھا۔ نیز بادشاہ نے اختیاراً یا اضطراراً جس جہادِ آزادی سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا، اس کی عزت آبرو کا تقاضا یہی تھا کہ وہ آخری دم تک مقابلے پر ثابت قدم رہتا۔ یقیناً اس طرح دہلی کی تسخیر انگریزوں کے لیے بڑی حد تک بے معنی ہو جاتی اور ملک کی وسعت میں جو قوتیں انتظار کر رہی تھیں کہ جنگِ دہلی کے نتائج دیکھ لینے کے بعد کوئی قدم اٹھائیں، وہ بادشاہ کے باہر نکلتے ہی مقابلے کے لیے میدان میں نکل آتیں اور انگریزوں کے لیے اس طوفانِ عظیم کی روک تھام سہل نہ رہتی، لیکن اس اقدام کے لیے جس عزم و ہمت، جس جانفشانی و جانبازی کی ضرورت تھی وہ بہادر شاہ میں موجود نہ تھی، پھر وہ عمر کی بیاسی منزلیں طے کر رہا تھا۔[۲] وہ عالمگیر اعظم نہ تھا جو نوّے سال کی عمر میں بھی عساکرِ قاہرہ کے ساتھ قلعوں یا علاقوں کی تسخیر یا سرکشوں

---

[۱] دہلی کی جان کنی ص ۳۷ - ۳۹ [۲] بہادر شاہ ظفر کی ولادت ۲۸ - شعبان ۱۱۸۹ھ (۲۵ - اکتوبر ۱۷۷۵ء) کو ہوئی۔ گویا شعبان ۱۲۷۳ھ میں چوراسی سال کا ہو چکا تھا اور ہم جس واقعے کا ذکر کر رہے ہیں وہ ۲۸ یا ۲۹ محرم ۱۲۷۴ھ کا ہے۔

کی سرکوبی کی غرض سے کوہ پیمائی اور دشت نوردی کے لیے مستعد رہتا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کا ماحول عزم و ہمت کے ہر کام اور ہر عمل کے لیے ہر درجہ ناسازگار تھا۔

زینت محل اور الٰہی بخش

اس کی چہیتی بیگم زینت محل برابر یہ کوشش کر رہی تھی کہ بادشاہ انگریزوں سے بات چیت کرکے معاملہ ختم کردے۔ بیگم کو اپنی اور اپنے بیٹے جواں بخت کی حفاظت کا بہترین ذریعہ یہی نظر آتا تھا پھر بیگم پر میرزا الٰہی بخش کی باتوں کا خاص اثر تھا جو انگریزوں سے سازباز کر چکا تھا۔

میرزا الٰہی بخش کو باسورتھ سمتھ نے میجر ہوڈسن کو تنخواہ دار لکھا ہے[۲] گویا انگریزوں سے اس کے خصوصی تعلق میں کلام کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن اس بیان سے قطع نظر کرتے ہوئے خود انگریزوں نے لکھا ہے ۱۴۔ستمبر کی انگریزی یورش کی بعد میرزا چاہتا تھا کہ انگریزوں کی کوئی بہت بڑی خدمت انجام دے کر ان کی نظروں میں اعتبار حاصل کرلے اور بادشاہ کو گرفتار کرا دینے سے بڑی خدمت کوئی نہیں ہوسکتی تھی[۱]

چنانچہ اس نے بادشاہ کو سمجھایا کہ اگر آپ سپاہ کے ساتھ چلے جائیں گے تو بڑی مصیبتیں اور آفتیں جھیلنی پڑیں گی اور سپاہیوں کی شکست بہر حال یقینی ہے۔ اس وقت آپ انگریزوں کے سامنے کوئی عذر پیش نہیں کرسکیں گے اور باغیوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی ذمہ داری

---

[۱] میرزا الٰہی بخش کا شجرہ نسب یہ ہے: ہدایت افزا عرف الٰہی بخش بن شجاعت افزا عرف میرزا بچو، بن عزت افزا، بن ہمایوں بن عظیم الشان، بن بہادر شاہ اول۔ شہزادہ عزت افزا کی شادی عزیز الدین عالمگیر ثانی کی بیٹی عمدۃ الزمانی بیگم (ہمشیرہ شاہ عالم ثانی) سے ہوئی تھی اور خود میرزا الٰہی بخش کی ایک بیٹی بہادر شاہ ظفر کے دوسرے ولی عہد فخر الدین فتح الملک عرف میرزا فخرو سے بیاہی گئی تھی۔

[۲] لائف آف لارڈ لارنس جلد دوم صفحہ ۱۲۱

آپ پر عائد ہو گی، لیکن اگر آپ اس وقت ان سے الگ ہو جائیں گے تو کہہ سکیں گے کہ آپ ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ انگریز اس معقول عذر کو قبول نہ کریں۔ نیز باہر نکلیں گے تو پردہ نشین بیگمات، شہزادیوں اور شہزادوں کو کہاں کہاں لیے پھریں گے۔

آخر میں یہ بھی کہا:

> آپ باغیوں کے ساتھ تشریف نہ لے جائیں، میں انگریزوں سے مل کر تمام معاملات کی صفائی کرا دوں گا اور آپ پر یا آپ کی اولاد پر ایک حرف نہ آنے دوں گا۔[1]

باسورتھ سمتھ نے لکھا ہے کہ میرزا الٰہی بخش کی رگ رگ اور نس نس میں غداری رچی ہوئی تھی۔ وہ ہوڈسن کا تنخواہ دار تھا اور اس کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ نہ جانے دے، بلکہ ہمایوں کے مقبرے میں روکے رکھے۔ پھر اسے ہوڈسن کے حوالے کر کے اپنی اس عظیم الشان خدمت کی قیمت وصول کرے۔[2]

منشی رجب علی

اس المناک ڈرامے کے کرداروں میں زینت محل اور میرزا الٰہی بخش کے علاوہ ایک منشی رجب علی بھی ہے، جسے ارسطو جاہ کا خطاب دیا گیا۔ یہ جگراؤں ضلع لدھیانہ کا باشندہ تھا۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں۔

> سرکار انگریزی کے جو ایجنٹ، اس مخبری کے لیے کہ دشمن کیا حرکتیں کیا

---

[1] دہلی کی جان کنی ص ۸۱ نیز عروج عہد سلطنت انگلشیہ ص ۷۴۶۔ میلی سن کی ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی جلد ۴ ص ۵۰-۵۱۔ [2] لائف آف لارڈ لارنس جلد ۲ ص ۲۱۔ گرفن اور میسی نے تاریخ روسائے پنجاب مرتب کی تھی تو حالات خود ان روساء سے لکھوائے تھے۔ اس کتاب کی جلد اوّل میں میرزا الٰہی بخش کے حالات بھی درج ہیں۔ ان حالات کے ایک فقرے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ میرزا دورانِ محاصرہ میں انگریزوں کو شہر کی ضروری خبریں پہنچایا کرتا تھا۔

کرتا ہے، دہلی میں رہتے تھے، ان سب کے سردار منشی رجب علی
تھے۔ جاسوسی کے لیے جو اعلیٰ درجے کی لیاقتیں چاہئیں، وہ ان
میں تھیں۔ انگریز منتظموں کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے
کارفرماؤں کے ساتھ راستباز رہے۔ سچی بات دریافت کرلینے
کی عجیب قابلیت واستعداد اور فراست وکیاست رکھتے تھے[1]

میرزا الٰہی بخش کا سلسلہ ربط وضبط انگریزوں سے جوڑنے کا ذریعہ منشی رجب علی ہی تھا۔ چنانچہ بہادر شاہ کی گرفتاری نیز شہزادوں کی اسیری اور قتل میں انھیں دو شخصوں کا حصّہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔

زہرہ گداز حقائق مولوی سیّد رجب علی کے متعلق بعض حد درجہ زہرہ گداز حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً

۱- ہڈسن کی خبریں بہم پہنچانے کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور یک چشم سیدرجب علی صرف مخبری ہی نہیں کرتا تھا بلکہ دشمن (مجاہدین آزادی) کی صفوں میں اختلاف کا بیج بھی بو رہا تھا[2]

۱- حکیم (احسن اللہ خاں) پر انگریزوں سے خط وکتابت کا شبہ تھا اور کیتھ ینگ[3] ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شبہ بے بنیاد نہ تھا۔ جب حکیم کے مکان پر پہنچ کر تلاشی لی گئی تو ایک اشتباہ انگیز خط برآمد ہوا۔ کوپر کہتا ہے کہ یہ خط رجب علی نے دانستہ حکیم کے مکان پر رکھوا یا تھا تاکہ اس کے متعلق شبہ پیدا ہو[4]

---

[1] عروجِ عہدِ سلطنت انگلشیہ ص ۴۸۶۔ مولوی ذکاء اللہ کا بیان میلی سن کی تحریر کا چربہ ہے ملاحظہ ہو ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی جلد ۴ صفحہ ۵۳۔ [2] سین ص ۸۳۔

[3] KIETH YOUNG [4] سین کی کتاب ص ۹۴۔

تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ رجب علی نے انگریزوں کی ملازمت اختیار کر رکھی تھی اور وہ اس ملازمت کے بعض فرائض انجام دینے پر مجبور تھا لیکن اس نے تو وہ طریقے اختیار کیے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔ مثلاً آزادی کے مجاہدوں میں تفرقے پیدا کرنا، اونچے درجے کے لوگوں کو اپنی خفیہ تدبیروں سے عوام کی نظروں میں مشتبہ بنانا اور اس طرح مطلب برآری کا راستہ نکالنا، یہ سب کچھ رجب علی نے کیا جو اوائل اگست تک دہلی کے اندر مقیم تھا۔ جب جاسوسوں کی سخت دیکھ بھال شروع ہوئی تو وہ شہر سے نکل کر انگریزوں کے پاس پہنچ گیا۔ اسی نے بادشاہ اور شہزادوں کو گرفتار کرایا۔ اسی نے الٰہی بخش کے ذریعے سے زینت محل کو آمادہ کیا کہ بادشاہ پر دباؤ ڈال کر حوالگی کے لیے راضی کرے۔ اسی نے شہزادوں کو اس حالت میں گرفتار کرایا جب اسے معلوم ہو گیا کہ ہوڈسن ان کے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔ یقیناً اس معاملے میں رجب علی اور الٰہی بخش کا جرم سب سے پہلے سامنے آتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ الٰہی بخش اور تمام دوسرے کارندے سب خبریں رجب علی ہی کے ذریعے سے انگریزوں کو بھجواتے تھے۔

بیگم زینت محل

انگریزوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ نے بھی گفت و شنید شروع کرنے کی تدبیر اختیار کی تھی یعنی مٹکاف کو ایک خط بھیج کر اس کی صحت کے متعلق پوچھا تھا[۱] شہزادوں کے پیغامات ملے تھے[۲]۔ ۲۱ اگست کو زینت محل کی طرف سے قاصد پہنچا تھا کہ وہ بادشاہ پر اثر ڈال کر کشمکش ختم کرانے کے لیے تیار ہے[۳]۔ ہوڈسن نے فارسی کی ایک تحریر ایک پرزے پر لکھی ہوئی کیتھ ینگ کے حوالے کی تھی، جس میں یہ فقرہ بھی تھا:

میرزا الٰہی بخش اور زینت محل بیگم کے پاس تحریر بھیجی جائے تو اب بھی

---

۱ سین کی کتاب ص ۹۳۔ ۲ ایضاً ایضاً ص ۹۶۔ ۳ ایضاً ایضاً

محصورین سے مطلوبہ امداد حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس پر ۲۴- یا ۲۵- اگست کی تاریخ ثبت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ میرزا الٰہی بخش نے بیگم کو عجیب و غریب امیدیں دلا رکھی تھیں یعنی یہ کہ جواں بخت کی ولی عہدی کا اعلان ہو جائے گا اور بادشاہ کی سابقہ حیثیت بحال کر دی جائے گی۔ یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب حالات بگڑ گئے تو یہ کوشش شروع کی گئی کہ اب بچاؤ کی کوئی اور صورت پیدا کی جائے۔

بخت خاں کو جواب

بادشاہ ۱۹- ستمبر کی رات کو قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں گیا تھا۔ ۲۰- کو بخت خاں ملا۔ اس اثنا میں زینت محل بعد میرزا الٰہی بخش بادشاہ کو سپاہ سے علیحدگی پر راضی کر چکے تھے۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ میرزا الٰہی بخش بادشاہ کو رات کے وقت اپنے مکان پر لے گیا تھا اور وہیں نشیب و فراز سمجھا کر بخت خاں کی معیت میں روکا[1] ادھر منشی رجب علی کی طرف سے تاکیدی پیغام میرزا کے پاس آ گیا تھا کہ بخت خاں کے چلے جانے کے بعد صرف چوبیس گھنٹے کے لیے بادشاہ کو مقبرے میں روکے رکھیے باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں تمام انتظامات کر لوں گا۔[2]

ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کے مقبرے میں میرزا الٰہی بخش اور بخت خاں نے بہ یک وقت بادشاہ سے گفتگو کی۔ بخت خاں ساتھ جانے پر اصرار کر رہا تھا اور میرزا روکتا تھا، یہاں تک کہ بخت خاں ایک موقع پر میرزا کو ختم کرنے کے لیے تیار ہو گیا لیکن بادشاہ نے کہا کہ مجھے آپ کی رائے پسند ہے۔ تاہم جسم کی قوت جواب دے چکی ہے اور اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ جہاد جاری رکھیں، تاکہ ہندوستان کی آبرو رہ جائے۔[3] کمال الدین حیدر نے لکھا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ کی طرف سے بخت خاں کو یہ بتایا تھا کہ وہ بھاگنے کے لیے تیار نہیں۔

---

[1] میلی سن جلد چہارم ص ۵۴ [2] ایضاً ص ۵۴ [3] دہلی کی جان کنی ص ۴۲

فی الحقیقت بادشاہ کو یقین واثق تھا کہ ان کے (حکیم صاحب کے)
واسطے سے صفائی حکام سے حاصل ہو جائے گی اور معیت فوج
میں سراسر مذلت و خرابی۔ یہاں کے ٹھہرنے سے بہ ظاہر نان خشک
منظور ہے لیکن سفر رنگون کی خبر نہ تھی[1]

بہ ہر حال بیگم زینت محل کی کوتہ نظری و سطح بینی، میرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی کی فریب آرائی سے بخت خاں کو جواب مل گیا۔ اسے بے حد قلق ہؤا۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ بہادر شاہ کی قسمت میں یہی تھا کہ تاریخ کے صفحات پر خون مظلومیت کا ایک دھبا بن کر رہ جائے اور یہی ہوا۔

میجر ہوڈسن

میرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کو روک لیا اور منشی رجب علی کو خبر پہنچادی۔ اس نے یہ خوشخبری ہوڈسن کو سنا دی، جس کے ماتحت وہ مخبری و جاسوسی کے کام پر مامور تھا۔ ساتھ ہی بتا دیا کہ بادشاہ، زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کی جان بخشی کا حتمی فیصلہ کیے بغیر حوالگی کی منزل بہ خیر و عافیت طے نہ ہو گی۔ ہوڈسن انگریزی فوج کے سپہ سالار جنرل ولسن کے پاس پہنچا اور بادشاہ کو جان بخشی کے وعدے پر گرفتار کرنے کی اجازت مانگی۔ ولسن اس وعدے کے لیے تیار نہ تھا، لیکن دوسرے افسروں کے مشورے کی بنا پر اس نے ہوڈسن کو اجازت دے دی اور وہ پچاس سوار لے کر ہمایوں کے مقبرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ شخص ابتدائے ملازمت میں خاصی ناموری حاصل کر چکا تھا لیکن ۱۸۵۶ء سے پیشتر اس کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا تھا۔ اس پر رشوت ستانی کا الزام بھی لگا تھا اور اس نے ایک دیسی رئیس سے بے انصافی کے جرم کا ارتکاب بھی کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۵۲

اس کے لیے از سر نو ناموری کی بحالی کا موقع پیدا کر دیا تھا۔ وہ بڑا سنگ دل اور تند خو تھا۔ میلی سن کے قول کے مطابق کسی انسان کی تکلیف و محیبت اس کے دل میں کوئی خلش پیدا نہیں کر سکتی تھی اور وہ قتل و خونریزی کو کھیل سمجھتا تھا۔ مفروروں کو بے پروایانہ موت کے گھاٹ اتارنا اور مفتوحوں کو لوٹنا اس کے لیے انتہائی مسرت انگیز مشغلہ تھا۔[۱]

گفت و شنید یہ شخص تھا جو بادشاہ کی گرفتاری کے لیے مامور ہوا۔ کمال الدین حیدر کے بیان کے مطابق منشی رجب علی بھی اس کے ہمراہ تھا، بلکہ منشی ہی نے مقبرے میں جا کر پہلے بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کی پھر ہوڈسن کے آنے کی اطلاع دی۔ اس اثنا میں ہوڈسن مقبرے کے بیرونی دروازے کے قریب ایک خستہ حال عمارت میں ٹھہرا رہا۔

اگرچہ میرزا الٰہی بخش نے سب کچھ طے کر کے ہوڈسن کو اطلاع بھیجی تھی تاہم معلوم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں پھر بادشاہ کی رائے بدل گئی۔ اسے یقیناً رہ رہ کر خیال آتا ہو گا کہ انگریزوں سے اچھے سلوک کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ بلاشبہ بخت خاں کے ساتھ چلے جاتے میں تکلیفوں اور مشقتوں کا بھی قوی اندیشہ تھا مگر قید و پابندی کی اس زندگی سے، جس کا تجربہ تین پشتوں سے اس کے سامنے تھا، آزادی کی زندگی بہرحال بہتر تھی۔

چنانچہ پھر بحث شروع ہو گئی، جس کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا۔ زینت محل اور میرزا الٰہی بخش کا اصرار تھا کہ جان بخشی کا وعدہ قبول کر کے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ بادشاہ پر تامل و تذبذب کی کیفیت طاری تھی۔ بڑی ردوکد کے بعد ہوڈسن کے پاس پیغام بھیجا گیا کہ جان بخشی کا اقرار کرو تو حوالگی کے لیے قدم اٹھایا جائے۔ ہوڈسن نے بے تامل اقرار کر لیا۔ اس کے بعد مقبرے سے نکلنے کی تیاری ہوئی۔

---

[۱] قیصر التواریخ جلد چہارم ص ۵۲۔

چنانچہ سب سے آگے بیگم زینت محل کی پالکی تھی۔ اس کے پیچھے مرزا جواں بخت کی سواری تھی۔ سب سے آخر میں خود بادشاہ ہوادار پر سوار تھا۔ ہوڈسن یہ دیکھتے ہی پناہ گاہ سے نکل کر دروازے کے سامنے آگیا اور شاہی ہوادار کے برابر پہنچ کر اس نے کہا کہ ہتھیار دے دیے جائیں۔ بادشاہ نے پوچھا تم ہوڈسن بہادر ہو؟ جواب اثبات میں ملا تو کہا کہ میں تمھاری زبان سے بھی ایک مرتبہ اپنی نیز بیگم اور شہزادے کی جاں بخشی کا وعدہ سننا چاہتا ہوں۔ ہوڈسن نے وعدہ دہرایا اور بادشاہ نے ہتھیار حوالے کر دیے۔

حوالگی

ایک قلق افزا مسئلہ

ایک امر پر رہ رہ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور قلق بھی کہ بادشاہ نے صرف بیگم اور شہزادہ جواں بخت کی جاں بخشی تک مطالبہ کیوں محدود رکھا؟ باقی بیٹوں، پوتوں اور خاندان کے دوسرے شہزادوں کو کیوں اس وعدے میں شامل نہ کیا؟ کیا زینت محل اپنے بیٹے کے سوا کسی کی جاں بخشی کی روادار نہ تھی؟ کیا میرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کو یہ سمجھا دیا تھا کہ اتنا وعدہ لے لیا جائے، باقی انتظام خود بخود ہو جائے گا؟ کیا باقی بیٹے بہادر شاہ کے لخت جگر نہ تھے؟ کیا تمام شہزادوں کی رگوں میں وہی خون نہیں دوڑ رہا تھا جو بہادر شاہ کی رگوں میں رواں دواں تھا؟ یہ معاملہ بخت خاں کی موجودگی ہی میں طے ہو جانا چاہیے تھا۔ انگریز اسے قبول نہ کرتے تو بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ نکل جانا چاہیے تھا۔ شہزادے لڑ کر جان دے دیتے تو ان کی موت بابر و تیمور کے گھرانے کا سرمایہ عزت و احترام ہوتی۔ جس بیچارگی کی حالت میں تیموریوں کا خون انگریز کے ہاتھوں بہا، اس میں عزت کا کون سا پہلو تھا؟ ان کی مظلومیت پر یقیناً بے اختیار دل بھر آتا ہے، لیکن تیموریوں کی اصل شان میدان جنگ کی موت تھی، نہ کہ بے دست و پائی کی حالت میں برسر راہ گولیاں کھانا یا پھانسیاں پانا یا قید خانے کی کوٹھڑیوں میں جانیں دینا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا حالات، کیا واقعات اور کیا اسباب تھے، جن کی بنا پر دورِ آخر میں دورِ اول کی کوئی بھی خصوصیت پیدا نہ ہو سکی۔

اسیری کی پہلی منزل ہمایوں کے مقبرے سے سواریاں سج سج شہر کی جانب روانہ ہوئیں۔ کل چھیانوے افراد بادشاہ کے ساتھ تھے، جن میں سے زینت محل، تاج محل، جواں بخت، حکیم احسن اللہ خاں، میرزا قیصر شکوہ، میر فتح علی اور فوجدار خاں کے نام قیصر التواریخ میں مذکور ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ بادشاہ کو دہلی دروازے سے شہر میں نہ لایا گیا، جو ہمایوں کے مقبرے سے قریب ترین راستہ تھا، بلکہ لاہوری دروازے کا رُخ کیا گیا، جو مغربی سمت میں تھا اور چاندنی چوک میں سے گزار کر اُسے لال قلعے میں پہنچایا گیا[1]۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت بادشاہ کے جذبات کیا ہوں گے۔ وہی لال قلعہ تھا۔ جس کا دیوان خاص کبھی تخت طاؤس سے مزین تھا اور بڑے بڑے گردن افرازوں کے سر اُس کے سامنے جُھکتے تھے۔ وہی لال قلعہ تھا جس نے مغلوں کے دَورِ عروج اور ہندوستان کے شکوہ و شوکت کی وہ بہار دیکھی تھی، جس کی مثال شرق و غرب کی کوئی بھی بادشاہی پیش نہ کر سکی۔ اب اسی لال قلعے میں شاہ جہاں و عالمگیر کی میراث کا آخری حامل ایک بے بس اور بے کس قیدی کی حیثیت سے داخل ہو رہا تھا۔

انگریزی شرافت بادشاہ کی سواری نقار خانے کے پاس دیوان عام کے قریب رکھی گئی۔ اس نے انگریزی فوج کے سپہ سالار ولسن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ولسن نے انکار کر دیا اور اپنے ایڈیکانگ لفٹیننٹ میک ڈوول[2] کو بھیجا، ساتھ ہی ہدایت کر دی کہ بادشاہ پر انگریزی گارد کا پہرہ لگا دیا جائے اور اسے اس مکان میں رکھا جائے جو قلعے میں بیگم زینت محل کا تھا۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی۔

قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ جب بادشاہ کی سواری دیوان عام کے سامنے رُکی تو

---

[1] "دہلی کی جان کنی" میں بتایا گیا ہے کہ اس طرح پورے شہر کو بادشاہ کی حوالگی کا یقین دلانا مقصود تھا۔

[2] MC. DOWELL

انگریز افسروں نے :

زبانِ طعن و تشنیع بہ فحش کھولی ، گویا سارے بخارات بادشاہ پر نکالے ایک ساعت تک یہ مینہ برستا رہا ۔ جتنے بخارات نکالے ، مثل مشہور ہے "مردہ بدست زندہ" بعدازاں ایک صاحب نے بادشاہ کی ران پر ہاتھ مارا ۔ غلام حبشی نے اسے اٹھا کر زمین پر دے مارا ۔ دو تین صاحبوں نے مل کر اس بادشاہ کو مار ڈالا ۔ وہ اپنے حق نمک سے ادا ہوا ۔[1]

ایک انگریز کی تصدیق

اس کی تصدیق ہاسورتھ سمتھ کے بیان سے بھی ہوتی ہے وہ لال قلعے پر قبضے کے بعد کی کیفیت بتاتا ہوا لکھتا ہے :

وہیں مسکین بوڑھا بادشاہ بھی دوبارہ پہنچ گیا تھا ، جو بے دست و پائی کی بناء پر باغیوں کے لیے ایک سہارا یا ان کے ہاتھ میں آلہ کار رہ چکا تھا ۔ وہ اپنے محل سے بے دخل ہو چکا تھا ۔ ایک کمرے میں اُسے رکھا گیا تھا اور اس کی موت و حیات کا فیصلہ درپیش تھا ۔ وہ افسروں اور سپاہیوں کی تذلیل و تمسخر کا نشانہ بنا ہوا تھا ۔ اس کے پاس ملکہ اور تیموری گھرانے کی شہزادیاں سمٹی بیٹھی تھیں .... وہ اجنبیوں اور بے رحموں کی شوخ نگاہوں سے چھپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں اور ایک مشرقی خاتون کے لیے غیروں کی نگاہ بازی کا مرکز بننے کی شرم موت سے بدتر ہوتی ہے ۔ اس سیاہ نصیب گروہ میں سب سے زیادہ خوش

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۵۳ ۔

> یا کم سے کم ناخوش خود یہ بڈھا بادشاہ تھا . . . . معلوم ہوتا تھا کہ
> (بڑھاپے کے باعث) وہ اپنی بدبختی اور ذلت سے قریباً
> بے حس ہو چکا تھا۔[1]

یہ ظلم و تعدی کے اس دَورِ تاریک کی پہلی شام تھی جس میں بہادر شاہ کی حیاتِ مستعار کے باقی اوقات بسر ہونے والے تھے۔

ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ بہتر ہوتا، بہادر شاہ اپنی زندگی کا سودا نہ کرتا۔

مزید بیانات

(اس سودے کے بعد) اس کے ساتھ نہایت ذلیل اور بے حیثیت مجرم کا سا سلوک روا رکھا گیا۔ انگریز مردوں اور عورتوں سے جو چاہتا، اسے دیکھنے کے لیے چلا جاتا۔ گرفتھ نے بادشاہ کو گرفتاری کے دوسرے دن دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ وہ معمولی سی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ داڑھی بالکل سفید، میانہ قد، عمر ستر سال سے اوپر، لباس سفید دستار مخروطی وضع کی سفید پیچھے دو خادم کھڑے مور کے پروں والے پنکھے جھل رہے تھے۔ اس نے کوئی بات نہ کی۔ وہ رات دن چپ رہتا اور نظریں زمین پر جمی رہتی تھیں۔ اس سے تین فٹ کے فاصلے پر ایک اور چارپائی تھی جس پر پہرے داروں کا افسر بیٹھا تھا۔ دو قوی ہیکل انگریز سنتری سنگینیں چڑھائے دونوں طرف کھڑے تھے۔ انھیں حکم دے دیا گیا تھا، اگر بادشاہ کو بچانے کی کوئی کوشش کی جائے تو اسے فوراً گولی مار دی جائے۔[2]

ریکس[3] نے بادشاہ کو ماہ دسمبر میں دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک چھوٹے سے مکان میں اسے رکھا گیا تھا، جو پہلے اس کے ایک معمولی ملازم کے پاس تھا۔[4] مسز کوپ لینڈ[5] نے لکھا ہے کہ دروازے کے آگے پہرے دار پھر رہے تھے۔ ہم ایسے مکان میں داخل ہوتے

---

[1] باسورتھ سمتھ جلد دوم ص ۴۸ ۱۔
[2] سین ص ۱۱۲ ؍؍
[3] RAIKES,
[4] سین کی کتاب ص ۱۱۲ پر
[5] MRS. COOPLAND

جو میلا سا تھا۔ پردہ ہٹا کر ہم ایک معمولی سے کمرے میں داخل ہوئے، جس کی دیواروں پر سفیدی پھیر دی گئی تھی۔ وہاں ایک معمولی پلنگڑی پر بوڑھا، دبلا پتلا آدمی بیٹھا تھا۔ میلا سا سوتی لباس پہن رکھا تھا، لیکن رضائیوں میں لپٹا ہوا تھا اور حقہ پی رہا تھا۔ اس نے حقہ چھوڑ دیا اور ہمیں سلام کر کے کہا دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔[ا] بالکل اسی طرح کے بیانات دوسرے لوگوں کے ہیں، جنھوں نے بادشاہ کو اسیری کی حالت میں دیکھا تھا۔ انگریزوں کے لیے بادشاہ تماشا بن گیا تھا۔ جو چاہتا تھا بے تکلف اسے دیکھنے کے لیے چلا جاتا۔ مسز کوپ لینڈ کے بیان کے مطابق بادشاہ نے جو کچھ کہا، وہ اس کے سوا کیا کہا سکتا تھا۔ خلوت بھی اس کے اختیار میں نہیں رہی تھی۔

جان بخشی کا وعدہ

ہوڈسن نے ولسن کی اجازت سے جان بخشی کا وعدہ کر لیا تھا۔ اس کے بغیر بادشاہ حوالگی کے لیے تیار نہ تھا۔ اگرچہ دہلی فتح ہو چکی تھی، لیکن بادشاہ پر قابو پانا سہل نہ تھا۔ اور اگر وہ نکل جاتا تو انگریزوں کی مشکلات بہت بڑھ جاتیں۔ تاہم خود ہوڈسن بادشاہ کو زندہ لانے کا خواہاں نہ تھا۔ اس نے خود چار روز بعد لکھا: میری آرزو یہ تھی بادشاہ کو زندہ کے بجائے مردہ لاتا، حالانکہ چار ماہ کے واقعات میں اس کی سرگرم حصّہ داری سے ہوڈسن نے جرأت کا اعتراف کیا تھا، جب بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ بادشاہ سے جان بخشی کا وعدہ ہوڈسن کی نرم دلی کا مظاہرہ تھا تو ہوڈسن کو لکھنا پڑا:

> بہت سے لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ میں نے بادشاہ سے جان بخشی کا اقرار گرفتاری کے بعد کیا۔ مہربانی فرما کر اس کی تردید کر دیجیے۔[۲]

[ا] سین کی کتاب ص ۱۳ ؛ [۲] میلی سن جلد چہارم ص ۵۳۲ کا حاشیہ ۔

سول اور فوجی حکام میں کشمکش

گیرٹ نے ۱۹۳۲ء میں بہادر شاہ کے مقدمے کی رو داد از سر نو شائع کی تھی تو حکومت پنجاب کی سرکاری دستاویزوں کی بنا پر چار تمہیدی ابواب بھی لکھے تھے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جاں بخشی کے وعدے کے متعلق کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ ہوڈسن نے بادشاہ کو جنرل ولسن کے حکم کے مطابق جاں بخشی کے اقرار پر گرفتار کیا تھا۔ سول حکام کہتے تھے کہ اس باب میں سپہ سالار کو کوئی وعدہ کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ اختیارات کا مالک دہلی کا کمشنر سانڈرس تھا۔ وہی ایسا وعدہ کر سکتا تھا۔ ولسن سے پوچھا گیا تو اس نے تصدیق کر دی کہ ہوڈسن کو وعدے کا مجاز میں نے بنایا تھا۔

اس پر طویل خط و کتابت شروع ہو گئی۔ چونکہ اس اثنا میں ہوڈسن بمقام لکھنؤ قتل ہو چکا تھا، اس لیے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔[1]

گویا ہوڈسن، ولسن اور دوسرے فوجی افسروں کی تشدد جوشیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اُس عہد کے سویلین انگریز بھی حق و انصاف کے قاعدوں کو بالائے طاق رکھ کر زیادہ سے زیادہ ظلم و جور کے لیے بیتاب تھا۔

گیرٹ ہی نے لکھا ہے کہ ابتدا میں بادشاہ کو گرفتار کر کے میرٹھ بھیج دینے کی تجویز پیش نظر تھی،[2] بعد ازاں اسے دہلی میں رکھنا مناسب سمجھا گیا۔ بادشاہ کی گرفتاری کو عموماً ۲۱ ستمبر کا واقعہ بتایا گیا ہے، لیکن بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرفتاری ۲۲۔ ستمبر کو ہوئی۔[3]

ظہیر دہلوی کا بیان

ظہیر دہلوی نے داستانِ غدر میں بادشاہ کی آزادی کے آخری دنوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ دید نہیں، شنید پر مبنی ہے اور درست نہیں مثلاً یہ کہ:

۱۔ فوج باغیہ نے میگزین اُڑایا، پھر بادشاہ سے کہا کہ ہمارے ساتھ

---

[1] گیرٹ کی کتاب تمہیدی ابواب ص ۲ ۔ [2] گیرٹ کی کتاب، تمہیدی ابواب ص ۵ ۔ [3] ایضاً ایضاً

چلیے۔ بادشاہ نے جواب دیا، میں تمھارے ساتھ نہیں چلتا، میرا گھر برباد کرنا تھا کر چکے۔ جاؤ، جہاں تمھارا سینگ سمائے۔

۲۔ اس سے اگلے دن دہلی دروازہ کھلا اور سانڈرس نے آکر بادشاہ سے کہا کہ آپ شہر میں تشریف لے چلیں۔ بادشاہ نے کہا شہر سے مجھے کیا مطلب؟ دادا کے مزار پر آ پڑا ہوں۔ جو سلوک میرے ساتھ کرنا ہے، یہیں پورا کر دو۔ مولوی رجب علی نے کہا، آپ ایسا خیال ہرگز نہ فرمائیں۔ تشریف لے چلیں۔ ناچار تن بہ تقدیر بادشاہ نے فرمایا، بسم اللہ[1]

ایک تصویر

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے دربار دہلی کی نمائش گاہ میں ہوڈسن کے ہاتھوں بہادر شاہ کی گرفتاری کی ایک تصویر دیکھی تھی، جس میں بہادر شاہ عبا پہنے کھڑے تھے۔ ہاتھ میں عصا تھا، چہرہ غم و الم میں ڈوبا ہوا۔ ہوڈسن سرخ وردی پہنے بادشاہ کا دامن پکڑے کھڑا تھا اور اس کے دو ہمراہی بادشاہ کی پشت پر نظر آتے تھے۔ ہوڈسن کی اس بے باکانہ جرأت پر بادشاہ کا ایک جاں نثار تلوار سونت کر لپکا۔ ہاتھ میں ڈھال تھی اور چہرہ نڈھال۔ قریب پہنچتے پہنچتے برابر والے انگریز لشکری نے پستول سامنے کر کے حوصلہ پست اور جوشِ انتقام سرد کر دیا[2]

ظاہر ہے کہ یہ تصویر قیاس کی بنا پر بنائی گئی اور گرفتاری کے موقع پر کسی جاں نثار کا انگریزوں پر حملہ کرنا سراسر غلط ہے۔ البتہ قلعے میں ایک حبشی نے بادشاہ کے احترام پر اپنی جان قربان کر دی تھی، جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

---

[1] داستان غدر ص ۲۲

[2] دہلی کی جان کنی ص ۴۷

باب ۸

شہزادوں کا خونِ ناحق

شہزادوں کی مخبری

بادشاہ کی گرفتاری سے دوسرے دن منشی رجب علی اور میرزا الٰہی بخش دونوں اپنے آقا میجر ہوڈسن کے پاس پہنچے اور اطلاع دی کہ بادشاہ کے دو بیٹے اور ایک پوتا بھی ہمایوں کے مقبرے میں یا آس پاس چھپے بیٹھے ہیں۔ اس اطلاع نے ہوڈسن کی وحشیانہ خصلتوں میں ہیجان پیدا کر دیا[1] چنانچہ اس نے سپہ سالار سے اجازت لی اور اپنے دستے کے کماندار لفٹنٹ میکڈول نیز ایک سو سواروں کے ہمراہ مقبرے پہنچ گیا۔ منشی رجب علی اور میرزا الٰہی بخش بھی ساتھ تھے۔ ان کی وساطت کے بغیر شہزادوں سے گفتگو بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ نیز اگر بیچ میں کوئی مشکل اور خطرناک مرحلہ پیش آجاتا تو انھیں دونوں کی امداد اور صلاحیتِ سخن سازی کے بھروسے پر وہ بخیر و عافیت طے ہو سکتا تھا۔

شہزادے اور ان کے ہمراہی

شہزادوں میں سے دو بہادر شاہ کے بیٹے تھے، ایک میرزا مغل اور دوسرا میرزا خضر سلطان، تیسرا ابوبکر میرزا فخرو مرحوم کا بیٹا اور بہادر شاہ کا پوتا تھا۔ خضر سلطان وہی تھا جس کے متعلق غالب نے ایک غزل میں کہا ہے۔

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز　　　شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

---

[1] میلی سن جلد چہارم ص ۵۲۔

غالب کا شاگرد اور خاصا خوش فکر شاعر تھا۔

ان کے ساتھ متوسلین کی خاصی تعداد موجود تھی۔ بعض نے اس تعداد کو زیادہ مہیب ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ہوڈسن کی آیندہ سنگدلی کے لیے وجہ جواز پیدا ہو جائے۔ ہومز نے لکھا ہے کہ اس مجمع سے ہوڈسن نے ہتھیار رکھ دینے کا مطالبہ کیا تو پانسو تلواریں اور پانسو سے زیادہ بندوقیں جمع ہو گئیں۔[1]

خود ہوڈسن کا بیان ہے:

حوالگی کا مطالبہ

میں نے اپنے تمام انتظامات کر لیے۔ مقبرے میں داخل ہونے یا بچ نکلنے کی تمام راہیں بند کر دیں۔ پھر شاہی خاندان کی ایک چھوٹی شاخ کے ایک فرد کو (جسے جاں بخشی کے وعدے پر خرید لیا گیا تھا) اور اپنے یک چشم مولوی رجب علی کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ میں شہزادوں کو سزا ہی کی غرض سے گرفتار کرنے آیا ہوں اور اس کام کو پورا کرنے کا ارادہ کیے بیٹھا ہوں، خواہ کوئی صورت پیش آ جائے۔ دو گھنٹے کی لفظی نزاع اور امید و بیم کی اضطراب انگیز حالت کے بعد شہزادے نمودار ہوئے اور پوچھا؟ "آیا ہماری جاں بخشی کا وعدہ کرتے ہو؟" میں نے جواب دیا! "قطعاً نہیں" اور انھیں پہرے کی حفاظت میں شہر کی جانب روانہ کر دیا۔[2]

شاہی خاندان کی چھوٹی شاخ کے ایک فرد سے مراد میرزا الٰہی بخش ہے اور منشی رجب علی کو "یک چشم" اس لیے کہا گیا کہ اس کی ایک آنکھ بے کار ہو چکی تھی۔

مقابلے کا مشورہ

ہیلی سن نے لکھا ہے کہ شہزادوں کے ہمراہیوں میں سے من چلے آدمیوں نے ہوڈسن کو دیکھا تو التجائیں کیں کہ اس کا مقابلہ کیجیے اور لوگ جانیں لڑا دیں گے۔

---

[1] ہومز ص ۳۷۵۔ [2] ہوڈسن آف دی ہوڈسنز ہارس ص ۲۴۷۔

اگر یہ پیش کش قبول کر لی جاتی تو شہزادوں کے لیے بھی یہ راستہ عزت افزا
ہوتا اور ہوڈسن کی شہرت کے لیے بھی یہ صورت دس ہزار مرتبہ بہتر سمجھی جاتی
اس حالت میں انگریز کم از کم یہ کہنے کے قابل تو ہو جاتے کہ ہوڈسن نے
دشمنوں کو کھلی لڑائی میں قتل کیا۔[1]

ایک اور بیان مظہر ہے کہ شہزادوں نے رفیقوں سے صلاح کی تو انھوں نے کہا کہ
تیموری خاندان کے لوگ مجبور ہو کر قید نہیں ہوا کرتے، تلوار اٹھاتے ہیں اور لڑتے ہیں۔
ہمیں بھی یہی دلیرانہ کام کرنا چاہیے۔ مرنا ہی ہے تو پھر بہادروں کی موت کیوں نہ مریں۔[2]
افسوس کہ شہزادوں نے یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ کیا یہ سمجھا جائے کہ وہ حمیت اور مردانگی سے
خالی ہو چکے تھے یا یہ سمجھا جائے کہ میرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی کی باتوں نے انھیں فریب
تحفظ میں مبتلا کر دیا تھا، حالانکہ اس کے لیے کوئی گنجایش موجود نہ تھی۔

چند غور طلب امور

خواجہ حسن نظامی نے بھی لکھا ہے کہ میرزا الٰہی بخش کی نصیحتوں کے
باعث شہزادے لڑنے کے خیال سے دست بردار ہو گئے۔[3]
وہ نصیحتیں کیا ہو سکتی تھیں؟ یقیناً میرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی ہوڈسن کے عزائم سے
بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ حقیقت بھی آشکارا ہو چکی تھی کہ ہوڈسن شہزادوں کے ساتھ حفظ جان
کا کوئی وعدہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ پھر انھیں کیوں احساس نہ ہوا کہ حوالگی یقینی موت ہے
اور لڑائی میں بچ نکلنے کے امکانات موجود ہیں؟ میرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی نے کیوں
ان بے چاروں کی جانیں معرض ہلاکت میں ڈالیں؟ کیا اس لیے کہ خود ان مخبروں کی خدمات
گراں قدر ہو جائیں؟ جن شہزادوں نے ان کا کچھ نہ بگاڑا تھا، ان کے خونِ ناحق سے خدمات

---

[1] ہیلی سن جلد چہارم ص ۵۵۔

[2] دہلی کی جان کنی ص ۵۰۔

[3] دہلی کی جان کنی ص ۵۰-۵۱۔

کی دستاویزیں تیار کرنا کسی بھی انسان کے لیے باعث فخر و مباہات نہیں ہو سکتا تھا، چہ جائیکہ دو بہ ظاہر بلند مرتبہ مسلمان اسے پسندیدہ سمجھتے، جن میں سے ایک خاندان سادات میں سے تھا اور دوسرے کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا تھا جس کے بہائے جانے کے اسباب پیدا کرنے میں سرگرمی دکھائی گئی۔

شہادت گاہ کی طرف روانگی

غرض شہزادے سائبان والی بیل گاڑی میں مقبرے سے باہر نکلے۔ ایسی ہی گاڑیوں میں وہ ہتھیار بھرے ہوئے تھے جو ہوڈسن نے اس اثناء میں مجمع سے رکھوا لیے تھے۔ شہزادوں کی گاڑی کے دونوں جانب ہوڈسن نے پہرے لگا دیے اور گاڑی والے کو لاہوری دروازے کی طرف چلنے کی ہدایت کر دی۔ لوگ اس گاڑی کے پیچھے بھی اسی طرح روانہ ہوئے جس طرح ایک دن پہلے بادشاہ کی سواری کے پیچھے روانہ ہوئے تھے۔ ہوڈسن کے ایک سو سوار گاڑی اور مجمع کے بیچ میں تھے۔ کسی طرح کا رشتہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لوگوں کے حوصلے اتنے پست ہو چکے تھے کہ وہ کوئی مخالفانہ قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اگر ان کی طرف سے مزاحمت ہوتی تو یہ امر ہوڈسن کے لیے یقیناً باعث مسرت ہوتا، اس لیے کہ وہ خون کا پیاسا تھا۔ وحشیانہ خصائل کے غلبے نے اس کے تمام نازک احساسات کند کر دیے تھے۔ مقام گرفتاری سے شہر دہلی تک مسافت کا ⅘ حصہ طے ہو چکا تھا اور اس اثنا میں مجمع کی طرف سے مخالفت کی خفیف سی حرکت بھی سرزد نہیں ہوئی تھی۔

خونِ ناحق

شاید ہوڈسن کی آرزو تھی کہ مجمع کی طرف سے کوئی حرکت سرزد ہو اور وہ اپنی دلی خواہش پوری کرے۔ آخر اس نے اپنے سواروں پر ہجوم کے دباؤ کو بہانا بنایا۔ گھوڑا دوڑا کر بیل گاڑی کے پاس پہنچا۔ شہزادوں کو حکم دیا کہ گاڑی سے اتر آئیں اور اوپر کا لباس اُتار دیں۔ پھر اپنے سواروں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں گویا ہوا تاکہ ہجوم بھی سُن لے،

> یہ قیدی وہی قصاب ہیں، جنھوں نے انگریز عورتوں اور انگریز بچّوں کو قتل کرایا۔ حکومت کا منشا یہ ہے کہ انھیں موت کی سزا دی جائے

یہ کہتے ہی اپنے ایک سوار سے قرابین لی اور تینوں بے دست وپا شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

خود سنگ دل ہوڈسن کا بیان ہے کہ میں نے شہزادوں کو یکے بعد دیگرے گولی سے مارا۔ مجمع کے لبوں پر "اللہ اکبر" کی صدا جاری ہوئی اور دہشت زدہ مسلمان چپ چاپ آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔[1]

> میں بے درد نہیں، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ ان بدبختوں کے وجود سے زمین کو پاک کر دینے کا موقع ہاتھ آنے پر مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ انھیں پھانسی پر لٹکواؤں گا، لیکن جب حالات نے یہ صورت اختیار کر لی کہ "وہ رہیں گے یا ہم" تو میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا[2]

ایک بے سروپا افسانہ

آخری فقرے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہوڈسن شہزادوں کو شہر میں لانا اور مقدمے کے بغیر انھیں موت کی سزا دلوانا چاہتا تھا، لیکن ایک بڑا ہجوم شہزادوں کے ارد گرد جمع ہو گیا اور اندیشہ تھا کہ ہوڈسن اور اس کے ایک سو سواروں پر حملہ کر کے شہزادوں کو چھین لیا جائے گا۔ بعض انگریز افسروں نے بھی، جن میں ہوڈسن کا ساتھی میکڈول بھی شامل ہے، یہی افسانہ تراشا تھا کہ ہجوم کی طرف سے بلوے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، حالانکہ یہ افسانہ بالکل بے سروپا تھا۔ ہوڈسن ایک روز

---

[1] یہ پورا نقشہ میلی سن کے بیان پر مبنی ہے۔ جلد چہارم ص ۵۵ - ۵۶۔

[2] ہوڈسن آف دی ہوڈسنز ہارس ص ۲۴۸۔

بیشتر بادشاہ، بیگم اور شہزادہ جواں بخت کو گرفتار کر کے لے گیا تھا اور اس پر کوئی بلوا نہیں ہُوا تھا اور لوگوں کی عقیدت کا مرکز و مرجع بادشاہ تھا، نہ کہ شہزادے۔ پھر ہوڈسن خود اپنے بیان کے مطابق مقبرے کے سامنے بہت بڑے ہجوم سے ہتھیار لے چکا تھا۔ کم از کم پانسو تلواریں اور اس سے زیادہ بندوقیں۔ نیز مقبرے سے شہر تک راستے کا بیشتر حصّہ بخیر و عافیت طے ہو چکا تھا۔ یہ عذر سراسر لغو ہے کہ شہزادے زندہ رہتے تو مجاہدین آزادی، جن کی تعداد خاصی بڑی تھی، دوبارہ جنگ کے لیے تیار ہو جاتے۔ ان کی عقیدتوں کا اصل مرکز یعنی بادشاہ زندہ تھا، شہزادہ جواں بخت زندہ تھا۔ میرزا مغل، میرزا خضر سلطان اور میرزا ابوبکر کو قتل کر دینے سے کون سا مدعا پورا ہو سکتا تھا؟ میلی سن نے بالکل درست لکھا ہے کہ شہزادوں کا قتل "غدر" سے متعلق نہایت دردناک واقعات میں سے ایک واقعہ ہے۔[1]

واضح شہادتیں

خود ہوڈسن کے بیان سے بھی ثابت ہے کہ وہ شہزادوں کے قتل کا ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ مثلاً اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اس نے واقعہ قتل پر خوشی محسوس کی اور ان مظلوموں کو بہ حالت بے چارگی "بدبخت" قرار دیا، جن کے وجود سے روئے زمین کو "پاک" کرنا وہ ضروری سمجھتا تھا۔ پھر وہ مسلسل جان بخشی کے مطالبے کو مسترد کرتا رہا۔ علاوہ بریں اس کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ہوڈسن "بدمعاش شہزادوں" کو گرفتار کرنے کی اجازت لینے کے لیے جنرل ولسن کے پاس پہنچا تو وہ راضی نہ ہُوا۔ نکلسن نے بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے فوری اور سخت کارروائی پر اصرار کیا تو ولسن نے یہ کہتے ہوئے اجازت دی کہ یاد رہے انھیں میرے لیے وقت اور پریشانی کا سامان نہ بنانا۔ ہوڈسن نے جواب دیا:

> بادشاہ کے متعلق بھی آپ کے حکم کے سوا کوئی چیز آپ کے لیے
> پریشانی کا باعث نہیں ہوئی تھی۔ میں تو اسے زندہ کے بجائے

---

[1] میلی سن جلد چہارم ص ۵۷۔

مُردہ دہلی لانے کا خواہاں تھا[1]

سب سے آخر میں یہ کہ جب ہوڈسن سے جواب طلب کیا گیا کہ اس نے خود شہزادوں کو کیوں قتل کیا تو اس نے بے تکلف لکھا:

> جو بے گناہ عورتیں اور بچے ان حرامیوں کی درندگی کا شکار ہوئے ان کا خون پکارتا ہوا معلوم ہوتا تھا کہ تو ہمارا ہم وطن ہے اور تجھے قدرت نے ان افعالِ بد کا بدلہ لینے کے لیے بھیجا ہے۔ جس کام کو میں اپنا مقدس فرض سمجھتا تھا، اُسے اپنے ہاتھ سے انجام دینے میں ذرا سا بھی تامل کرتا تو میں آئندہ کسی انگریز کے سامنے آنکھ اونچی کرنے کے قابل نہ رہتا[2]

باسورتھ سمتھ کی صاف گوئی

لارنس کے سوانح نگار باسورتھ سمتھ نے اس بارے میں انتہائی صاف گوئی سے کام لیا ہے اور اس وجہ سے اصل فعل کی سنگینی کم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا مرتکب ایک انگریز تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> یہ سہ گانہ قتل ایک احمقانہ اور بے دردانہ قتل تھا۔ شہزادے ہوڈسن کے ہاتھ میں بے دست و پا قیدی تھے۔ ہمارے ہم وطنوں کے قتل میں شرکت کے متعلق نہ کوئی قابل ذکر شہادت دی گئی تھی اور نہ دی جا سکتی تھی۔ ان کی شناخت بھی اس غدار حرامی کی تنہا گواہی پر موقوف تھی، جو اپنے عزیز ترین دوست کی زندگی بھی قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جاتا، بشرطیکہ خود اُسے کوئی

---

[1] ہوڈسن آف دی ہوڈسنز ہارس ص ۲۶۶-۲۷۰۔ [2] ہوڈسن آف ہوڈسنز ہارس ص ۲۷۵۔

فائدہ پہنچ سکتا۔ اگر شہزادوں پر مقدمہ چلایا جاتا تو بڑے اہم اسرار کی پردہ کشائی ضرور ہوتی۔ ان کے بیسے جرائم کے متناسب سزا دی جاتی اور مجروح قانون کے صابرانہ طنطنے کے ساتھ یہ سزا ضرور نافذ ہوتی۔

اور وہ شخص کون تھا جس نے پولیس کے پیادے، مجسٹریٹ، جج، جیوری اور جلاد کا اختیار اور نہایت بھیانک اختیار بہ یک وقت اپنے ہاتھ میں لے لیا؟ وہ وہی تھا جس کے بارے میں پیشِ نظر شہادت کی بناء پر یہ کہتے ہوئے قطعاً باک نہیں کہ اس کا جرم شاہی خاندان کے کسی زیادہ سے زیادہ مجرم فرد سے کم ہرگز نہ تھا۔ اس فعل سے دراصل شخص کو مناسبت اور شخص سے فعل کو مناسبت تھی [1]

رابرٹس کا بیان

رابرٹس نے بعد ازاں فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس بنا، لکھتا ہے کہ فعل قتل ضروری ضروری تھا یا نہ تھا، لیکن بلا شبہ اس سے ہوڈسن کی شہرت کا دامن داغدار ہوا۔

دہلی کی دیواروں کے اندر جو ظلم و ستم ہو چکے تھے، ان کے سلسلے میں انتقام کی آگ اس وقت اس درجہ بھڑکی ہوئی تھی کہ فوج نے ہیجانِ جذبات کی بناء پر شہزادوں کے قتل کو منصفانہ فعل قرار دیا۔

میرے دل میں اس امر پر احساس رنج پیدا ہوا کہ ایک بلند پایہ

---

[1] لائف آف لارڈ لارنس جلد دوم ص ۱۲۲-۱۲۳۔ غدار حرامی سے اشارہ بہ ظاہر الٰہی بخش کی طرف سے مسز مٹر MRS. MUTTER نے لکھا ہے کہ ان تین شہزادوں میں سب سے بڑا میرا مغل سجیلا جوان تھا (دی سپاہی ریوولٹ ص ۱۴۳)۔

> سپہ گر نے اپنے آپ کو مخالفانہ نکتہ چینی کا ہدف بنایا۔ نیز میرے
> نزدیک جب تک شہزادوں کو بچا لینے کی کسی کھلی حرکت کا ارتکاب
> نہ ہوتا۔ ہوڈسن کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ بطور خود یہ کام کرتا
> یا بلا تحقیق و تفتیش اس کے کرنے کا حکم دیتا[1]

شہزادوں کی نعشیں قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ شہزادے رتھ پر سوار تھے اور سواروں کے حلقے میں چلے آرہے تھے۔ جیل خانہ کے قریب پہنچے تو ہوڈسن نے:

> سامنے بلوا کر، کپڑے اتروا کر، پھر اسی رتھ پر سوار کیا اور اپنے ہاتھ
> سے تین تین گولیاں مقام قلب پر ماریں اور شہ رگ کو سنگین سے چیر دیا۔
> اور اسی طرح چبوترہ کوتوالی میں جا کر نعشوں کو زمین پر ڈال دیا[2]

خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ ہوڈسن نے "تڑتڑ تین فیر کیے۔ شہزادے "ہائے دھوکہ" کہہ کر زمین پر گرے، خاک میں لوٹنے لگے اور کچھ دیر بعد جاں بحق ہو گئے[3]

کمال الدین حیدر کہتے ہیں کہ نعشیں تین روز تک کوتوالی کے چبوترے پر پڑی رہیں، پھر انھیں درگاہ خواجہ باقی باللہ میں دفن کرایا[4]۔ مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ کوتوالی میں چوبیس گھنٹے تک انھیں لٹکوائے رکھا[5]۔ حد درجہ دردناک بیان ونائک ساورکر کا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو موت کے وقت تک انتقام کشی کا ہدف بنائے رکھنا وحشیوں کا

---

[1] فارٹی ون ایرز ان انڈیا (ہندوستان میں اکتالیس سال) انتیسواں ایڈیشن ص ۱۲۹، [2] جلد دوم ص ۴۵۳ جیل خانہ وہی تھا جو اب ٹوٹا ہے یعنی دہلی دروازے کے باہر اور پرانی دہلی کے اس دروازے کے قریب جسے عام لوگ خونی دروازہ کہتے ہیں [3] دہلی کی جان کنی ص ۵۱، ۵۲ ایک واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہوڈسن نے شہزادوں کا خون پیا۔ میرے نزدیک یہ بات صحیح نہیں [4] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۵۲ [5] عروج عہد سلطنت انگلشیہ ص ۵۰۰

شیوہ ہے۔ ہوڈسن اگر شہزادوں کو مار کر رُک جاتا تو "مہذب" انگریز قوم کے جوشِ انتقام کی بھیت ہرگز آشکارا نہ ہو سکتی، لہٰذا ان کی نعشیں کوتوالی کے سامنے ڈال دی گئیں۔

جب گدھ کچھ مدت تک ان کا گوشت نوچ چکے تو سڑتے ہوئے
جسدوں کو کھنچوا کر دریا میں ڈلوا دیا گیا۔ آہ زمانے، تیرے انقلابات!
شاہنشاہ اکبر اعظم کی اولاد پر نماز جنازہ ادا کرنے اور انھیں آغوشِ
زمین میں سلانے والا بھی کوئی نہ تھا[1]

یہ ان خوفناک ستم آرائیوں، خونریزیوں اور غارت گریوں کا پہلا دور تھا، جن کا طوفان انگریزوں نے بپا کیا۔

بادشاہ کا بھتیجا مخبروں میں

بہادر شاہ کے بھائی میرزا بابر کا فرزند میرزا کالے مخبروں میں ملازم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے خاندان والوں پر ایسے ایسے ظلم کرائے، جنھیں سننے کے بعد بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے بے تکلف جھوٹ بولتا اور بے سروپا افسانے تراشتا۔ وہ ان شہزادوں کو بھی گرفتار کرا دیتا، جن کا ۱۸۵۷ء کے ہنگامے یا بادشاہ کی چار ماہہ آزاد حکومت سے کوئی تعلق نہ تھا، البتہ وہ شاہی خاندان ہی سے ضرور تھے۔ قلعے میں رہتے بھی نہ تھے۔ ان شہزادوں کو پٹی پڑھاتا کہ اگر اپنے آپ کو بادشاہ کے قریبی رشتہ دار بتاؤ گے تو معقول وظیفے مقرر ہو جائیں گے، انگریزوں سے جا کر کہتا کہ میں نے فلاں شہزادے کو پکڑوانے کا انتظام کر دیا ہے، جس نے آپ کے خلاف کارروائیوں میں نمایاں حصہ لیا تھا اور اسے پکڑوانا سہل نہ تھا[2]۔ انگریزوں کے دماغوں

---

[1] ساورکر کی کتاب طبع اول ص ۲۸۰۔ یہ کتاب ابتدا میں "ایک ہندوستانی قوم پرست" کے نام سے شائع ہوئی تھی لیکن سب کو معلوم تھا کہ اس کا مصنف ساورکر ہے۔ اب ازسرِ نو چھپ گئی ہے

[2] دہلی کی جان کنی ص ۶۸ نیز عروج عہد سلطنت انگلشیہ ص ۲۰۸۔

پر خون سوار تھا۔ وہ شہزادے کو پکڑتے اور پھانسی پر چڑھا دیتے یہ جو کسی نے کہا کہ:

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

تو یہ خیالی نقشہ نہ تھا بلکہ حقیقتِ حال کا صحیح مرقع تھا۔

بے گناہوں کا خون مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

دلّی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے، پکڑے گئے۔ ان کی تعداد انتیس بیان کی جاتی ہے۔ ان میں بوڑھے، لنگڑے، بیمار سب کے سب پھانسی میں لٹکائے گئے۔ سب سے زیادہ بوڑھا شہزادہ میرزا قیصر (ابنِ شاہِ عالم ثانی) اکبر شاہ کا بھائی تھا اور میرزا محمود شاہ، اکبر شاہ کا پوتا وجع مفاصل میں مبتلا تھا۔ ان کی لاش پھانسی میں گولا لاٹھی ہوئی لٹکتی تھی۔ . . . شہزادے بے تمیزی کے ساتھ پھانسی پاتے تھے[1]

شہزادہ میرزا قیصر کے متعلق بیان کیا گیا ہے، وہ اس قدر بوڑھے تھے کہ ہوش و حواس بھی بجا نہ تھے۔ ان سے امید ہی نہ ہو سکتی تھی کہ غدر میں کوئی حصہ لیا ہو گا، لیکن انگریز اندھے ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ تیموریوں کا زیادہ سے زیادہ خون ناحق بہا کر بھی ان کی پیاس نہیں بجھے گی۔ شہزادہ محمود شاہ وجع المفاصل کے باعث اُٹھ بیٹھ ہی نہ سکتا تھا۔ اس بے چارے نے کسی کارروائی میں کیا حصّہ لیا ہو گا۔ تاہم اس کے گلے میں بھی پھانسی کا پھندا ڈالے بغیر تسلّی نہ ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سر جان لارنس نے سفارش کی تھی شہزادوں کے معاملات کی تحقیقات واجبی کی جائے، لیکن اس سفارش پر کسی نے توجہ نہ کی۔

---

[1] عروج عہد سلطنت انگلشیہ ص ۴۰۸۔

باس ورتھ سمتھ نے بھی گرفتار شدہ شہزادوں کی تعداد انیس ہی بیان کی ہے وہ لکھتا ہے کئی انگریز افسر چاہتے ہیں کہ انھیں فوراً گولی ماردی جائے، لیکن جان لارنس نے انکار کردیا اور کہا کہ باقاعدہ مقدمہ چلایا جائے۔ جو انگریزوں کے قتل کے مجرم ثابت ہوں، انھیں ضرور موت کی سزا دی جائے اور ہڈسن کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے[1]۔ تاہم اس ہدایت سے جرم و بے جرمی میں کوئی امتیاز پیدا نہ ہوا۔

میرزا غالب کی تحریر

میرزا غالب لکھتے ہیں:

از شہزادگان بیروں ازیں نتواں سرود کہ اندکے را اژدرہائے مرگ بہ دہان زخم گلولہ تفنگ فروبرد، چندے را جسم بند چاتر بہ کشاکش رسن رواں در تن فسرد۔ چندازاں میاں زنداں نشین اند چندازاں دردماں آوارۂ روئے زمین۔ بر بادشاہ ارگ آرام گاہ کہ ماتم زدۂ تاب وتوان است فرماں گیرودار بہ اندر باز پرس رواں است۔

شہزادوں کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ چند کو اژدرہائے موت گولہ کے دہان زخم میں نگل گئے، چند پھانسیوں پر لٹکے اور جان ان کے بدن میں افسردہ ہوئی چند قید میں ہیں۔ اس خاندان کے چند آوارہ و سرگرداں پھرتے ہیں۔ بادشاہ جو قلعے میں رہتا تھا، تاب وتواں کا ماتمی ہے اور اس پر مقدمے کی داروگیر جاری ہے۔

اسیر شہزادے

جن شہزادوں کو قید کی سزا دی گئی۔ ان سے عام دستور کے مطابق مشقت لی جاتی تھی۔ وہ بیچارے مشقت کیا کرسکتے تھے ان سے چکی پسوائی جاتی، نہیں نہ سکتے تو کوڑوں کی مار پڑتی۔ یہاں تک کہ وہ بیچارے چند روز میں مرجاتے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کتنے مرتے۔ ان کا قصور اس کے سوا کیا تھا۔ کہ

---

[1] باس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۵۰ ٭

بہادر شاہ کے خاندان سے تھے۔

نواب احمد قلی خاں زینت محل کے باپ اور بہادر شاہ کے خسر تھے۔ وہ احمد شاہ ابدالی کے وزیر اعظم کی اولاد میں سے تھے۔ دہلی سے بھاگ گئے تھے، لیکن جھجر سے پکڑے آئے۔ بیچارے بوڑھے تھے۔ قید کی سختیاں برداشت نہ کر سکے اور قید خانے ہی میں وفات پائی۔[۱]

سر ولیم میور ولیم میور اس زمانے میں محکمہ مخابرت کا انچارج تھا۔ بعد ازاں اس نے اپنے محکمے کی دستاویزیں دو جلدوں میں مرتب کر دی تھی۔ ان میں سے شہزادوں کے متعلق کچھ معلومات ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ ۱۳۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء : بہادر شاہ کے بیٹوں، میرزا مینڈھو اور میرزا بختاور شاہ پر مقدمہ چلایا گیا۔[۲]

۲۔ ۱۳۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء : میرزا مینڈھو اور میرزا بختاور شاہ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔[۳]

۳۔ ۱۴۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء : بادشاہ کے تین بیٹوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ دو مجرم قرار پائے اور انھیں گولی سے ہلاک کر دیا۔ تیسرے کے خلاف مقدمہ جاری ہے۔[۴]

۴۔ ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء : چوبیس شہزادوں کو دہلی میں پھانسی دے دی گئی۔ ان میں سے دو بادشاہ کے بہنوئی تھے۔ دو سالے، باقی بھتیجے، بھانجے وغیرہ۔[۵]

---

[۱] غدر کا نتیجہ ص ۵۰، [۲] انڈین ملٹری اینٹلی جنس ریکارڈز جلد اول ص ۱۹۶ ، [۳] ایضاً ص ۱۹۹

[۴] انڈین ملٹری اینٹلی جنس ریکارڈز جلد اول ص ۱۹۶ ، [۵] ایضاً ص ۲۰۲

ہمیں اس اعتراف میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ بعض مواقع اور بعض مقامات پر مجاہدین آزادی سے بھی تجاوز ہوا اور معلوم ہے کہ ہنگامے کے دوران میں ان کے ساتھ بعض ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے ہوں گے، جن کے سامنے بلند نصب العین نہ تھا لیکن انگریزوں کی انتقامی کارروائیاں ان سے بدرجہا زیادہ ہولناک اور بے دردانہ تھیں اور یہ کارروائیاں منظم حکومت کے ذمہ دار افسروں کی تھیں، نہ کہ عام افراد کی۔

سید ظہیر دہلوی نے لکھا ہے کہ میرزا الٰہی بخش کی نشان دہی سے تیس شہزادگان دہلی کو جن میں بادشاہ کے پوتے، نواسے، داماد تھے۔ بیرون دہلی دروازہ قتل کیا گیا اور ان کے سر کٹوا کر بادشاہ کے پاس بھیج دیے گئے[1] یہ بھی محض شنید ہے جو صحیح نہیں، اگرچہ مولانا فضل حق نے بھی لکھا ہے۔

---

[1] داستان غدر ص ۱۳۴ ؎

باب ۹

دہلی میں لوٹ مار کی قیامت

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

قوتِ بیان کی بے بسی

یوں تو جنگِ آزادی کے ایک دو نہیں بیسیوں پہلو ایسے ہیں، جن کا تصور سامنے آتے ہی قوتِ بیان پر انتہائی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، لیکن فتح دہلی کے بعد شہر پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً جو قیامت گزری، اس کی سرسری کیفیت بھی پیش کرنا کم ازکم اتنا درد انگیز اور زہرہ گداز ضرور ہے، جیسا کہ دل کو پہلو سے نکال کر دہکتے ہوئے انگاروں پر ڈال دیا جائے۔ اگر کسی شخص میں اتنی ہمت ہو کہ قلم کا کام برقِ تپاں سے لے سکے اور سیاہی کی جگہ خونِ جگر استعمال کرے تو ممکن ہے، وہ اس آتشکدۂ ظلم و تعدی کی دھندلی سی تصویر تیار کرے، جو ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء سے دہلی میں انگریزوں نے بھڑکایا اور مہینوں تک شہر کا سرمایہ جان و مال خس و خاشاک کی طرح جل کر خاکستر بنتا رہا۔ شہر دہلی نے صدیوں تک یگانہ جاہ و جلال کی بہاریں بھی دیکھیں اور آتش و خون کے طوفانوں میں بھی غوطے کھائے۔ نادر و تیمور کی خونریزیوں کے متعلق عام تاثر کیا ہے؟ یہ کہ ان بے درد فاتحوں نے، جو دورِ وحشت کی یادگار تھے، نمایشِ اقتدار کے جنون میں انسانی خون کے دریا تاریخ کے صفحات پر بہا دیے، لیکن انگریزوں نے فتح کے بعد جو کچھ کیا، اس کے لیے تیمور و نادر کی مثالیں پیش کرنا بالکل لاحاصل و بے سود ہوگا، اس لیے کہ ذولیا خونچکاں مرقع دہلی کے آسمان نے پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ اس کے

بعد نظر آیا۔ اگر خاکِ دہلی کے ذرّوں کو قدرت تھوڑی دیر کے لیے قوتِ گویائی عطا کر دے تو شاید یہ داستانِ درد سنائی جا سکے۔ ہم یہ داستان زیادہ تر انگریزوں ہی کی زبان سے پیش کرتے ہیں تاکہ اس کی صحت میں کسی کو شبہ نہ ہو۔

عام کیفیت

۱۴ ستمبر کو انگریزی فوج کا عمل دخل کشمیری دروازے کی طرف شروع ہوا تو مجاہدینِ آزادی شہر سے نکل کر اجمیری دروازے سے دہلی دروازے تک پھیل گئے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ شہر کے اندر لڑنے کے بجائے باہر نکل کر لڑے۔ کشمیری دروازے اور کابلی دروازے کی آبادی بھی اجمیری دروازے، ترکمان دروازے، دہلی دروازے اور فراش خانے کی کھڑکی کی طرف سمٹ آئی۔ انگریزی فوج نے شہر کے مزید حصّے پر قبضہ کر لیا تو لوگ باہر بھاگنے لگے اور شاہ جہان آباد کی جنوبی سمت میں قطب صاحب تک پناہ گیروں ہی کے قافلے نظر آتے تھے۔ اس حالت میں مجاہدینِ آزادی کے لیے رزم و پیکار جاری رکھنے اور مقابلہ کرنے کی کیا صورت تھی؟

پھر ایک مصیبت یہ آئی کہ آس پاس کے گوجروں اور میواتیوں نے لُوٹ مار شروع کر دی۔ دہلی والے بھرے گھر چھوڑ کر بھاگے تھے، اس لیے کہ انگریز قتلِ عام کر رہے تھے۔ مولوی ذکاءاللہ لکھتے ہیں:

> سپاہ شہر کشا نے شہر میں قدم رکھا تو اس کے سامنے جو مرد آیا اس کو فوراً گولی مارتے۔ اس وقت دوست دشمن، مجرم و غیر مجرم میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس میں کچھ ہندو مسلمان کی تخصیص نہ تھی [1]

ایسی حالت میں لوگ ساتھ کیا لے جا سکتے تھے؟ تاہم جو کچھ بھی انھوں نے لے لیا تھا

---

[1] ذکاءاللہ ص ۷۰۵ ،،

گوجروں اور میواتیوں نے چھیننا شروع کر دیا۔ بدن کے کپڑوں کے سوا شاید ہی کسی کے پاس کچھ رہا ہو۔

کوئی کسی کھنڈر میں جا بیٹھا۔ کسی نے گڑھے میں ڈیرا جما لیا۔ قطب صاحب اور سلطان جی کے خادم ہمیشہ اہل شہر کی خیرات سے پرورش پاتے تھے۔ وہ تمام حقوق انسانیت کو پس پشت ڈال کر ایک ایک مکان اور مقبرے کا دس دس بیس بیس گنا مانگنے لگے۔ اہل شہر نے مصیبت کی حالت میں امانتیں ان خادموں کے پاس رکھ دی تھیں، بعض خادموں نے ان میں بھی خیانت کی[1]

مستورات کی بدحالی

جن عورتوں نے کبھی گھر سے قدم باہر نہ رکھا تھا، انھیں پیادہ پا چلنا پڑا۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ جو نامحرموں کی نگاہ کے سامنے آنے کو موت سے بدتر جانتی تھیں، بے پردہ صحرا نوردی کر رہی تھیں۔ غرض جو مصیبت ان پر پڑی تھی، جب سے دہلی آباد ہوئی تھی، کبھی نہ پڑی تھی۔ ہزاروں موت کی نذر ہو گئیں۔ ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی، اس میں بھی بے شمار مریں۔ ایسی خواتین بھی تھیں جنھوں نے دربدر خاک بسر پھر کر جینے کے بجائے مر جانا بہتر سمجھا۔ وہ کنوؤں میں کود پڑیں اور ڈوب گئیں:

> کنوؤں میں عورتیں اتنی گریں کہ پانی میں ڈوبنے کی جگہ نہ رہی۔ پھر جو ان پر اور عورتیں گریں، وہ زندہ رہیں ... چند سال بعد شہر کے کنوئیں صاف ہوئے تو بہت سے کنوؤں سے عورتوں کی لاشیں نکلیں[2]

عینی شہادت

۱۹۔ ستمبر کو لال قلعہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ رابرٹس ۲۴۔ کی صبح کو اس فوج کے ساتھ روانہ ہوا جو دہلی سے کانپور بھیجی گئی تھی۔ وہ لکھتا ہے:

---

[1] ذکاءاللہ ص ۲۰۲ ۔ [2] ایضاً ص ۲۰۴ ۔

صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک
تھا۔ (لال قلعے کے) لاہوری دروازے سے نکل کر ہم چاندنی چوک
میں سے گزرے۔ دہلی حقیقتہً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے
اپنے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے
نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں
بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش
نے طاری کردی تھی۔ ہر نعش تجزیہ وتحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔ ہم
چپ چاپ چلے جارہے تھے یا سمجھ لیجیے کہ بے ارادہ زیر لب
باتیں کر رہے تھے، تاکہ انسانیت کے ان دردناک باقیات کی
استراحت میں خلل نہ پڑ جائے۔ جن مناظر سے ہماری آنکھیں دوچار
ہوئیں، وہ بڑے ہی خوفناک اور انتہا درجہ رنج افزا تھے۔ کہیں
کوئی کتا کسی نعش کا برہنہ عضو بھنبھوڑ کر کھا رہا تھا۔ کہیں کوئی گدھ ہمارے
قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑپھڑاتے پروں سے ذرا
دور چلا جاتا تھا، لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر
حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ
اوپر اٹھے ہوئے تھے، جیسے کسی کو اشارہ کر رہا ہو۔ دراصل یہ
پورا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ بیان میں
نہیں آسکتا۔ معلوم ہوتا ہے ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری
تھا، اس لیے کہ وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے۔ پوری
فضا ناقابل تصور حد تک بھیانک تھی جو بڑی مضر اور مرض آور بدبو سے لبریز تھی۔[1]

---

[1] فارٹی ون ایرس ان انڈیا (ہندوستان میں اکتالیس سال) ص ۱۴۲۔

یہ بیان کسی تشریح کا محتاج نہیں اور صاف ظاہر ہے کہ دہلی پر قابض ہونے کے بعد پانچ روز تک مُردوں کے دفن کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ اگرچہ اس اثنا میں لوٹ اور مال اسباب کی فراہمی پوری سرگرمی سے جاری رہی۔

فوجی گورنر کرنیل برنؔ شہر کا فوجی گورنر مقرر ہُوا، جس نے قطب الدین سوداگر کی کوٹھی میں اپنا مرکز بنایا۔ یہ کوٹھی چاندنی چوک میں تھی۔ شہر میں تھوڑی سی آبادی رہ گئی تھی۔ لشکریوں کے جیش مقرر ہو گئے۔ جو بازاروں گلیوں کے چکر لگاتے۔ جہاں کسی گھر کو آباد پاتے، مردوں عورتوں بچوں، سب کو پکڑ کر برن کے پاس لے آتے۔ اوڑھنے بچھونے کے پشتارے مردوں کے سروں پر ہوتے۔ تلاشی میں جو چیز قیمتی ہوتی نکال لی جاتی اور جس اسباب کو چند کوڑی میں بھی کوئی نہ خریدتا، اُسے واپس دے کر لاہوری دروازے سے باہر نکال دیتے کہ جہاں سینگ سمائیں چلے جائیں۔ اس طرح باقی شہر بھی خالی کرا لیا گیا۔ صرف گنتی کے گھر آباد تھے۔ مثلاً:

۱۔ محلہ نیل کا کٹرہ، اس لیے کہ مکسریٹ کا گماشتہ میشری داس اسی محلے کا تھا۔

۲۔ حکیم محمود خاں شریف خانی کا خاندان، جسے مہاراجہ پٹیالہ سے قدیمی تعلق تھا اور مہاراجہ نے اپنی سپاہ کا پہرہ ان کے مکانوں پر بٹھا دیا تھا۔

۳۔ شیخ تراب علی کا مکان میر عاشق کے کوچے میں۔

۴۔ رائے سکھ دیال کا مکان ترکمان دروازے میں۔

۵۔ دیوان نہال چند کا مکان جو پٹیالہ میں دیوان تھے۔

---

[1] ذکاء اللہ ص ۳۰۴-۳۰۳۔ مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ میرزا غالب اور بدرالدین خاں گرفتار ہو کر کرنیل برن کے پاس پہنچے تو اپنے کمالات کی سندات دکھائیں جو انھیں ملکہ معظمہ سے حاصل ہوئی تھیں، لہٰذا انھیں چھوڑ دیا۔ اسی کرنیل برن کے متعلق میرزا غالب کا لطیفہ مشہور ہے کہ پوچھا تم مسلمان ہو؟ میرزا نے جواب دیا، آدھا شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔

میرزا غالب اس لیے بچ گئے کہ ان کا مکان حکیم محمود خاں کے خاندانی مکانوں کے پاس تھا اور ان سب کو سپاہ پٹیالہ کی حفاظت حاصل رہی۔ بدرالدین خاں مہر کن بھی بچے رہے۔

غیر خواہوں سے سلوک

پاس ورتھ سمتھ نے اسے خوش نصیبی قرار دیا ہے کہ شہر کے بیشتر باشندے باہر نکل گئے تھے، ورنہ خدا جانے کیسے کیسے خوفناک مناظر رونما ہوتے۔ شہر میں ایسے لوگ بھی موجود تھے، جو تمام ہنگامے کے دوران میں انگریزوں کے خیر خواہ رہے تھے اور انھوں نے سخت تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ وہ جانیں بچانے کے بجائے بچی کھچی جائیدادیں اور گھروں کا سامان محفوظ رکھنے کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ نہایت بُرا سلوک ہُوا اور بہ مشکل چند بچ سکے[1]۔

مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ جن خیر خواہوں کو گھروں میں آباد رہنے کے سرٹیفکیٹ مل گئے تھے، وہ بھی لُوٹ سے نہ بچ سکے۔ خوف کے سبب سے اپنا سارا مال اسباب چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ ان میں سے دہلی کے پروفیسر رامچندر کا ذکر بہ طور خاص کیا ہے[2]۔

---

[1] پاس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۴۶ [2] ذکاء اللہ ص ۲۰۲۔ پروفیسر رام چندر عیسائی تھا۔ ابتدا میں سرکش لوگ اس کی جان کے درپے رہے۔ بعد فتح دہلی ولیم میور نے اسے علمی نسخے اور تصویریں جمع کرنے پر مقرر کر دیا تھا۔ وہ سرکاری ملازم تھا اور اس کے پاس باقاعدہ سرکاری اجازت نامہ تھا۔ تاہم اس کے ساتھ جو سلوکیاں ہوئیں، ان کا سرسری مرقع یہ ہے: مکان پر مسلسل سنگ باری، دیوان عام کے چوک میں سے گزرتے وقت ایک انگریز نے سر پر ضرب لگائی اور کہا سلام کرو۔ ایک مرتبہ کے بجائے تین مرتبہ سلام کیا۔ انگریز گھوڑے پر سوار تھا، تھوڑی دُور آگے نکل گیا۔ پھر پلٹا اور کئی ضربیں لگائیں۔ ... ایک ہندو دوست سے لحاف درست کراتے۔ وہ لحاف واپس لا رہا تھا، دریا گنج میں ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ اس نے ایک لحاف چھین کر اپنے سائیس کو دے دیا۔ ساتھ ہی کہہ دیا، چپ چاپ چلے جاؤ ورنہ خوب ماروں گا۔ (ڈاکٹر سین کی کتاب ص ۱۱۹ - ۱۲۱)

لوٹ

فتح کے ساتھ ہی فوج کو تین روز کے لیے لوٹ کی اجازت دے دی گئی تھی۔ باس ورتھ نے لکھا ہے کہ اگر اجازت نہ دی جاتی تو سپاہ اس حالت میں بھی باز نہ رہتی۔ سکھوں اور دوسرے لوگوں کو معلوم تھا کہ دہلی میں اعلیٰ قیمتی سامان، جواہرات، سونے چاندی کے برتنوں اور روپے کے انبار لگے ہوئے ہیں:

> شکاری کتوں کی طرح جھول ڈال کر وہ گلی گلی اور بازار بازار پھر نکلے۔ ایک بے آباد گھر کے بعد دوسرے میں داخل ہوتے ہنرمندوں کی طرح آہستہ آہستہ دیواروں اور تختوں پر تھپکیاں مارتے فرش پر پانی ڈالتے اور دیکھتے رہتے کہ کہاں جلد مرتا ہے۔ پھر عقاب کی آنکھ یا سرخ ہندوستانی کے کان یا شکاری کتے کی ناک سے کام لے کر سیدھے گڑھے یا تہ خانے یا زمین میں دبے ہوئے برتن نکال لیتے، جن میں عمر بھر یا پشتوں کی بچائی ہوئی پونجی موجود ہوتی[1]

شہر خالی پڑا تھا۔ بلیوں کے سوا کوئی وہاں موجود نہ تھا۔ صورت حالات کیا تھی؟ باس ورتھ سمتھ لکھتا ہے کہ عمارتیں جابجا ٹوٹی پھوٹی نظر آتی تھیں۔ نعشیں بکھری پڑی تھیں جو سڑ رہی تھیں یا جانوران کا کچھ حصّہ کھا گئے تھے۔ جگہ جگہ سڑکوں اور گلیوں میں اعلیٰ درجے کے قیمتی گھریلو سامان کے ٹکڑے پڑے تھے۔ یہ سامان اس لیے توڑ پھوڑ کر بکھیر دیا گیا تھا کہ لٹیرے اُسے اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔ شہر میں کوئی نہ تھا اور پوری آبادی گرد و نواح کے دیہات میں بے بس پڑی تباہ ہو رہی تھی۔ اس منظر کا تصوّر آج بھی کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ یہ پتھر جیسے دل بھی ہلا دیتا[2] لیکن فاتح انگریزوں کے دل اس سے بالکل غیر متاثر تھے۔

---

[1] باس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۷۔۱۴۶ [2] ایضاً ص ۱۴۷

آپ ہوڈسن کی خونریزی اور بے دردی ملاحظہ فرچکے ہیں۔

ہوڈسن کے کارنامے آئیے اس کی غارت گری کا نظارا بھی کر لیجیے۔ باس ورتھ سمتھ کا بیان ہے کہ بعض انگریز افسروں نے کم ازکم وہ محلے محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی جن کے مالک اونچے درجے کے لوگ تھے اور وہ ہنگامے کے دوران میں اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اٹھا چکے تھے، اس لیے کہ انھیں انگریزوں کے خیر خواہ سمجھا جاتا تھا، لیکن ان افسروں کی کوششوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ہوڈسن اور اُس کے ساتھی لوٹ میں پیش پیش تھے۔

> ہوڈسن کے کیمپ میں مختلف جانور اور گاڑیاں موجود تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کی منظوری کے بغیر نہ آئی ہوں گی اور ہر شخص کو معلوم تھا کہ خود وہ (ہوڈسن) زیادہ ہلکا اور زیادہ قیمتی سامان سنبھال لینے میں کسی سے پیچھے نہ رہا۔ لکھنؤ میں اس کی موت کے بعد جن لوگوں کو اس کا سامان کھولنے کا دردناک فرض انجام دینا پڑا، انھیں شہر دہلی کی لوٹ کے نمونے بھی ملے۔[۱]

مزید شہادتیں ولیم میور کی کتاب میں واضح طور پر مرقوم ہے کہ سکھوں نے لوٹ میں بے اندازہ دولت جمع کر لی تھی۔ اور انگریز افسروں کو اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ لوگ لوٹا ہوا مال لے کر گھروں کو جائیں گے تو اُسے دیکھ کر دوسرے سکھوں کے منہ میں بھی پانی بھر آئے گا اور وہ اپنے گرد و پیش فراہمی مال کے لیے غیر آئینی ذرائع استعمال کرنے لگیں گے[۲] یعنی چوریاں کرنے لگیں گے یا ڈاکے ماریں گے۔

جان لارنس پنجاب سے ۲۴ر فروری ۱۸۵۸ء کو دہلی پہنچا تھا۔ وہیں اس کا سکرٹری

---

[۱] باس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۴۷-۱۴۸ [۲] ولیم میور کی کتاب جلد اوّل ص ۲۰۸

رچرڈ ٹمپل کلکتہ سے آگیا۔ ٹمپل لکھتا ہے

> شہر میں بالکل امن ہے اور کوئی تشویش نہیں، لہٰذا کسی قسم
> کا خطرہ خارج از بحث ہے۔ تاہم قتل و غارت کا سلسلہ اب
> تک جاری ہے[1]

دہلی کے کمشنر سانڈرس نے ۲۳-اکتوبر کو یعنی قبضے سے ایک مہینا اور چار روز بعد کہا:

> سپاہ کو کھلے بندوں لوٹ کی اجازت دے دینا حد درجہ بُرا
> ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو سپاہ نظم و ترتیب کو فراموش کر کے
> (بدمعاشوں کا) ایک انبوہ بن جائے گی[2]

الفنسٹن نے ۲۵- نومبر ۱۸۵۷ء کو جان لارنس کے نام ایک خط میں لکھا:

> دہلی پر قبضے کے بعد ہماری سپاہ نے وہاں جو کارروائیاں
> کیں، ان کے بعض نہایت دردناک کوائف میرے کانوں تک
> پہنچے ہیں۔ دوست دشمن کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جا رہا ہے،
> لوٹ اور غارت گری میں نادر شاہ کا کارنامہ بھی پیچھے چھوڑ دیا گیا۔[3]

پرائز ایجنسی

تین دن کی لوٹ کے بعد پرائز ایجنسی بنا دی گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ باقی رہ گیا ہو اس کی فراہمی کا انتظام یہ ایجنسی کرے۔ پھر ہر شے کو فروخت کر کے روپیہ سپاہیوں اور افسروں میں بانٹ دے۔ خود سپاہیوں نے ایجنٹوں کا انتخاب کیا۔ مولوی ذکاءاللہ فرماتے ہیں کہ اس محکمے کے سب سے بڑے کارپرداز کا نام ہندوستانیوں نے "کھدنی صاحب"[4] رکھا تھا۔ اس کے مختلف کارکنوں نے کام آپس میں تقسیم کر لیے۔ کسی نے

---

[1] باس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۵۹ ۔ [2] ایضاً ص ۱۵۵ ۔ [3] باس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۶۲ ۔
[4] کھدنی کے لفظی معنی تلاش، خصوصاً پوشیدہ چیزوں کی چھان بین ہے۔ چونکہ یہ عمل چھپا ہوا اور گڑا ہوا مال نکالتا تھا اس لیے "کھدنی" بہت موزوں نام تجویز ہوا۔

شہر کے تینوں کو توڑ کر اور زمین کھود کر مال نکالنے کا کام سنبھالا، کسی نے کتابیں جمع کرنے کا، کسی نے برتنوں، چارپائیوں اور چکیوں وغیرہ کی فراہمی کا۔ بیشتر لوگوں نے اسی وقت سے اپنا قیمتی مال زمین کے اندر دفن کروا دیا تھا، جب سے ہنگامے کا آغاز ہوا تھا اور یہ کام معتبر راجوں اور مزدوروں سے لیا گیا تھا۔ پرائز ایجنسی کی طرف سے اعلان ہو گیا کہ پوشیدہ مال کا پتہ دینے والے کو کمیشن ملے گا۔ راج مزدور خود آ آ کر بتانے لگے۔ ایک ایک چیز نکل آئی۔ تانبے پیتل کے برتن منصور خاں کی حویلی میں جمع ہوتے۔ پروفیسر رام چندر کی کوٹھی میں کتابوں کے ڈھیر لگتے۔ بعض لوگوں کو پیشتر کی دفن شدہ چیزوں کا علم نہ تھا، پرائز ایجنسی نے وہ بھی نکلوا لیں۔ مثلاً نواب محمد میر خاں کے مکان سے ساٹھ ہزار روپے برآمد ہوئے، جن کی خبر کسی کو نہ تھی۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ لوگوں نے خود اپنے دبے ہوئے مال کا پتا بتا دیا، اس لیے کہ اگر نہ بتاتے تو سارا پرائز ایجنسی کے حوالے ہو جاتا۔ بتا دینے سے کم از کم کمیشن تو ہاتھ آ گیا۔[1]

ذرا یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھ لیجیے کہ مال و دولت یا کتابوں کا سمیٹنا یا چاندی سونے کے برتن اٹھانا تو سمجھ میں آ سکتا ہے، تانبے پیتل کے برتن، چارپائیاں، چکیاں وغیرہ اٹھانے کا مطلب اس کے سوا کیا تھا کہ شہر کو بالکل صاف کر دینا منظور تھا، حالانکہ انگریزوں کے نزدیک بھی سب اہل شہر یقیناً گنہگار نہ تھے۔

پرائز ایجنسی مقرر ہو جانے کے بعد سپاہیوں کو لوٹ کی کوئی چیز باہر لے جانے کی اجازت نہیں دی تھی اور دروازوں پر پہریدار انھیں روک لیتے تھے، لیکن سپاہیوں نے یہ ترکیب نکالی کہ:

آپس میں دو گروہ بنتے۔ ایک شہر کے اندر آن کر مال کو فصیل سے

---

[1] ذکا ءاللہ ص ۱۴ - ۱۵

باہر اتارتا، دوسرا اُس کو اٹھا کر لے جاتا۔[۱]

ایک انگریز خاتون کا بیان

مسز مٹر (کرنیل مٹر کی بیوی) سب سے پہلی انگریز خاتون تھی جو تسخیر دہلی کے بعد میرٹھ سے پہنچی تھی۔ وہ لکھتی ہے کہ میرے شوہر کے سپرد یہی کام تھا۔ وہ ناشتے کے بعد قلیوں کی جمعیت لے کر نکل جاتا۔ جس عمارت میں دفینہ کی رپورٹ پہنچتی، اُسے دن بھر کھدائی کے لیے مقرر کر لیا جاتا۔ چھت اور صحن کی پیمائش احتیاط سے کر لینے کے بعد معلوم ہو جاتا کہ مال کہاں دبا ہوا ہے۔ ایک روز میں نے بعض احباب کو دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ کرنیل مٹر کے آنے میں دیر ہوئی۔ ایک مہمان نے بتایا کہ وہ تو نہ آسکیں گے، ایک مکان میں بڑا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔

بڑی دیر کے بعد میرا شوہر واپس آیا۔ اس کے ساتھ تیرہ گاڑیاں مالِ غنیمت سے بھری ہوئی تھیں۔ دوسری قیمتی چیزوں کے علاوہ اسی ہزار روپے نقد بھی تھے۔

ایک دوسرے موقع پر ایک مکان سے چاندی کے برتن اور سونے کے زیور نکلے چلتے چلتے ایک قلی سے کہا گیا کہ ذرا صحن میں بھی دو چار کدال چلا دو۔ چنانچہ پہلی ہی ضرب میں ایک ہزار کی تھیلی مل گئی۔ مزید کھودا گیا تو معلوم ہوا کہ اور تھیلیاں برابر رکھی ہوئی تھیں، لیکن تھیلیوں کا کپڑا بوسیدہ ہو چکا تھا اور رات اندھیری تھی، لہٰذا کھدائی کا کام صبح پر ملتوی کرنا پڑا۔

بعض مقامات پر دفینوں کی اطلاع ملی لیکن موقع پر پہنچنے سے پہلے ہی بدمعاش نکال کر لے گئے تھے۔ قلعے میں دیوانِ خاص کے باہر زیورات، جواہرات اور دوسرا قیمتی سامان ایک شامیانہ لگا کر سجا دیا گیا تھا تاکہ جو چاہے خرید لے۔[۲]

---

[۱] مکافات الشدائد ص ۱۴، ۱۵ ٭ [۲] مسز مٹر کی کتاب ص ۱۳۶ - ۱۴۰

مسلمانوں کی بربادی

مسلمانوں کی بربادی کے کئی پہلو تھے۔ بہت سے مارے گئے، سب کے گھر لٹے۔ سب کا مال تباہ ہوا۔ اکثر نے غربت کی مصیبتیں برداشت کیں۔ ریاستیں گئیں، جاگیریں چھنیں، پنشنیں ضبط ہوگئیں۔ مولانا ذکاء اللہ نے بربادی کا ایک ایسا پہلو پیش کیا ہے جو عام لوگوں کے خواب وخیال میں بھی نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے ہاں سُود حرام تھا لیکن پرامیسری نوٹ کے سُود کو بعض سنی اور کل شیعہ مسلمان حلال سمجھتے تھے۔ اس لیے جن جن کے پاس روپے تھے، انھوں نے پرامیسری نوٹ خرید رکھے تھے۔ جب دہلی میں انگریزی عملداری ختم ہوئی تو مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ اب اس کے دوبارہ آنے کا کوئی امکان نہیں، لہٰذا جو نوٹ خرید رکھے ہیں، جس قیمت پر بھی بکیں بیچ دینے چاہئیں۔ مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں میں کاروبار کی دور اندیشی بہت زیادہ تھی۔ انھوں نے سوچا کہ نقد روپیہ گھر میں رکھا تو ہوسکتا ہے مجاہدین خبر پاکر چھین لیں۔ نیز انھیں قرائن کی بنا پر یقین یا گمان غالب تھا کہ انگریز دوبارہ شہر پر مسلط ہوجائیں گے۔ لہٰذا انھوں نے نوٹ خرید لینے مناسب سمجھے کہ اوّل مجاہدین کی لُوٹ مار کا خدشہ نہ رہے گا، دوسرے انگریزی عملداری کی مراجعت پر خوب نفع کمائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے پینتالیس روپے فی صد کے حساب سے نوٹ خرید لیے۔ مسلمانوں کا روپیہ پہلے اس سودے میں ضائع ہُوا، پھر تسخیرِ دہلی پر یہ روپیہ گھروں میں چھوڑنا پڑا جو پورے کا پورا لُٹ گیا۔ اس کے برعکس ہندوؤں نے پچپن روپے فی صد نفع کمایا۔[1]

ہندوؤں کی خوش نصیبی

علاوہ ازیں پرائز ایجنسی کا زیادہ تر مال بھی ہندوؤں نے بہت سستا خریدا۔ دولت مند مسلمانوں کے جو مکان ضبط ہوکر نیلام ہوئے تھے وہ بھی ہندوؤں کے قبضے میں چلے گئے۔ مثلاً کلاں محل، مرزا جُبنہ بخت

---

[1] مولوی ذکاء اللہ کی کتاب ص ۱۸۰، ۱۸۱

کی حویلی، نواب جھجر کی کوٹھی، شیش محل، نواب منصور خاں کی حویلیاں، ان میں سے ایک ایک عمارت ایک ایک محلّے کے برابر تھی۔ پھر ہندوؤں کو بہت پہلے شہر میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔ مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ جب پرائز ایجنسی سب مال سمیٹ چکی تو ہندوؤں سے جرمانے لے کر ان کے محلوں کو آباد کرنا شروع کیا۔ سب سے زیادہ جرمانہ نیل کے کٹڑے سے لیا گیا، یعنی پچاس ہزار، حالانکہ یہ محلہ بڑا بھی نہ تھا۔ تاہم اس کی دولت مندی کے لحاظ سے جرمانہ زیادہ نہ تھا۔ غرض لاکھوں روپے جرمانے میں وصول کیے گئے[۱]۔ آباد ہوتے ہی ہندوؤں نے کاروبار شروع کر دیا۔ پرائز ایجنسی سے مال خریدا، جن میں بے شمار چیزیں عام ضرورت کی تھیں۔ جب مسلمانوں کو شہر میں آباد ہونے کی اجازت ملی تو ان کے ہاتھ یہ مال نفع پر فروخت کیا۔

مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ ہندوؤں نے لال ڈگی پر دکانیں لگالی تھیں۔ پرائز ایجنسی کے مال کے علاوہ وہ سپاہیوں سے بھی لوٹ کا مال خریدنے لگے اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ سستا مال انھیں کہیں نہ مل سکتا تھا۔ سپاہیوں کو نہ قیمت کا علم تھا اور نہ انھوں نے کوئی چیز پیسے دے کر خریدی تھی کہ پوری رقم وصول ہونے کا خیال ہوتا۔ چنانچہ اس بیوپار میں بھی ہندوؤں نے خوب فائدہ اُٹھایا۔

اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ جان لارنس نے دہلی آکر مسلمانوں کو آبادی کے سرٹیفکیٹ دیے، ساتھ ہی حکم دے دیا کہ وہ ڈیڑھ روپیہ دے کر دو چارپائیاں اور ایک چکی لے سکتے ہیں۔ اس طرح کچی کچی چارپائیاں اور چکیاں غریبوں کو سستے داموں مل گئیں[۲]۔

ہمہ گیر تباہی

آپ نے دیکھا کہ شہر انسانوں سے خالی ہوا۔ مال و دولت اور اسباب میں کچھ باقی نہ چھوڑا گیا۔ جو چیزیں اٹھائی نہ جا سکیں، وہ توڑ دی گئیں، لیکن

---

[۱] مولوی ذکاء اللہ کی کتاب ص ۱۵، [۲] ایضاً ایضاً

اس پر انگریزوں کا دل ٹھنڈا نہ ہُوا۔ اور سُنیے:

۱۔ مکانوں کے دروازے توڑ کر جلائے جاتے، ان میں سے پتیل لوہا نکال کر بیچا جاتا۔[۱]

۲۔ مندروں اور مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی۔ کسی بُت کی ناک کاٹی گئی، کسی کے کان کترے گئے، کسی کو ٹھکرایا گیا۔[۲]

۳۔ جامع مسجد سکھوں کی بارک بنی۔ زینت المساجد گوروں کا مسکن تھی۔ نواب حامد علی خاں کی مسجد میں، جو شیعوں کی سب سے بڑی مسجد تھی، گدھے بندھے۔[۳] سکھوں کے گوردوارے سے چپاں ایک مسجد تھی جو مہاراجہ جیند کو دے دی گئی اور مہاراجہ نے اُسے گوردوارے میں شامل کر دیا۔[۴]

۴۔ جو گھوڑے شہر میں رہ گئے تھے وہ سپاہیوں کی رانوں تلے دوڑنے لگے۔ بیل، ٹٹو، بھینسے، گدھے بوجھ اٹھانے کے کام میں لائے گئے۔ گائیں بھینسیں بکریاں سپاہیوں نے بانٹ لیں۔ مرغیاں، تیتر، بٹیر اور دوسرے خوب صورت پالتو پرندے بھون بھون کر کھا لیے گئے۔[۵]

کیا آپ نے کسی شہر کی بربادی کا ایسا نقشہ بھی تاریخوں میں ملاحظہ فرمایا ہے؟ کیا انتقام کی ایسی انسانیت سوز مثال بھی کہیں ملتی ہے؟

بے دردانہ قتل اگرچہ شہر انگریزی فوج کے آتے ہی بڑی حد تک خالی ہو چکا تھا، تاہم ایسے لوگ بھی تھے جو رہ گئے اور گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھے رہے، وہ بُری طرح قتل ہو گئے۔ گورے سپاہی تو عموماً بڑے بازاروں میں پھرتے تھے، سکھ تنگ گلیوں اور کوچوں میں بھی چلے جاتے تھے۔[۶] وہ مسلمانوں کے خُون کے پیاسے تھے۔

---

۱ مولوی ذکاء اللہ کی کتاب ص ۱۵۷ ، ۲ ایضاً ص ۱۶۷ ، ۳ ایضاً ایضاً ، ۴ ایضاً ص ۱۷۱
۵ ایضاً ص ۱۷۱-۱۸۷ ، ۶ ایضاً ص ۵۰۷

جس گلی کوچے میں کسی مسلمان کو وجیہہ یا تنومند دیکھتے، اپنا
شکار بنا کے دل کو ٹھنڈا کرتے۔ ان کے ہاتھ سے بہت سے معزز
خاندانی مسلمان جو بدقسمتی سے شہر میں رہ گئے تھے، مارے گئے۔ وہ
بوڑھے باپوں کے سامنے جوان بیٹوں کو مار ڈالتے اور باپ کو کہہ دیتے کہ
چلا جا۔ غرض حسین و وجیہہ مسلمانوں کو اتنا انھوں نے مارا کہ دلی میں خوش
صورت مسلمانوں کا پیدا ہونا ہی بہت کم ہو گیا۔ اگر دلی کے پہلے اور
اب کے مسلمانوں کی صورتیں ملا کر دیکھی جائیں تو معلوم ہو گا غدر نے ان
کی حسانت و وجاہت صورت کو بہت کم کر دیا ہے[1]

رؤسا و عمائد سے سلوک شہر کے رئیسوں اور عمائد میں بہت کم تھے جنھوں نے
مجاہدین آزادی کی اعانت کی ہو۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ
انھیں آزادی سے محبت نہ تھی یا وہ اجنبی اقتدار کو پسند کرتے تھے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ ہنگامہ
اچانک بپا ہوا۔ پھر سررشتہ نظم ابتدا ہی میں ایسے لوگوں کے حوالے ہو گیا جو کسی بڑے اور
ذمہ دارانہ کام کو سنبھالنے کے اہل نہ تھے۔ اس وجہ سے شرفا الگ تھلگ رہے تاہم ان میں
سے شاید ہی کوئی ہو جو قلعے یا کوتوالی میں یا کرنیل برن کے پاس یا حوالات میں نہ گیا ہو۔ پھر
بحالت اسیری چھوٹے بڑے، غریب امیر ایک ہی بیت الخلا کی کھڈیوں پر بیٹھ کر بے تکلف باتیں
کرتے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے جو لطیفہ بھی ہے اور حد درجہ دردناک
بھی۔ فرماتے ہیں کہ ایک غریب آدمی کوتوالی سے چھوٹ کر آیا تو اس نے کہا کہ آج میں نے
جانا شہر سے جلاوطن ہوا۔ جب تک حوالات میں تھا روزانہ بیت الخلا میں نواب حامد علی خاں،
مفتی صدر الدین خاں اور رؤسا شہر سے بے تکلف برابر کی باتیں ہوتی تھیں، اب یہ بات کب

---

[1] ذکاء اللہ ص ۱۲ء ۷

مجھے میسّر ہے۔

حکیم محمود خاں شہر کے ممتاز ترین شرفا میں سے تھے۔ ان کے خاندانی مکانوں پر مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ مخبروں نے اطلاع دے دی کہ ان کے مکان باغی مسلمانوں کی پناہ گاہ ہیں۔ تھیوفلس مٹکاف پولیس لے کر پہنچا اور پچاس ساٹھ مسلمانوں کو گرفتار کرا لایا۔ حکیم محمود خاں خود ساتھ ہو لیے۔ ایک رات کوتوالی میں رہے اور ان مسلمانوں کو رہا کرا کے لائے۔

مسلمان زیادہ تر خاص خاص مقامات میں جا رہے تھے مثلاً قدم شریف۔ مٹکاف ہر جگہ پہنچ کر پولیس کا گھیرا ڈال لیتا اور جوان، تنومند، وجیہہ مسلمانوں کو گرفتار کراتا۔ کوتوالی میں انھیں طرح طرح کی سزائیں دی جاتیں۔ کسی کو قید، کسی کو جرمانہ، کسی سے ضمانت جو ضمانت یا جرمانہ نہ دے سکتے، وہ اکثر قید میں رہتے۔[۲]

بعض مثالیں

امراء و شرفا کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ مفتی صدر الدین آزردہ مدت تک صدر الصدور رہ چکے تھے ان کی جائداد ضبط ہوئی۔ بڑی کوششوں کے بعد صرف ایک جزو واگذار کیا گیا۔

۲۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بہت بڑے امیر تھے۔ گرفتار ہوئے اور سات سال قید کی سزا پائی۔ اپیل پر رہا ہوئے۔

۳۔ سرکار اودھ کے رسالدار مینڈھو خاں کا بیٹا قدرت اللہ خاں کچھ مدت تک لال قلعے میں داروغہ خان سامانی رہا تھا، پھر لکھنؤ چلا گیا تھا۔ وہ بھی معرض باز پرس میں آیا۔ بڑی سرگردانی کے بعد امان لی اور لکھنؤ میں وفات پائی۔

---

[۱] ذکاء اللہ ص ۱۳۱۔ [۲] مولوی ذکاء اللہ کی کتاب ص ۵۱۷-۵۱۸۔

۴۔ میر اشرف علی خاں نیل بان شاہی پانی پت پہنچا۔ وہاں تین برس قید کی سزا ملی۔

۵۔ نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں بھی معرض باز پرس میں آئے۔ قلعے میں نظر بند رہے، مدت کے بعد رہائی پائی۔

نواب حامد علی خاں

نواب حامد علی خاں اعتماد الدولہ ولد میر فضل علی خاں نائب السلطنت اودھ کے بھانجے اور داماد تھے۔ کچھ مدت تک دربار دہلی میں وزیر بھی بنے تھے۔ ان کے متعلق سید کمال الدین حیدر نے عجیب واقعات بیان کیے ہیں، مثلاً:

۱۔ انھوں نے چھاؤنی کے جرنیل کی بیٹی اور ایک صاحب کی بیوی کو گھر میں چھپا یا تھا۔ یہ راز فاش ہو گیا۔ لوگ ہجوم کر کے آئے اور ان کا گھر لوٹ لیا۔ وہ شہزادہ ابوبکر کی پناہ لے کر بچے۔

۲۔ نواب صاحب اپنے بھتیجے کے ہاتھ مولوی رجب علی کے پاس شہر کی خبریں بھیجا کرتے تھے اور انگریزی فوج کو اپنے علاقے سے رسد بھی پہنچائی تھی۔

۳۔ شہر سے نکل کر برت خانے میں ٹھہرے اور ہوڈسن کو ایک لاکھ روپیہ دے کر برست جانے کی اجازت لی۔

۴۔ اپنے ساتھ دس ہزار آدمی لے گئے۔ خود اپنی بیوی عالیہ بیگم، سالی امراؤ بیگم اور اقربا کے ساتھ برست میں رہے، باقی لوگ ادھر ادھر چلے گئے۔

۵۔ ۱۹ صفر ۱۲۷۴ھ (۹۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء) کو کرنال کا کلکٹر دو سو سوار لے کر برست پہنچا اور حامد علی خاں کا سب سامان لوٹ لیا جو نو لاکھ کا تھا۔ عورتوں کے سر کی چادریں بھی نہ چھوڑیں

۶۔ نواب حامد علی خاں، عباس میرزا، یوسف میرزا، وزیر میرزا اور بائیس ملازمین کو گرفتار کر کے پیادہ کرنال لے گئے۔ وہاں سے شکرم پر سوار کر کے دہلی بھیجا۔

۷۔ بہت دنوں تک یہ لوگ قید رہے، دو آنے روپیہ خوراکی ملتی تھی۔

۸۔ ان کی خواتین نان شبینہ کو محتاج ہو گئیں۔ کہیں سے کوئی پرانی قنات ہاتھ آگئی تھی۔ اسی

کے ٹکڑے کر کے لحاف بنواتے۔

۹- قید سے رہائی کے بعد نواب حامد علی خاں نے وفات پائی[۱]

زہرہ گداز منظر اس ضمن میں دو اور اقتباسات ملاحظہ فرمائیے، جو ولیم میور کی کتاب سے ماخوذ ہیں:

۱- شہر کے تباہ حال باشندوں کو باہر نکال دیا گیا ہے تاکہ وہ بھوکوں مریں اور یہی یہ سمجھنے پر مجبور رہوں کہ ان کے ساتھ بے رحمی کا سلوک ہوا ہے۔ ۔ ۔ میرے نزدیک حکومت بنیوں اور کاشتکاروں سے بڑی سختی کا سلوک کر رہی ہے۔ شہر میں روزانہ لوٹ کا مال پایا جاتا ہے، وہ حد سے زیادہ ہے اور اس کی مقدار تصور میں نہیں آ سکتی۔ محاصرے کے دوران میں جو افسر یہاں موجود تھے، میں سمجھتا ہوں، وہ اب ملازمتوں سے سبکدوشی کے قابل ہو گئے ہیں[۲] (یعنی اتنی دولت جمع کر لی کہ انھیں ملازمت کی ضرورت نہیں رہی)۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے کہ فوجی حکام کی پالیسی نے بے گناہ باشندوں میں بلا امتیاز مصیبت ونکبت وحسرت کا طوفان بپا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بھی محفوظ نہیں رہے جو باغیوں کے ہاتھوں دہلی میں انتہائی تکلیفیں اٹھا چکے تھے[۳]

لارنس کا مکتوب جان لارنس نے غالباً دسمبر ۱۸۵۷ء میں، جب تسخیر دہلی پر دو مہینے سے زیادہ مدت گزر چکی تھی۔ انگریزی فوج کے کمانڈر کو لکھا کہ پرائز ایجنسی کو ختم کر دو۔

مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریق پر بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے، اس کے لیے ہم پر ہمیشہ

---

[۱] تبصرۃ التواریخ صفحہ ۲۶۴ - ۲۶۵۔ [۲] ولیم میور کی کتاب جلد اوّل ص ۲۲۵۔
[۳] ایضاً ایضاً ص ۲۷۱۔

لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل بالکل حق بجانب ہوگا۔ بہرحال دو مہینے کی لوٹ کو کافی سمجھنا چاہیئے۔ میرے پاس اس بارے میں بمبئی سے بھی شکائتیں پہنچ رہی ہیں۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے اگرچہ یقین نہیں آتا کہ افسر باہر نکل نکل کر دیسی باشندوں کو بے دردی سے قتل کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے سامنے بلند اصول نہ بھی ہوں، جب بھی عام مصلحتوں کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہم وطنوں کو اس قسم کی چیرہ دستیوں سے باز رکھیں۔ باغیوں اور قاتلوں کو پھانسی پر لٹکانے یا گولی سے اڑانے کے لیے مجھ سے زیادہ کوئی مستعد نہ ہوگا لیکن ہمیں دوست دشمن میں امتیاز کرنا چاہیئے۔ موجودہ صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام طبقے ہمارے خلاف متحد ہو جائیں گے اور چپا ولی جنگ شروع ہو جائے گی ملک آہستہ آہستہ ویرانی کی منزل پر پہنچ جائے گا پھر ہمارے لیے یہاں ٹھہرنا ہی ممکن نہ رہے گا۔[1]

---

[1] باس ورتھ سمتھ کی کتاب جلد دوم ص ۱۵۸ ؎

باب ۱۰

پھانسیوں اور گولیوں کا طوفان

شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

پھانسیاں

جو کچھ اُوپر بیان ہو چکا ہے، اس سے انگریزوں کے جوشِ انتقام کی تسکین نہ ہوئی اور خونریزی کی پیاس نہ بجھی۔ کوتوالی اور ترپولیے کے درمیان چاندنی چوک میں جو حوض تھا اس کے تین طرف پھانسیاں پانے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی، ایک گروہ کو پھانسیوں پر چڑھا دیا جاتا، باقی لوگ کھڑے ہوئے دیکھتے رہتے کہ ان کے خاتمے کے بعد ہماری باری آئے گی اور یہ مقام انگریزوں کی خاص "سیر گاہ" بن گیا تھا۔ پاس کے ایک موقع شناس دکاندار نے اپنی دکان کے سامنے کرسیاں رکھ دیں کہ انگریز بیٹھیں گے تو خوش بھی ہو جائیں گے اور کچھ دے بھی جائیں گے۔ چنانچہ انگریز افسر آتے، کرسیوں پر بیٹھتے، سگریٹ سُلگاتے، پھانسی پر چڑھنے والوں کی جان کنی کا تماشا دیکھتے اور چند پیسے دکاندار کو دے جاتے۔ مظلوم بے دم ہو جاتے تو ان کی نعشیں ایک بیل گاڑی میں ایک دوسرے کے اُوپر ڈال دی جاتیں۔ تاکہ نئے مظلوموں کے گلے میں پھندا ڈالا جائے[1]

طریقِ "انصاف"

ایک فوجی کمیشن بنا دیا گیا تھا، لیکن اسے نہ کسی ملزم کے متعلق چھان بین سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ یہ خیال تھا کہ جن کے خلاف جرم ثابت

---

[1] مولوی ذکاء اللہ کی کتاب ص ۱۱، نیز باس ورتھ سمتھ کی کتاب جلد دوم ص ۱۵۴ و

ہو جائے، انھیں کو سزا دی جائے۔" محاصرہ دہلی" (انگریزی) کا مصنف لکھتا ہے:

> ملزموں کو گرفتار کر کے مقدمات کی چھان بین کے لیے
> فوجی کمیشن کے روبرو پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہ کام بڑی تیزی سے
> ہوتا تھا۔ موت کے سوا کوئی سزا نہ تھی اور اثبات جرم کے سوا
> کسی مقدمے کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ جن اصحاب کا کام ملزموں کے
> جرم کی چھان بین تھا، وہ نرمی کے چنداں روادار نہ تھے[1]

خود باس ورتھ سمتھ نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر دس بارہ ملزم کمیشن کے روبرو پیش کیے گئے۔ ان کے خلاف ارتکاب جرم کی کوئی شہادت نہ تھی۔ کمیشن نے فرمایا کہ بظاہر یہ سپاہی معلوم ہوتے ہیں یا سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے کسی وقت ہتھیار اٹھائے ہوں گے۔ بس اسے کافی سمجھ لیا گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکائے گئے[2]

نیا کمیشن

یہ سلسلہ قتل عام اواخر ستمبر ۱۸۵۷ء سے اواخر فروری ۱۸۵۸ء تک جاری رہا۔ ۲۴۔ فروری ۱۸۵۸ء کو جان لارنس دہلی پہنچا تو اس نے وائسرائے کو تار دیا کہ ہر شخص کو موت و حیات کا جو اختیار دے دیا گیا ہے، اسے فوراً واپس لیا جائے، اس لیے کہ بعض نے اس اختیار کا ناجائز استعمال خوفناک طریق پر کیا ہے اور اس کی جگہ سول اور فوجی حکام کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو مقدمات سُنے، اور حکومت کی منظوری کے بغیر کسی کو موت کی سزا نہ دی جائے[3]

یہ ہو گیا لیکن جونہی لارنس دہلی سے باہر گیا، فوجیوں نے پھر وہی حرکتیں شروع کر دیں۔

---

[1] باس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۲۰۸۔ [2] ایضاً ص ۱۵۴۔ مصنف نے لکھا ہے کہ یہ تفصیلات زیادہ تر جنرل برن اور چیمبرلین سے ملیں جو موقع پر موجود تھے۔ [3] باس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۵۹

ایک گوجر کو موت کی سزا سنائی گئی اور اُسے منظوری لیے بغیر پھانسی پر بھی لٹکا دیا گیا۔ بعض فوجی افسر ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے کہ ابھی دہلی میں سختی کی حکومت بدستور جاری ہے[1]۔

پھانسی پانے والوں کے اصناف

مولوی ذکاء اللہ نے پھانسی پانے والوں کے اصناف کی تفصیل یہ بتائی ہے۔

۱۔ خاص برادران شاہی، جو قلعے میں تھے اور ان پر انگریز عورتوں اور بچوں کے خون کا الزام تھا۔ ان میں سے ایک بھی پھانسی سے نہ بچا۔

۲۔ میگزین کے ملازم جنھوں نے ہنگامہ شروع ہونے کے دن میگزین کے انگریز کارکنوں پر یورش کی تھی اور انھیں میگزین کو آگ دینے کی ضرورت پیش آئی۔ کریم بخش ان کا سردار تھا۔ ان میں سے صرف وہی بچ سکے جو بھاگ گئے اور ہاتھ نہ آ سکے۔

۳۔ وہ سپاہی جو اس درجہ زخمی ہو چکے تھے کہ بھاگ نہ سکے۔ یہ زیادہ تر مسجدوں میں پڑے ہوئے ملے۔

۴۔ وہ مجاہدین جو شہر کے اندر یا آس پاس چھپ گئے تھے اور پکڑے آئے۔

۵۔ اجمیری دروازے کے موچی۔ ان پر یہ الزام تھا کہ تھیوفلس مٹکاف آغاز ہنگامہ پر سوار ہو کر بھاگا تھا تو اجمیری دروازے کے راستے گیا تھا اور موچی بانس نکال نکال کر اسے مارنے دوڑے تھے۔

۶۔ میواتی اور گوجر جنھوں نے بڑی لٹس مچائی تھی[2]۔

آخری گروہ کا قصور بہ ظاہر یہ نہ ہو سکتا تھا کہ انھوں نے احترام مال کے ضابطے کو پس پشت ڈالا اس لیے کہ یہ ضابطہ "فاتح" انگریزوں نے دہلی میں مہینوں تک قائم ہی نہ ہونے

---

[1] ہاس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۶۰ ۔ [2] مولوی ذکاء اللہ کی کتاب ص ۱۰۱ ۔ ۱۱۰ ۔

دیا تھا۔ قصور یہی ہو سکتا تھا کہ جو مال گوروں یا سکھوں کو ملنا چاہیے تھا، وہ میواتی اور گوجرے گئے۔

ہفت گانہ ریاستیں دہلی کی ایجنسی کے ماتحت سات ریاستیں تھیں: جھجر، فرخ نگر، بلب گڑھ، بہادر گڑھ، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ ان میں سے ابتدائی تین کے والیوں کو پھانسی کی سزا ہوئی اور ریاستیں ضبط کرلی گئیں، چوتھے کی صرف ریاست ضبط ہوئی۔

کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان ریاستوں کے رئیس آزادی کے مجاہد تھے یا انھوں نے بہ طور خود جہاد میں کوئی سرگرم حصہ لیا لیکن جب دہلی سے انگریزوں کی حکومت اُٹھ گئی تو ان رئیسوں کے سامنے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہ رہی تھی کہ بادشاہ کے احکام کی تعمیل کریں خواہ وہ دل سے پسند کرتے تھے یا نہیں کرتے تھے۔ حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے، جن میں مجبور تھے، مگر اس پہلو کو کسی نے پیش نظر نہ رکھا اور انھیں موت کی سزا دلانے میں سب سے بڑا حصہ تھیو فلس مٹکاف کا تھا جو انتقام کا ایک خونی پیکر بن گیا تھا۔

جھجر نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کوئی سرگرم اور صاحب عزم آدمی نہ تھا۔ اس کے خسر عبدالصمد خاں نے علی الاعلان جہاد کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ برابر فوج لے کر انگریزوں سے لڑتا رہا۔

چونی لال اخبار نویس نے روزنامچے میں ۱۴ مئی ۱۸۵۷ء کے حالات بیان کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ نے جھجر، دادری، پاٹودی، بلب گڑھ، دوجانہ اور فرخ نگر کے رئیسوں کے نام دربار میں حاضر ہونے کا فرمان صادر کیا۔[1] جیون لال کے روزنامچے میں ایک سے زیادہ مقامات پر نواب کی طلبی یا مطالبۂ زر کا ذکر ہے۔[2] ظاہر ہے کہ وہ بیچارہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اس کی سپاہ اور متوسلین کی ہمدردیاں مجاہدین کے ساتھ تھیں۔

---

[1] دی ٹرائل آف بہادر شاہ طبع ۱۸۵۸ء ص ۱۶۲۔ [2] غدر کے دو روزنامچے صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳۔

مٹکاف کے بچاؤ کا مسئلہ

تھیوفلس مٹکاف دہلی سے بچ کر نکلا تو اس نے کچھ دن بھورا خاں میواتی کے پاس گزارے، پھر مناسب سمجھا کہ جھجھر چلا جائے، اس لیے کہ عام روایت کے مطابق اس نے نواب عبدالرحمٰن خاں کے والد پر کچھ احسان بھی کیے تھے اور خود نواب سے بھی اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ مٹکاف کے بچاؤ کی کہانی مرتب کرنے والوں نے بیان کیا ہے

> بغاوت کی جو آگ ملک میں پھیل رہی تھی۔ اس کا پہلا شعلہ مسٹر تھیوفلس کے پہنچنے کے وقت جھجھر پہنچ چکا تھا۔ قصبے پر ہنگامے کی کیفیت طاری تھی۔ نواب کی فوج میں جو ہندو ملازم تھے، وہ فوراً ملازمت چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ مسلمان سپاہی بھی بغاوت میں شامل ہونے کے موقع کا انتظار بے صبری سے کر رہے تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً "دین" "دین" کے نعرے لگا رہے تھے۔[1]

بتاریخ ۱۶ مئی نواب کو اطلاع ملی کہ ایک فرنگی دیسی لباس میں آیا ہے اور بہ طور مہمان ٹھہرنے کا خواستگار ہے۔ نواب نے اپنے خسر عبدالصمد خاں اور قاضی امداد علی کو بھیجا۔ جب معلوم ہو گیا کہ مٹکاف صاحب ہیں تو نواب صاحب نے ایک سو روپے نقد پیش کیے اور ساتھ ہی درخواست کی کہ یہاں سے چلے جانا بہتر ہوگا۔ تھوڑی دیر میں لوگوں کو مٹکاف کی آمد کا علم ہو گیا نواب نے حکم دیا کہ صاحب کو چپ چاپ اس کے خانہ باغ میں پہنچا دیا جائے۔ کچھ مدت بعد وہاں سے چلے جانے کا پیغام بھیجا اور مٹکاف نے ہانسی کا راستہ لیا۔ اگرچہ اسے [illegible] پہنچنے کی امید نہ تھی۔

ظاہر ہے کہ نواب مجبور تھا۔ مٹکاف کو اپنے پاس ٹھہرا لیتا اور لوگ جوش کی حالت میں اُسے قتل کر دیتے تو براہِ راست الزام نواب پر عائد ہوتا۔ اس نے اپنے خیال کے مطابق صاحب کو

---

[1] غدر کے دو روزنامچے ص ۲۴۲۔

بچانے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔ بایں ہمہ اس بے چارے کو مجرم گردانا گیا۔

گرفتاری اور مقدمہ

۱۸۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انگریزی فوج جھجر پہنچی تو نواب نے کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔ اسے چند روز دیوان عام میں قید رکھا اور مقدمہ قائم ہوا۔ الزام یہ تھا کہ ٹکاف نے بلوائیوں سے جان بچا کر پناہ طلب کی لیکن پناہ نہ دی۔ نبی خاں نے نواب کی طرف سے یہ عذر پیش کیا کہ ٹکاف کو جھجر سے چلے جانے کا پیغام رسالے کے افسر سنو سنگھ نے بھیجا جو چاہتا تھا کہ ٹکاف روانہ ہو تو اُسے راستے میں قتل کر دیا جائے اور نواب پر الزام نہ آئے۔ خود نواب کو اس پیغام کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ٹکاف کو حفاظت کی غرض سے بہادل گڑھی یا گنے میں بھیج دے۔ چنانچہ اپنے خاص کارندوں وزیر علی اور سعید الدین کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی۔[1]

"تاہم اس عذر پر کسی نے توجہ نہ کی، حالانکہ ٹکاف کے بچاؤ کی کہانی بیان کرنے والا خود لکھتا ہے:

> میرا غالب خیال یہ ہے کہ جھجر سے سر تھیو فلس کی روانگی کے بعد اس کے تعاقب کا ذمہ دار نواب کا رسالدار سنو سنگھ تھا۔[2]

پھانسی

بہر حال نواب کے لیے پھانسی کا حکم صادر ہوا۔ مسز مٹر کا بیان ہے کہ جب نواب سے پوچھا گیا، خاصی بڑی سپاہ کے باوجود انگریزوں کو بچایا کیوں نہ گیا تو اس نے کہا:

> انگلستان نے ان بدمعاشوں کو مسلح کیا اور فوجی تربیت دی جو ملک پر مصیبت لانے کا باعث بنے۔ مجھ سے یہ امید نہ رکھنا قرین انصاف نہ تھا کہ اپنے متوسلین کو ایسی فرمانبرداری پر مجبور کرتا جس پر ملک کے

---

[1] غدر دہلی کے دو روزنامچے (انگریزی) ص ۲۴۴ ۔ [2] ایضاً ایضاً

حاکم اور میری قسمت کا فیصلہ کرنے والے اپنے ملازموں کو مجبور کرنے میں ناکام رہے۔[1]

مسز مٹر اس بیان کو حیرت انگیز حد تک حق بجانب قرار دیتی ہے۔ مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ رئیسوں کی پھانسی کے لیے سہ پہر کا وقت مقرر تھا۔ شہر کے دروازے بند کر لیے جاتے تھے اور سپاہ کی ایک کمپنی باجا بجاتی ہوئی کوتوالی کے سامنے آن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ پھانسی پانے والے رئیس کو ایک کرانچی پر جس کے گرد کپڑا نہیں ہوتا تھا، اکڑوں بٹھایا جاتا تھا۔ پیچھے مشکیں کسی ہوئی تھیں، جن پر کپڑا ڈال دیا جاتا۔ کوتوالی کے چاروں طرف فرنگی تماشائی بیٹھے ہوتے تھے۔ مجرم کے گلے میں پھندا ڈال کر تختہ نیچے گراتے تھے تو فرنگی دلشاد ہو کر خندۂ دندان نما کرتے تھے۔[2]

مسز مٹر لکھتی ہے:

نواب نے پھانسی کے تختے پر اپنے انجام کا استقبال انتہائی دل جمعی، تحمل اور بُردباری سے کیا۔ میرا شوہر اس کمپنی کا کمان دار تھا جو اس موقع پر متعین کی گئی تھی۔ اس کے دل میں نواب کے لیے گہری عقیدت پیدا ہو گئی۔[3]

مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں کہ پھانسی پانے والوں کی نعشیں کرانچی میں اوندھے منہ ڈال کر شہر سے باہر کسی گڑھے میں دفن کی جاتی تھیں۔[4] مرزا معین الدین حسن خاں نے کہا ہے کہ نواب کو خواجہ باقی باللہ کی درگاہ کے احاطے میں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔[5]

والدہ کی حالت سید کمال الدین حیدر فرماتے ہیں کہ پھانسی کے وقت نواب کی والدہ

---

[1] مسز مٹر کی کتاب ص ۱۴۵-۱۴۶۔ [2] ذکاء اللہ ص ۷۰۹-۷۱۰۔ [3] مسز مٹر کی کتاب ص ۱۴۶۔

[4] ذکاء اللہ ص ۷۱۰۔ [5] مشکلات ص ۷۳۔

آگئیں۔ جب دیکھا کہ بیٹا لٹکا ہوا عالمِ سکرات میں تڑپ رہا ہے تو عجب نالہ و فریاد سے چلا کے بیٹے کی نعش سے لپٹ گئیں اور آغوش میں لے کر اتنا روئیں کہ بے دم ہو کر گر پڑیں۔ جتنے لوگ وہاں موجود تھے، وہ بھی رونے لگے اور اُسے بہ جبر نعش سے الگ کیا۔[۱]

راجا ناہر سنگھ راجا ناہر سنگھ والی بلب گڑھ کا جرم نواب عبدالرحمٰن سے زیادہ تھا اور اسے عام طور پر خبطی سمجھا جاتا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے، مشہور تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے[۲]۔ جان لارنس نے ایک خط میں دہلی کے کمشنر سانڈرس کو تحریر کیا:

> میں نے افواہ سنی ہے کہ بلب گڑھ کا راجہ ضعیف العقل ہے
> اگر یہ درست ہے تو اس امر کو کمیشن کے نوٹس میں لائیے۔ ان لوگوں
> کو پھانسی پر نہ لٹکانا چاہیئے، جو اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکتے۔[۳]

راجا کو بھی گرفتاری کے بعد دیوانِ عام میں رکھا گیا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ دہلی ریذیڈنسی کا ایک انگریز وکیل بلب گڑھ میں مارا گیا تھا اور راجہ نے اسے بچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اسے بھی ۹ جنوری ۱۸۵۸ء کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

مسز مٹر لکھتی ہے:

> راجا (ناہر سنگھ) کی موت بہت رنج افزا تھی۔ ہندو ہونے
> کی حیثیت میں اس کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ بھی ویسی ہی
> تھیں، جیسی مسلمان بادشاہ کے ساتھ۔ اوضاع و اطوار میں حلیم و شریف
> عمر میں نوجوان، وضع قطع میں وجیہ اور خوب صورت۔ قسمت کے چکر نے
> اس امیر کو ایسے حالات سے دوچار کر دیا۔ جن میں ہر طرح خطرات

---

[۱] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۵۶۴۔ [۲] ذکاء اللہ ص ۷۰۹۔

[۳] باسورتھ سمتھ جلد دوم ص ۵۶۔

سے لبریز تھا اور اس پر مقدمہ اس وقت چلا جب ہماری
حکومت کے خلاف ہر معاندانہ فعل کی سزا موت تھی۔ اس نے
ججوں کے سامنے جو آخری الفاظ کہے، وہ بڑے دردمندانہ تھے
وہ بولا: "میں ایک سرسبز اور لہلہاتے ہوئے درخت کی مضبوط
شاخ پر اطمینان و دلجمی سے بیٹھا تھا۔ میرے اپنے فعل نے
اسی شاخ کو کاٹ ڈالا۔" [1]

فرخ نگر اور بہادر گڑھ

فرخ نگر اور بہادر گڑھ کے رئیسوں کی گرفتاری اور مقدمات کی تفصیل نہیں مل سکی۔ اول الذکر (احمد علی خاں) کو پھانسی کی سزا ہوئی [2]۔ آخرالذکر (بہادر جنگ) نا ایسا مجرم ثابت ہُوا کہ موت کی سزا دی جاتی اور نہ اتنا بے جرم ثابت ہُوا کہ اس کی ریاست بحال رہتی۔ چنانچہ اس کی پنشن مقرر کر کے لاہور بھیج دیا گیا۔

کوچہ چیلاں میں قیامت

پھر آپ نے پھانسیوں کی عام کیفیت اور بعض رؤسا کی سزائے موت کے حالات ملاحظہ فرما لیے۔ اب آئیے، آپ کو کوچہ چیلاں کی قیامت کا واقعہ سنایا جائے۔ اس کوچے میں کسی شخص نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو دورانِ ہنگامہ انگریزوں کے لیے وجہ شکایت بنتی۔ اتفاق سے وہاں انگریزی لشکر کا کوئی سپاہی زخمی ہو گیا۔ اس باب میں روایتیں مختلف ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی سپاہی کسی زنانے میں گھسنا چاہتا تھا حکیم فتح اللہ یا محمد علی خاں (ابن شیر جنگ خاں) نے اسے روکا اور کشمکش میں وہ زخمی ہو گیا۔ اس پر:

---

[1] منٹگمری کی کتاب ص ۱۴۶ [2] معین الدین حسن خاں نے لکھا ہے کہ راجا ناہر سنگھ اور نواب احمد علی کی نعشیں بھی خواجہ باقی باللہ کی درگاہ کے احاطے میں دفن ہوئیں۔

حاکموں نے حکم دے دیا کہ اس کوچے کے تمام مردوں کو مار
ڈالو یا پکڑ کے لے آؤ۔ بہت سے مردوں کو تو سپاہیوں نے ان
کے گھروں میں مار ڈالا۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں کوئی مرد مارا نہ گیا ہو۔
کچھ آدمی زندہ بھی گرفتار ہوئے، جن کو حکم ہوا کہ جمنا کی ریتی میں قلعے
کے نیچے گولی سے مار دیے جائیں۔ سپاہی ان کو ریتی میں لے گئے
ان پر سپاہیوں نے صرف گولیوں کی ایک باڑ ماری۔ ان میں
سے دو آدمی مرزا مصطفیٰ بیگ اور وزیر الدین زندہ بچے[1]

یہ دونوں بیان کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ گولیاں لگتے ہی سرد ہو گئے۔ بعض دریا کی طرف بھاگے۔ آگ سے بچے مگر پانی میں ڈوب گئے۔ جانتے ہو ان مقتولوں میں کیسے کیسے افراد تھے؟ سید احمد میاں امیر پنجہ کش جو خوشنویسی میں اپنے وقت کا یگانہ جلیل القدر فرد تھا اور نوے سال کی عمر تھی۔ مولوی امام بخش صہبائی جو دہلی کے مشہور عالم اور معلم تھے، ان کے دو بیٹے اور کنبے کے کل اکیس فرد ان مظلوموں میں شامل تھے۔ صرف ان کا ایک بھانجا بچا جو اُن کا داماد بھی تھا یعنی وزیر الدین۔

دوسرا بیان

یہ مولوی ذکاء اللہ کا بیان تھا۔ مولانا راشد الخیری نے صہبائی کے بھانجے کا نام قادر علی بتایا ہے، جو صہبائی کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ دلّی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ میں صبح کی نماز اپنے ماموں (صہبائی) کے ساتھ کٹڑہ مہر پرور کی مسجد میں ادا کر رہا تھا۔ پہلی ہی رکعت تھی۔ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ اور گرفتار کر کے دریا کے کنارے پر لے گئے۔ فتح دہلی پر ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے کہا کہ موت تمھارے سامنے ہے، دریا تمھاری پشت پر ہے۔

---

[1] ذکاء اللہ ص ۵-۶-۲۰۶

تم میں سے جو تیرنا جانتے ہیں، وہ دریا میں کود پڑیں۔ ماموں اور ان کے صاحبزادے تو تیرنا نہیں جانتے تھے۔ دل نے گوارا نہ کیا کہ انھیں چھوڑ کر جان بچا لوں۔ لیکن ماموں کے اشارے سے کود پڑا۔ کوئی پچاس ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آواز میرے کان میں آئی اور صف بستہ لوگ گر گئے۔

غرض نادر علی بڑی تکلیفیں اٹھا کر جودھ پور پہنچا اور فوج میں صوبیدار ہو گیا۔ پنشن لے کر دہلی آیا۔

یہ انگریزوں کا انصاف تھا، جس کے آوازے سے نوّے برس تک اس ملک کی فضا گونجتی رہی۔ مفتی صدر الدین آزردہ نے کس درد سے کہا ہو گا:

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مرثیہ

کسی نے صہبائی کی وفات پر چند شعر کہے تھے، جنھیں بہ طور یادگار یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ندانم کجا رفت آں نعشِ پاک فلک بُرد یا ماند بر روئے خاک
(کچھ معلوم نہیں وہ پاک نعش کہاں گئی آسمان اٹھا کے لے گیا یا زمین پر پڑی رہی)

ندانم کسے داد او را کفن و یا ماند چوں سایہ بر خاک تن
(کچھ معلوم نہیں کہ اُسے کسی نے کفنایا یا وہ پاک بدن سایے کی طرح خاک پر پڑا رہا)

ندانم چہ کرد است با او سپہر زچارہ کفن کرد یا تاب مہر
(کچھ معلوم نہیں اس نعش کے ساتھ آسمان نے کیا برتاؤ کیا کپڑے کا کفن ملا یا سورج کی تپش کا)

بہ خاکش نمودند او را نہاں و یا مُرتفع شد سوئے آسماں
(اس کے بدن کو دفنایا گیا یا آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا)

کدامی گل و بلبل و بادِ دشت

کونی پھول، بلبل، جنگل کی ہوا

بہ خاکش بہ حسنِ عقیدت گزشت

اس خاک پر سے بہ حسنِ عقیدت گزری؟

نعشوں کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دریا میں بہا دی گئیں اور جمنا کے کنارے لے جا کر قتل کرنے کا مقصد یہی تھا کہ نعشوں کو دفن کرنے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ ایک روایت یہ ہے کہ دریا کے کنارے ہی گڑھے کھود کر نعشیں ان میں پھینکیں، اوپر سے مٹی ڈال دی

ہر طرف موت

کچھ لوگ یہ سمجھ کر اور چلے گئے تھے کہ وہاں دہلی کے آدمیوں کو عزت و اقتدار حاصل ہے اور ان کی وساطت سے بے جرمی کا ثبوت مہیا کرنے میں آسانی ہوگی، لیکن غلام فخرالدین مخبر وہاں بھی عزرائیل بن کر پہنچ گیا اور ایک ایک کو چُن چُن کر گرفتار کرا دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو گوڑگانوہ کے مجسٹریٹ نے درختوں سے بندھوا کر پھانسی دے دی۔ جنھیں دہلی میں لائے، انھیں یہاں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔[1]

جن لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں، ان میں سے بعض جوانوں کی مائیں بھی جگر کے ٹکڑوں سے آخری ملاقات کے لیے آ گئیں۔ اس وقت حشر کا جو منظر نمودار ہوا ہو گا، وہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ اکثر نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر ریشمی اور زرّیں سیلے بندھے ہوئے تھے، پیروں میں ٹاٹ بانی کی (زری کے کام والی) جوتیاں تھیں اور چست انگرکھے۔ مائیں چیخ رہی تھیں اور بیٹے دم بخود تھے۔ انگریزوں کو یہ نظارہ بھی متاثر نہ کر سکا۔

ان مظلوموں میں محمد حسین خاں، میرزا احمد خاں، میر محمد حسین، نوشیر خاں، خلیفہ اسماعیل

---

[1] ذکاء اللہ ص ۱۱۷۔

(فرزند ذوق مرحوم) اور رسالدار صفدر جنگ جیسے اصحاب بھی شامل تھے۔

مظفر الدولہ اور دوسرے اصحاب

مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں، نواب حسام الدین حیدر خاں کے فرزند اور نواب حسین مرزا ناظر شاہی کے بھائی تھے۔ انھیں کبھی کسی سرکاری کام سے تعلق نہیں رہا تھا۔ وثیقہ بھی ملتا تھا، جائداد بھی خاصی بڑی تھی، اطمینان سے دن گزارتے تھے۔ بعد فتح وہ بھی الور چلے گئے تھے۔ وہاں سے پکڑے آئے اور گوڑگانوہ میں پھانسی پائی یا گولی سے مارے گئے ان کے ذمے ایک یہ الزام لگایا گیا تھا کہ جب اودھ کا سفیر دہلی آیا تھا تو سابقہ معرفت کی بنا پر انھیں کے ہاں ٹھہرا تھا۔ حالانکہ سفیر کا محض قیام اور وہ بھی اس بناء پر کہ پہلے سے تعلقات تھے، مظفر الدولہ کو مجرم نہیں بنا سکتا تھا۔ اکبر خاں بنگش، امیر خاں بن مرتضیٰ خاں اور اس کا بیٹا عثمان خاں بھی اسی طرح مظلوم مقتول ہوئے[1]

اور سُنیے:

۱ــــ ایک ڈاکٹر کا شیوہ یہ ہو گیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا۔ ہر ایک سے پوچھتا ہندو ہے یا مسلمان؟ جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا[2]

۲ــــ نواب محمد حسن خاں نے ایک میم کی جان بچائی تھی، لیکن اس سے تعلق بھی پیدا کر لیا۔ اور وہ حاملہ ہو گئی۔ فتح دہلی کے بعد میم نے نواب کو پھانسی دلوا دی[3]

کیا یہ حالات کسی تبصرے کے محتاج ہیں؟ کیا میرزا غالب کا یہ شعر حرفاً حرفاً درست نہیں کہ:

شہر دہلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۵۹ ۔ [2] ذکاء اللہ ص ۱۲ ۔ [3] ذکاء اللہ ص ۱۲ ۔

بیدردی اور شقاوت

فریدالدین صبح کی نماز پڑھ کر آ رہے تھے، انھیں بے وجہ گولی ماردی گئی۔[1] حکیم رضی الدین جو دہلی کے نامور طبیب تھے، نیز ان کے بھائی احمد حسین خاں بھی اسی حالت میں مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے، احمد میرزا اور اصغر یار خاں ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے۔ وہ اتنے حسین و وجیہ تھے کہ شہر میں نکلتے تو لوگ انھیں دیکھنے کے شوق میں کھڑے رہتے۔ ہنگامے کے سبب واپس نہ جا سکے، انگریزوں کے ہاتھوں بے گناہ مارے گئے۔ میر چھوٹم نے پھانسی پائی۔ غالب کا عزیز شاگرد میر احمد حسین میکش فتح شہر کے بعد کتابیں خریدتا رہتا تھا، اچانک گرفتار ہوا اور بے سبب پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔[2]

سید ظہیر دہلوی کے خسر امیر میرزا اور ان کے بھائی ناصرالدین شہر میں رہتے تھے۔ ناصرالدین نے کچھ عیسائی عورتیں بچائی تھیں۔ وہ جامع مسجد میں افسر کے پاس پہنچے، پھر نہ آئے۔ ایک خدمت گار آیا اور عیسائی عورتوں کو لے گیا۔ محلّے کے لوگ، امیر میرزا ہی کے مکان میں جمع ہو گئے تھے۔ زن و مرد دو سو کے قریب ہوں گے۔ امیر میرزا نماز پڑھ کر تسبیح کر رہے تھے کہ گورے آئے اور کہا روپیہ دو۔ میاں امیر میرزا نے کہا ہمارے پاس روپیہ کہاں؟ ایک نے گولی ماری جو منشی آغا جان کے فرزند کے لگی۔ اس نے باپ کو پکارا۔ امیر میرزا نے کہا: بیٹا خدا کا نام لے۔ یہ وقت باپ کو پکارنے کا نہیں۔ دوسری گولی امیر میرزا کے سینے پر لگی اور وہ جاں بحق ہو گئے۔[3] حکیم عبدالحق کو اس لیے پھانسی دے دی گئی کہ وہ میر حامد علی کے پاس آتے جاتے تھے۔ حکیم شرف الدین کے جوان بیٹے نظام الدین خاں قدم شریف سے گرفتار ہوئے۔ ایک رات کوتوالی میں رہے، پھر بالکل بے گناہ اور بے قصور پھانسی دے دی گئی۔ عبدالصمد خاں ابن علی محمد خاں، واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ فتح دہلی سے چند روز پہلے

---

[1] مشکلات ص ۷۲۔ [2] مشکلات ص ۷۲، و خطوط غالب [3] داستان غدر ص ۱۲۶-۱۲۷۔

اُنے اور اجیں اشتراک اسم کی بناء پر والی جھجر کا خسر سمجھ کر گولی مار دی گئی۔ میاں حسن عسکری کو اس جرم میں بتاریخ ۱۵۔ شوال ۱۲۷۴ھ (۲۹۔ مئی ۱۸۵۸ء) پھانسی دے دی گئی کہ انھوں نے دو کل اور ایک تلوار بخت خاں کو بہ طور تحفہ دیے تھے اور ایک خط بھی کسی امیر کو لکھا تھا۔[1]

ظلم کی حد ہو گئی

کہا جا سکتا ہے اور کہا گیا کہ فتح دہلی کے وقت تمام انگریز اپنے مظلوم ہم قوموں کے قتل کی وجہ سے پاگل ہو رہے تھے حالانکہ یہ قتل، عام اور کھلے بندوں غارت گری کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں بن سکتا لیکن انگریزوں کی حالت تو غدر سے سالہا سال بعد تک بھی یہی رہی۔ مثلاً ذیل کے دو واقعات ملاحظہ فرمایئے!

۱۔ — میرزا مغل بیگ ایک شاہی ملازم تھا۔ اس پر جنوری ۱۸۶۲ء میں مقدمہ چلایا گیا کہ وہ اس گروہ میں شریک تھا جس نے ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو چند انگریز مارے تھے۔ مختلف گواہ پیش کیے گئے، جن کی گواہیوں کے بیانات میں خاصا اختلاف تھا اور وہ جعلی معلوم ہوتے تھے۔ پنجاب کے جوڈیشنل کمشنر نے گواہوں کے بیانات میں اختلاف کے باوجود میرزا مغل بیگ کو پھانسی کی سزا سنا دی۔ اور اس غریب کو پھانسی دی گئی۔[2]

۲ — حاجی مہر کن پر بھی یہی الزام تھا۔ وہ بے چارا پہلے دار و گیر کے خوف سے بستی نظام الدین میں رہا۔ مخبروں نے اسے پکڑوا دیا۔ مٹکاف نے دیکھتے ہی اسے تلوار ماری اور مُردہ چھوڑ کر چل دیا۔ رشتہ دار اسے اٹھالے گئے۔ چار مہینے علاج کرایا اور وہ اچھا ہو گیا۔ چپ چاپ لاہور آگیا اور یہاں نام بدل کر کاروبار کرتا رہا۔ ۱۸۶۹ء میں گرفتار ہوا۔ اُسے بھی کسی واضح ثبوت کے بغیر پھانسی دے دی گئی۔[3]

---

[1] آخر کے زیادہ تر واقعات غدر دہلی کا نتیجہ سے ماخوذ ہیں۔ [2] دی ٹرائل آف بہادر شاہ طبع ۱۸۶۲ء (صفحہ ۲۷۳ - ۲۷۸) [3] دی ٹرائل آف بہادر شاہ طبع ۱۸۶۲ء (صفحہ ۲۷۹ - ۲۹۴)

مولوی محمد باقر مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے والد ماجد مولوی محمد باقر بھی انھیں بے گناہ مظلوموں میں سے تھے، جو فتح دہلی کے بعد شہید کرڈالے گئے۔ انھوں نے دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ یہ راز کھل گیا تو ان کے گھر پر یورش ہوئی۔ آخر مسٹر ٹیلر نے یہی مناسب سمجھا کہ وہاں سے نکل جائیں۔ کہا جاتا ہے صاحب نے روانگی کے وقت کچھ کاغذات مولوی محمد باقر کے حوالے کیے تھے کہ انھیں شہر پر قبضے کے بعد کسی انگریز افسر کے حوالے کر دینا۔ ٹیلر جونہی مولوی صاحب کے گھر سے نکلا، اس پر حملہ ہو گیا۔ وہ مولوی صاحب کی مسجد میں چلا گیا۔ موصوف نے حملہ آوروں کو بہت سمجھایا اور روکا۔ لیکن کسی نے نہ سُنی۔ صاحب مارا گیا۔ مولوی صاحب نے بعد فتح شہر کاغذات انگریزوں کے حوالے کر دیے۔ خیر خواہوں نے انھیں باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے کہا کہ میں مقتول سے وعدہ کر چکا ہوں اور اسے ضرور پورا کروں گا۔ بیان کیا جاتا ہے ان کاغذات میں ٹیلر نے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر مولوی محمد باقر چاہتے تو مجھے بچا سکتے بہرحال مولوی صاحب بھی اسی "جرم" میں گرفتار ہوئے کہ عمائدین شہر میں سے تھے اور قلعے کے ساتھ بھی ان کا ربط و تعلق تھا۔ پھر خدا جانے انھیں گولی مار کر شہید کیا گیا یا پھانسی دی گئی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ایک شناسا سکھ فوجی افسر کے سائیس کا لباس پہن کر شفیق باپ کی آخری زیارت بہ حالت اسیری کی تھی، لیکن بات نہ ہو سکی۔ باپ نے ہاتھ کے اشارے سے اکلوتے جگر گوشے کو رخصت کر دیا۔[1] باپ کی شہادت، گھر بار کی بربادی اور بائیس ناتوانوں کے ساتھ جلا وطنی ہی کے مصائب تھے، جن کا صدمہ ضعف قویٰ کی حالت میں آزاد کے لیے عقل و ہوش کے اختلال کا موجب بنا۔

تاریخ وفات منیر شکوہ آبادی نے مولوی محمد باقر کی تاریخ وفات کہی جو دراصل ان کی

---

[1] آبِ حیات کے لطیفے (مقدمہ) ۳۲-۴۶

سیرت کا جامع مرقع ہے۔

جناب فاضلِ کامل محمد باقر | سپہرِ علم و فضیلت کے اخترِ تاباں
شہیرِ عالمِ ایجاد، دہلوی مولد | بزرگ اصل میں ان کے تھے ساکنِ ایران
حدیث و فقہ و کلام و مناظرہ میں وحید | مصنفات ہیں ان کی بے مثلِ شمس عیاں
خلیق و ناصرِ آلِ رسولؐ و تعزیہ دار | فدائے نامِ نبیؐ، عاشقِ شہِ مرداں
حلیم و قابل و محتاط و مجمع حسنات | جہانِ دانش و فضل و مروت و احساں
خدا کی راہ میں مقتول ہو کے آخر کار | گئے جہاں سے وہ سوئے روضۂ رضواں

کہی منیر نے یہ اُن کی مرگ کی تاریخ
شہید و متقی و عالمِ علومِ نہاں

۱۲۷۴ھ ہجری

کیننگ کی بدبختی ۶۔ جون ۱۸۵۷ء کو وائسرائے نے ایک حکمنامہ جاری کیا تھا، جس کی رو سے ہر مقام کے بڑے افسر کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ جہاں کوئی شخص فوجیوں کو ورغلاتا ہوا پایا جائے، اسے موت کی سزا دی جائے۔ لارڈ کیننگ نے بعد ازاں اس سلسلے کی بعض کارروائیوں میں مداخلت کی۔ اس پر "لندن ٹائمز" نے طنزاً کیننگ کو "پیکرِ رحم" قرار دیا۔ کیننگ کے قدرے نرم طرزِ عمل پر اس قدر غیظ و غضب پیدا ہو گیا تھا کہ ایک انگریز نے کہا: اگر مجھے کیننگ پر پستول چلانے کا موقع مل جائے، تو اسے حب وطن کا بلند ترین کارنامہ سمجھوں گا۔[1]

حقیقتِ حال کا اعتراف بنگال کے حاکم نے ایک مرتبہ لارڈ کیننگ سے اس معاملے کے متعلق گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی انصاف آموز تدابیر

---

[1] باسن ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۶۳ •

کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات سے سخت متاثر تھا۔ لیکن اپنی میز کی دراز سے کاغذات کا ایک پلندا دکھا کر اس نے کہا کہ ذرا ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ میں نے ہنگامی عدالتوں کے آغاز سے بعض کے کاروبار کی چھان بین بڑی احتیاط سے کرائی ہے،

> ان سے جبر، ظلم اور بے انصافی کے نہایت وحشیانہ اور خوفناک سلسلے کا انکشاف ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان عدالتوں نے محض ہراس زدگی کے زیر اثر ایسے فیصلوں سے اپنا دامن آلودہ کیا، جنھیں "اندھا دھند عداتی کشت و خون" کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

جب حاکم بنگال نے کہا کہ انھیں شائع کر دینا چاہیئے تاکہ حقیقت حال سب پر واضح ہو جائے تو کیننگ نے جواب دیا:

> ہرگز نہیں۔ میں اپنی بدنامی اور رسوائی برداشت کر لوں گا لیکن وہ حقائق منظر عام پر نہیں لاؤں گا، جو میرے ہم وطنوں کے لیے دنیا میں خوفناک رسوائی کا باعث بنیں گے۔ میرے لیے یہی بس کرنا ہے کہ آیندہ کے لیے ایسے واقعات کا صدور روک دیا۔[1]

یہ وقت کے سب سے بڑے انگریز حاکم کا اعتراف ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کچھ کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

تعداد مقتولین

انگریزی تاریخوں میں مقتولین کی تعداد صرف سولہ سو لکھی ہے، جو بالکل غلط ہے سید کمال الدین حیدر نے لکھا ہے:

> ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتل عام رہا، اس کا حساب نہیں اپنے نزدیک گو یا نسل تیموریہ کو نہ رکھا، مٹا دیا۔ بچوں تک کو مار ڈالا۔ عورات سے جو سلوک کیا، بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔[2]

---

[1] باس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۶۴ ۔ [2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۵۲ ۔

باب ۱۱

شہر، عمارتیں اور مسجدیں

ملک زمین و ملائک جناب تھی دلّی بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دلّی
جواب کا ہے کو تھا، لاجواب تھی دلّی مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلّی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں، جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

جنونِ انتقام

آپ انگریزوں کی خون ریزیاں دیکھ چکے، لیکن اس سے ان کے جنونِ انتقام کی پیاس نہ بجھی۔ وہ چاہتے تھے کہ شہر دھلی کو ڈھا کر ویران کر ڈالا جائے، لال قلعے کا نشان مٹا دیا جائے، شاہ جہان کی بنائی ہوئی مسجد جامع کو زمین بوس کر دیا جائے۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو دہلی کی زمین کو اٹھا کر اتھاہ سمندر میں پھینک دیتے باس ورتھ سمتھ نے لکھا ہے:

بعض افسر روحی بربریت کے جوش میں اصرار کر رہے تھے کہ شہر کو جو ہندوستان کا سرمایۂ افتخار اور اس کا دار الحکومت تھا، جسے ملک میں روضۃ الکبریٰ کی حیثیت حاصل تھی، ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا جائے اور زمین کو شور زار بنا دیا جائے۔ دوسرے اس سے بھی چند قدم آگے بڑھ کر مذہبی بربریت کے جنون میں اس بات پر زور دے رہے تھے کہ جامع مسجد کو، جو دنیا کی شاندارترین اور نفیس ترین عمارتوں میں سے تھی، کھدوا دیا جائے یا کم از کم اس کے کلس پر

صلیب نصب کرے، گرجے کی شکل میں تبدیل کر لیا جائے۔

مسیحی فتح کا یہ حد درجہ غیر مسیحی نشان منصور ہونا۔ ایک بڑے گروہ کا اصرار یہ تھا کہ رفیع الشان شاہی محل (لال قلعہ) کو ضرور برباد کر دیا جائے، تاکہ جو یہاں سے گزرے، پڑھ لے کہ مغلوں کا آخری نشان مٹ گیا:

"خون کے اس دھارے میں جو اس نے بہایا وہ برباد ہو گیا، امید سے خالی، نفرت کا ہدف، کھنڈروں میں مدفون، جرم میں غرق [1]"

شہر میں ہل چلانے کی تجویز

چنگیز خاں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ نیشاپور کے محاصرے میں اس کا داماد مارا گیا۔ لہٰذا اس نے حلف اٹھایا کہ نیشاپور کو ویران کر کے دم لے گا۔ چنانچہ شہر فتح ہوا تو پوری آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ نہ کوئی مرد زندہ چھوڑا، نہ عورت، نہ بچہ، پھر جانوروں کی باری آئی۔ بیل، گھوڑے گدھے، اونٹ، بھیڑ بکریاں غرض ہر شے ختم کر دی گئی یہاں تک کہ کتوں اور بلیوں کو بھی نہ چھوڑا گیا اور شہر کو ڈھا کر ہل چلوا دیے۔ چنانچہ ایک قرن تک نیشاپور کی جگہ کھیتی باڑی ہوتی رہی۔ بالکل اسی قسم کی تجویز انگریزوں نے جان لارنس کے روبرو پیش کی تھی۔ باس ورتھ نے لکھا ہے کہ لارنس کے دوستوں نے دہلی شہر میں ہل چلوا دینے کی تجویز پیش کی تو اس نے کرنیل برن کو لکھا:

میں کبھی اس تجویز کو منظور نہ کروں گا۔ ہمیں مذہبی عمارتوں کی بربادی سے بالاہتمام احتراز کرنا چاہیے۔ نہ دوستوں کی خوشنودی

---

[1] باس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۴۹۔

کے لیے ایسا کوئی قدم اُٹھایا جا سکتا ہے اور نہ دشمنوں کو آزار پہنچانے کے لیے[1]۔

"لارنس آباد" دہلی کا نشان مٹا دینے کی تجویز نہ مانی گئی تو انگریزوں نے زور دیا کہ شہر کا نام "شاہجہان آباد" کی جگہ "لارنس آباد" رکھا جائے معلوم نہیں ذمہ دار حکام نے اس باب میں کیا کچھ کیا۔ لیکن اس سے پیشتر بھی دہلی کے نام مختلف بادشاہوں نے بدلے تھے۔ کسی کو بھی فروغ حاصل نہ ہُوا۔ سب سے زیادہ شہرت "شاہجہان آباد" نے پائی تاہم دہلی کی ہردلعزیزی کے سامنے شاہجہان آباد کا چراغ بھی روشن نہ رہ سکا۔ "لارنس آباد" کب عام لوگوں کی زبان پر چڑھ سکتا تھا۔ نئی دہلی کا نام بھی ابتداً "جارج آباد" تجویز ہُوا تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے ترک کر دیا گیا کہ اس میں "دہلی" کی سی جاذبیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

اِنہدام اور اُس کے مقاصد بایں ہمہ شہر میں خاصی عمارتیں ڈھا دی گئیں اور کچھ جل کر تباہ ہو گئیں۔ مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ بعض مکانات میں کسی سبب سے آگ لگ جاتی تھی[2] لیکن آگ خود بخود کیونکر لگ سکتی تھی؟ شہر میں سے لوگ نکل چکے تھے۔ یقیناً یہ آگ فوجی لگاتے ہوں گے۔ جو عمارتیں انگریزوں نے منہدم کرائیں، ان کا مقصد یہ بتایا گیا:

۱ ـــــ قلعے کے سامنے میدان ضروری تھا۔

۲ ـــــ جامع مسجد کے اردگرد پچیس پچیس فٹ کھلی جگہ لازم تھی۔

۳ ـــــ ریلوے سٹیشن اور ریلوے لائن کے لیے جگہ پیدا کرنا منظور تھا۔

بازار اور عمارتیں ان مقاصد کے لیے جو عمارتیں ڈھائی گئیں ان کی سرسری کیفیت

---

[1] پاس ورتھ سمتھ جلد دوم ص ۱۵۶ [2] ذکاء اللہ ص ۱۷

ملاحظہ فرمائیے۔

۱ ـــــ چوک سعد اللہ خاں، یہ لال قلعے کے دہلی دروازے سے شروع ہوتا تھا، بہت ہی خوبصورت اور پُر رونق مقام تھا۔

۲ ـــــ اردو بازار، خانم بازار، خاص بازار، فیض بازار۔

۳ ـــــ بلاقی بیگم کا کوچہ، خان دوراں کی حویلی، نگیوں کا بازار، دریا گنج کی گھاٹی، انگوری باغ، اگرا بارڈی، بعض بالکل منہدم ہو گئے اور بعض کے حصّے ڈھا دیے گئے۔

۴ ـــــ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک سب عمارتیں بالکل صاف کر دی گئیں۔

۵ ـــــ کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک سب محلے صاف ہو گئے، مثلاً پنجابی کٹرا، وصولی کٹرا، رام گنج، سعادت خاں کا کٹرا، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رامجی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ اور حویلی۔

۶ ـــــ جامع مسجد کے قریب مشہور شاہی درس گاہ دارالبقا، جہاں آخری دور میں مفتی صدرالدین آزردہ نے درس کا انتظام کیا تھا۔

قلعے کے سامنے کے مکانات ہاتھوں سے منہدم کرائے گئے۔

انہدام کی کیفیت اوّل ان کا کاٹ نیلام ہُوا۔ اینٹ پتھر قلعے کی خندق کا پُشتہ بنانے کے کام آئے۔ میدان بن گیا تو پھر اس کے مضبوط درخت نیلام ہوئے۔ مکانوں کی بنیادوں کے پتھر بیچے گئے۔ بعض مکانات ثابت کے ثابت اینٹ پتھر سے بھر کر برابر کر دیے گئے تھے، اب وہ پھر کھود کر نکالے گئے۔ مولوی ذکاء اللہ کا مکان جامع مسجد اور قلعے کے درمیان تھا۔ اینڈریوز نے مولوی صاحب کی زبانی لکھا ہے:

> فتح دہلی کے بعد فوج کے افسر اور سپاہی پہنچے اور نیچے
> کچے مکانوں کو حکم سے خالی کرا لیا کہ یہ محلہ سارا منہدم کر دیا جائے گا
> ایک گھنٹے کے اندر لوگ صدیوں کے بسے ہوئے گھر چھوڑنے پر

مجبور رہ گئے اور تمام محلہ بارود سے اڑا دیا گیا۔

لال قلعہ

لال قلعے کی پہلی حالت باقی نہ رکھی گئی۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء تک اندر دس ہزار سے کم آبادی نہ تھی۔ جو عمارتیں فتح کے بعد انگریزوں نے توڑیں، ان کی سرسری کیفیت یہاں درج کی جاتی ہے:

۱ —— امیروں اور شہزادوں کے تمام محلات توڑ دیے گئے۔

۲ —— دیوانِ عام کا صرف ہال باقی رہ گیا، اس کی باقی چیزیں توڑ دی گئیں۔ اور یہ بھی اب ڈھانچا ہی ڈھانچا ہے۔ شاہی عہد کے دیوانِ عام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۳ —— دیوان عام کے قریب سب سے بڑا شاہی محل تھا جس کا نام رنگ محل تھا اور اسے امتیاز محل بھی کہتے تھے۔ وہ باقی ہے لیکن اس کے فوارے، حوض اور دُوسری چیزیں باقی نہیں رہیں۔

۴ —— موتی محل، یہ محل ہیرا محل کے شمال میں اور باغ حیات بخش کی مشرقی آبشار کے سامنے تھا۔ انگریزوں نے اسے توڑ کر توپ خانہ کی بارک بنالی۔

۵ —— باغ حیات بخش بھی تباہ کر دیا گیا تھا اور ۱۹۰۲ء تک ملبے کے نیچے دبا رہا۔ اس کا کچھ حصّہ بارکوں میں آ گیا تھا، کچھ سڑکوں میں۔ باقی باغ کو پھر سے رونق دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، لیکن پہلی حالت کی جھلک بھی اس میں نظر نہیں آتی۔

۶ —— مہتاب باغ بالکل اجڑ گیا، اس کے حوض کو مُدّت تک گوروں نے تیراکی کا حوض بنائے رکھا۔

۷ —— ظفر محل یا جل محل کی پہلی شان جاتی رہی۔

۸ —— چھوٹی بیٹھک یعنی "خورد جہاں" مٹ گیا۔

۹ —— ممتاز محل آج کل آثار قدیمہ کا عجائب خانہ ہے

۱۰۔۔۔۔۔ دیوانِ عام کے شمال میں مطبخ شاہی تھا، اس کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ اس حصّے میں بے ڈھنگی بارکیں انگریزوں نے کھڑی کریں۔

۱۱۔۔۔۔۔ دیوانِ عام اور دیوانِ خاص کے درمیانی حصّے اور لال پردے کا بھی کوئی تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

مسجدیں فتح دہلی کے بعد انگریزوں کے جنونِ انہدام کی بجلیوں سے مسجدیں بھی نہ محفوظ رہیں۔ چھوٹی مسجدوں کا شمار ممکن نہیں لیکن بڑی مسجدوں میں سے بعض کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

۱ اکبر آبادی مسجد، یہ فیض بازار میں تھی اور شاہ جہان کی بیگم اعزاز النساء نے بنوائی تھی، جس کا خطاب اکبر آبادی محل تھا۔ مسجد کا مسقف حصّہ ترسٹھ گز لمبا اور ستر گز چوڑا تھا۔ اس کے تین گنبد اور سات در تھے۔ دائیں بائیں دو خوب صورت اور بلند مینار تھے۔ ترسٹھ گز لمبا اور ترسٹھ گز چوڑا صحن تھا جو زمین سے تین گز اونچا تھا اس کے گرد تین گز اونچا کٹہرا بنا ہوا تھا۔ صحن کے سامنے وضو کے لیے حوض تھا۔ حوض کے پاس سے مسجد میں جانے کے لیے سیڑھیاں بنا دی گئی تھیں۔ پوری عمارت سنگ سُرخ کی تھی۔ سامنے کی طرف سنگ مرمر کی بیلیں بنی ہوئی تھیں، مسجد کے شمال، جنوب اور مغرب میں تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر خوب کھلے اور صاف حجروں کی قطاریں تھیں۔ حجروں کے سامنے برآمدہ تھا۔ گویا مسجد بہ طور خاص اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ طلبہ حجروں میں رہیں اور مسجد میں تعلیم پائیں۔ شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ رفیع الدین محدث مدت تک یہاں درس دیتے رہے۔ سید احمد شہید بریلوی نے اپنی تحریک کا لائحہ عمل اسی مسجد کے حجروں میں تیار کیا تھا۔ اس مسجد سے قلعے کے لاہوری دروازے تک کا بازار اردو بازار کہلاتا تھا۔ انگریزوں نے قلعے کے درمیانی حصّے میں میدان نکالنے کے لیے جہاں سیکڑوں مکان گرائے، وہاں یہ

مسجد بھی شہید کرادی، حالانکہ اسے محفوظ رکھا جاتا تو میدان اور عام منظر کی خوب صورتی بہت بڑھ جاتی۔ اور ایک عالی شان عبادت گاہ بچی رہتی۔

۲۔۔۔ اورنگ آبادی مسجد، یہ مسجد پنجابی کٹڑے میں تھی، جو سٹیشن اور ریلوے لائن میں آگیا۔ مسجد اس جگہ تھی جہاں آج کل بڑا سٹیشن ہے۔ پوری عمارت سنگ سرخ کی نہایت خوش وضع اور خوب صورت تھی۔ اس میں مولوی عبدالخالق امام تھے، جو شمس العلماء مولانا نذیر احمد کے خسر تھے۔ شیخ الکل میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی نے ابتدا میں یہیں درس شروع کیا تھا، پھر یہ مسجد انگریزوں نے منہدم کرادی تو وہ پھاٹک حبش خاں میں چلے گئے۔

۳۔ ۔ چوبی مسجد، قلعے کے اندر مہتاب باغ سے آگے نکل کر شاہی مطبخ کے پاس تھی، انگریزوں نے تڑوادی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی وضع و ہیئت کیا تھی۔[۱]

جامع شاہ جہانی یہ مسجد اپنی شان و شوکت، خوبصورتی اور دل آویزی کے لحاظ سے دنیا کی چند بہترین مسجدوں اور عبادت گاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ انگریز اسے گرا دینے یا گرجا بنا لینے کے خواہاں تھے۔ اس کا ایک خاص وجہ یہ تھی کہ انگریزی فوج کے حملے کے وقت مسجد کے دروازے پر مسلمانوں نے سخت مقابلہ کیا تھا اور انگریزی فوج کو پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔ سید ظہیر دہلوی کے بیان کے مطابق اس لڑائی کی اجمالی کیفیت پہلے پیش کی جا چکی ہے۔ اصل بیان یہاں درج کیا جاتا ہے:

> ایک بزن انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آ پہنچا تھا اور کچھ لوگ فوج کے رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے۔ ادھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں مسجد

---

[۱] واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم ۳۰۹-۳۱۱

میں جو مسلمان مسافر جمع تھے، انھوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے
گھر میں آ کر کشت وخون کریں گے۔ آؤ، بہتر یہ ہے کہ مسجد سے نیچے
اتر کر ان سے سمجھ لیں، یہ کہہ کر وہ مسجد کے دروازے سے باہر نکل کر
سیڑھیوں پر سے اترنے لگے۔ فوج والوں نے ان پر بندوقیں سر کیں، مگر
جو زندہ رہے، وہ سامنے چلے اور باہم جنگِ مغلوبہ دست بدست
ہونے لگی۔ ایک غل شور برپا ہوا اور بلوا ہو گیا۔ لوگ گھروں میں سے
لکڑیاں، پلنگ کی پٹیاں، تلواریں لے کر دوڑ پڑے۔ اس جنگ میں
کچھ مارے گئے، باقی بھاگ کر اپنے لشکر میں چلے گئے [1]

سکھوں کا کیمپ

فتح کے بعد گورے یا تو قلعے میں چلے گئے یا انھوں نے زینت المساجد میں اپنا مرکز قائم کرلیا۔ سکھوں کا لشکر جامع مسجد میں قائم ہو گیا۔

مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں، مندروں کی ایسی دُر دشا کی کہ ہندو دہلی میں دوبارہ آباد ہوے تو انھیں اپنے تمام مندروں کو خاص رسوم ادا کر کے پوتر کرنا پڑا:

جامع مسجد، شہر کی کل مساجد کی ناک تھی، اس کو یوں نکما بنایا
کہ سکھ سپاہ کی بارک اس کو بنایا۔ اس میں بول و براز کرنے سے
کچھ پرہیز انھوں نے نہیں کیا۔ سکھوں نے اپنے کڑھائے حلوے کے سُرخ
مینار کے نیچے خوب چڑھائے، سؤر ذبح کر کے پکاتے۔ کتنے
جو انگریزوں کے ساتھ تھے، وہ درگاہ شریف میں پڑے پھرتے
تھے [2]

شہر خالی پڑا تھا۔ بڑی بڑی حویلیوں اور عمارتوں کا شمار نہ تھا۔ سکھوں کو یا دوسرے دستوں

---

[1] داستان غدر، ص ۱۱۳-۱۱۴ ۔ [2] ذکاء اللہ، ص ۷۱۹ ۔

کر کہیں بھی ٹھہرایا جا سکتا تھا لیکن انگریزوں کا جوشِ انتقام انھیں کسی طرح بھی دم نہ لینے دیتا تھا اور وہ ایسی حرکتیں کرتے تھے، جو مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ اشتعال انگیز اور نفرت خیز ہوں۔

مسجد کی بندش پھر مسجد کو بند کر کے پہرے لگا دیے گئے۔ میرزا قربان علی بیگ سالک نے اپنی نظم "جہان آباد" کے مندرجہ ذیل بند میں کس درد سے لکھا ہے:

بجرمِ مسجد جامع کا کیا کروں اظہار　　صفت ملائکہ ہوتی جہاں نماز گزار
ہر ایک صف میں نہ رہتا مصلیوں کا شمار　　اب اس کو دُور ہی سے دیکھنا ہُوا دشوار
نماز ہے، نہ اذاں ہے نہ کوئی جاتا ہے
جب اس کو دیکھیے خالی تو جی بھر آتا ہے

پانچ سال تک تو انگریز بالکل چُپ بیٹھے رہے اور مسجد کو بدستور اپنے قبضے میں رکھا، حالانکہ اس اثنا میں متعدد بڑے حاکم دہلی کا دورہ کر چکے تھے۔ غالب کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ جولائی ۱۸۶۲ء میں پرستش کا آغاز ہُوا اور مسجد کی واگزاشت کا مسئلہ چلا۔ نومبر ۱۸۶۲ء میں مسجد واگزار ہوئی اور دس آدمیوں کی ایک کمیٹی انتظام و نگرانی کے لیے بنا دی گئی۔

واگزاشت کی شرطیں واضح رہے کہ مسجد بلا شرط و قید واگزار نہیں ہوئی تھی۔ استعمال مسجد کے لیے شرطیں مقرر کی گئی تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی، جو اقرار نامے میں بہ طور ہدایات مرقوم تھیں:

۱ــــ ادائے نماز کے بعد سب آدمی مسجد سے باہر چلے جایا کریں۔

۲ــــ مؤذن اور امام کے سوا رات کو کوئی شخص مسجد میں نہ رہے۔

ؔ۱ اس کی شہادت سر جرڈ ٹیل کی کتاب سے بھی ملتی ہے۔

۳ ـــــ ہندو بلا مزاحمت مسجد کے اندر آئیں مگر انھیں ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

۴ ـــــ سول اور فوج کے افسر بھی اندر آنے کے مجاز ہوں گے۔ انھیں جوتا اتارنے کی احتیاج نہیں امید ہے کہ وہ کتے ساتھ نہیں لائیں گے اور سیگریٹ وغیرہ نہ پئیں گے۔

۵ ـــــ فوجی گورے کمان افسر یا حاکم ضلع سے پاس لیے بغیر اندر نہ جا سکیں گے۔

۶ ـــــ دو سنتری شمالی اور جنوبی دروازوں پر متعین رہیں گے اور ان کی تنخواہ کی ذمہ دار کمیٹی ہوگی۔

اس کے علاوہ کمیٹی نے جو ذمہ داریاں اُٹھائی تھیں، وہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے:

۱ ـــــ مسجد میں کوئی دنگا فساد نہ ہوگا۔

۲ ـــــ اگر کوئی مقدمہ مسجد کی بابت قائم ہوگا تو اس کا فیصلہ ہم خود کریں گے۔

۳ ـــــ مسجد میں کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو سرکار کی تحقیر و اہانت یا بدخواہی کی موجب ہو۔ اگر کوئی ایسی بات ہوگی اور کمیٹی اس کا تدارک نہیں کر سکے گی تو ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دے گی۔

۴ ـــــ کمیٹی مرمت کی ذمہ دار ہوگی۔ آمد و خرچ کا حساب باقاعدہ رکھے گی۔

۵ ـــــ کمیٹی کا کوئی ممبر کم ہو جائے تو اس کی جگہ ممبر نیا آدمی تجویز کر لیں گے۔

۶ ـــــ اگر کوئی امر خلاف مرضی سرکار ظہور میں آئے تو سرکار مسجد کو بند دینے کی مجاز ہوگی۔

کمیٹی کے دس ممبر تھے: میرزا الٰہی بخش، مفتی صدر الدین آزردہ، محمد ابراہیم، محمد ابراہیم (ثانی) محمد حسین، نصیر الدین، نواب علی، حافظ داؤد، محمد تفضل حسین، محبوب بخش، حافظ سید محمد امام مسجد، مولوی نواب علی نے یہ اقرار نامہ لکھا اور ۲۴۔ نومبر ۱۸۶۲ء کو اس پر دستخط ہوئے۔

بعد کی حالت

مدّت مدید تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ انگریز جوتا پہنے ہوئے مسجد میں جاتے۔ مسلمانوں کے دل دُکھتے لیکن وہ مجبور تھے، اگر شکایت کرتے تو انگریز دوبارہ مسجد کو بند کر دیتے۔ لارڈ کرزن نے ۱۸۹۹ء میں مسجد دیکھی تو بہ طور خود بوٹوں پر

موزے پہن لیے۔ یہ گویا عام انگریز افسروں کے لیے ایک عملی ہدایت نامہ تھا۔ اس کے بعد کمیٹی نے موزے بنوا کے رکھ دیے، جسے انگریز افسر اندر داخل ہوتے وقت پہن لیتے۔

مسجد فتحپوری چاندنی چوک کے مغربی سرے پر یہ مسجد دہلی میں بلحاظ عظمت دوسرے درجے پر ہے۔ اس کی دکانیں فتح شہر کے بعد ضبط کر لی گئی تھیں اور عجیب امر یہ ہے کہ ان کے نیلام کا بھی فیصلہ کر لیا اور مسلمانوں کو خبر تک نہ ہونے دی۔ لالہ چھنامل رئیس نے انتیس ہزار میں خرید لیں۔ مسلمانوں نے مدت کے بعد قانونِ وقف کے مطابق اس سودے کی تنسیخ کی درخواست پیش کی اور یہ درخواست منظور ہو گئی۔ حکومت نے چاہا کہ لالہ چھنامل دکانیں چھوڑ دے اور اپنی رقم مع سود لے لے جو ایک لاکھ دس ہزار بنتی تھی۔ اس کے بدلے میں تحصیل پلول کا ایک موضع دینا چاہا۔ لالہ نے انکار کر دیا۔ آخر دکانوں کے جمع شدہ کرایے اور موضع کی نیلامی سے ایک لاکھ دس ہزار کی رقم دے کر مسجد کی کل جائداد واپس لی گئی۔

باب ۱۲

بہادر شاہ کا مقدمہ

اہم سرکاری کاغذات

بہادر شاہ ۱۹ ستمبر کو لال قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں گیا تھا تو چار مہینے اور آٹھ روز کی آزاد حکومت کے تمام کاغذات بہ دستور چھوڑ گیا تھا، حالانکہ انھیں ضائع کر دینا حد درجہ ضروری تھا۔ ان کاغذات میں شہزادوں اور سرکاری کارکنوں کی عرضداشتیں تھیں، جن میں سے بعض پر بہادر شاہ کے دستخطی احکام تھے۔ مختلف رؤسا و افراد کے نام جو فرامین جاری ہوئے تھے، ان کی نقلیں تھیں۔ اور خود ان رؤسا و افراد نے جو عرضداشتیں بھیجیں، وہ بجنسہٖ موجود تھیں۔ یہی کاغذات خود بہادر شاہ، شہزادوں، مختلف کارکنوں، رؤسا و افراد کے خلاف بہ طور شہادت پیش ہوئے اور انھیں سزائیں ملیں۔ یا تو ان بے چاروں کو اندازہ نہ تھا کہ جس طرح زمانے نے ایک پلٹا بہادر شاہ کے حق میں کھایا تھا، اسی طرح دوسرا پلٹا خلاف بھی کھا سکتا ہے یا وہ حالات سے مجبور رہ کر سب کچھ کرتے رہے اور یہ خیال بھی نہ تھا کہ اپنے خلاف قاطع اور غیر مشتبہ شہادتیں فراہم کر رہے ہیں۔ مسز مٹر نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان اُمرا کی انتہائی بدنصیبی تھی، جب بادشاہ محل سے نکلا تو امرا کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی شہادتیں بکھری ہوئی چھوڑ گیا۔ ان کاغذات سے عجیب و غریب انکشافات ہوئے[1]۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بادشاہ کو ان کاغذات کی اہمیّت کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ یا

---

[1] مسز مٹر ص ۱۴۵

افراتفری میں انھیں ضائع کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ یہی کاغذات تھے جو خود بادشاہ اور بعض دوسرے افراد کے مقدمات میں پیش ہوئے۔ ان کے علاوہ مختلف افراد نے بھی شہادتیں دیں۔

مقدمے کی روداد

مقدمے کی روداد میرے علم کے مطابق ایک مرتبہ ۱۸۷۰ء میں بھی چھپ گئی تھی۔ جس کے ساتھ میرزا مغل بیگ اور حاجی کے مقدمات بھی شامل تھے۔ پھر اسے ایک مختصر سے دیباچے اور معمولی حواشی کے ساتھ ۱۹۳۲ء میں گیرٹ نے بھی شائع کر دیا۔ اس اشاعت میں آخری دو مقدمے حذف کر دیے گئے تھے خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اس کا اردو ترجمہ شائع کرایا تھا اور اس کے مختلف حصے الگ کر دیے تھے، مثلاً فرامین الگ، اخباروں کے اقتباسات الگ نیز ترجمہ اچھا نہ تھا۔

اگرچہ بہادر شاہ ۲۱۔ یا ۲۲۔ ستمبر ۱۸۵۷ء کو گرفتار ہوا تھا لیکن مقدمے کا آغاز ۲۷۔ جنوری ۱۸۵۸ء کو ہوا۔ تاخیر کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ کاغذات کی جانچ پڑتال اور ترتیب نیز شہادتوں کی فراہمی اور تیاری میں دقت لگا۔ پھر بہادر شاہ سخت بیمار ہو گیا، یہاں تک کہ اس کی جانبری کی بھی اُمید نہ رہی۔ تاہم قدرت نے اُسے بچا لیا تا کہ جس خاندان کی عظمت و برتری کے سامنے کابل سے راس کماری تک عقیدت کی گردنیں جھکی رہتی تھیں، اس کی تذلیل و تحقیر کا آخری منظر بھی سب دیکھ لیں۔ مقدمہ مسلسل جاری نہ رہ سکا۔ ۲۷۔ جنوری سے ۹۔ مارچ تک کل اکیس پیشیاں ہوئیں۔ ۹ مارچ کو فیصلہ سنا دیا گیا۔

فوجی کمیشن

پنجاب کے چیف کمشنر جان لارنس کی ہدایات کے مطابق جنرل پنی[1] نے ایک فوجی کمیشن مقدمے کی سماعت کے لیے مقرر کیا تھا، جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھا۔

۱ــــ لفٹنٹ کرنل ڈاز[2] صدر

---

[1] بیانات میں اختلاف ہے، [1] PENNY ، [2] DAWES.

۲ ـــــ میجر پامر[1] ممبر

۳ ـــــ میجر ریڈمنڈ[2] ״

۴ ـــــ میجر سائرس[3] ״

۵ ـــــ کپتان راتنی[4] ״

پہلے برگیڈیر شادر[5] کو صدر مقرر کیا گیا تھا، لیکن اسے ایک جیش کی کمانداری کے لیے باہر بھیجنا پڑا، اس لیے اس کی جگہ دوسرا شخص تجویز ہُوا۔ مسٹر جمیس مرفی کو ترجمانی کی خدمت سونپی گئی اور میجر ہریٹ کو ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل بنایا گیا۔

مقدمہ ۲۷ جنوری کو گیارہ بجے شروع ہونا تھا اور کمیشن کے اجلاس کے لیے دیوان خاص مقرر ہُوا تھا، چنانچہ بادشاہ کو ٹھیک گیارہ بجے دیوانِ خاص کے سامنے لے آئے۔ چونکہ برگیڈیر شادر کے چلے جانے کے باعث نئے آدمی کے تقرر کا سوال پیدا ہوئی تھا، اس لیے رسمی کارروائی کی تکمیل میں ڈیڑھ گھنٹے کی دیر لگی اور بادشاہ فوجی پہرے میں دیوان خاص کے باہر ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرا رہا۔ نیا آدمی مقرر ہوکر دیوان خاص میں آگیا تو ساڑھے بارہ بجے کارروائی شروع ہوئی اور اسیر بادشاہ کو عدالت کے سامنے لائے[6]۔

ایک سوال

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ سب کچھ محض اتفاقیہ پیش آگیا تھا؟ ہر سلیم الحواس آدمی اس کا جواب نفی میں دے گا۔ کمیشن کا صدر ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو دس بجے باہر نہ بھیجا گیا ہوگا، جس کی وجہ سے کمیشن نامکمل رہ گیا۔ اسے باہر بھیجنے کی تجویز کے ساتھ ہی نئے آدمی کا تقرر ہو سکتا تھا۔ یہ حقیقت جنرل پنی پر واضح ہو گی اور

---

[1] PALMER. [2] REDMONI. [3] SAWYERS. [4] ROTHNEY. [5] SHOWER. JAMES MERPHY. [6] HARRIOT. [7] گیرٹ دیباچہ ص، ,,

کمیشن کے ممبر بھی اس سے ناواقف نہ ہوں گے ۔ پھر اگر عین آخری وقت پر کارروائی کے آغاز میں تاخیر کی مجبوری پیش آگئی تھی تو حکم دیا جا سکتا تھا کہ بادشاہ کو اسی وقت لایا جائے، جب مقدمہ شروع کرنے کا وقت آئے ۔ ظاہر ہے کہ سب کچھ دیدہ دانستہ کیا گیا۔ انگریز بہادر شاہ کو قتل نہیں کر سکتے تھے ، اس لیے کہ جان بخشی کا حتمی وعدہ کر چکے تھے لیکن اس کو تحقیر و تذلیل کی ٹھوکریں تو لگا سکتے تھے اور اپنی ہمت و استطاعت کے مطابق انھوں نے اس "کارِ خیر" میں قطعاً تامل نہ کیا۔

مرقعِ عبرت

یہی دیوانِ خاص تھا جس کے لال پردے تک صرف خاص افراد کو جانے کی اجازت تھی اور وہ بھی عجز و نیاز کے پیکر بن کر جایا کرتے تھے۔ بے شک دیوانِ خاص کی وہ عزت و عظمت ایک صدی پیشتر افسانۂ پارینہ بن چکی تھی، جس کی وجہ سے وہ کروڑوں انسانوں کا مرجع عقیدت تھا۔ تاہم اس کا احترام تو بے دست و پا بہادر شاہ کے زمانے تک بھی باقی تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ۲۷۔ جنوری ۱۸۵۸ء کو دیوانِ خاص کے باہر فوجی پہرے میں ڈیڑھ گھنٹے تک اذن کا انتظار کرتے وقت بادشاہ کے جذبات و احساسات کی کیفیت کیا ہوگی۔ اگر اس کی چشمِ تصور شاہ جہان اور عالمگیر کے عہد کا نظارہ سامنے لا سکی ہوگی تو یقیناً اس کے دل پر چھریاں چلی ہوں گی اور بار بار خیال آیا ہوگا کہ کاش لڑ کر مر جاتا! کاش جنرل بخت خاں کے ساتھ چلا جاتا! میرزا الٰہی بخش اور زینت محل کی سخن طرازیوں پر فریفتہ ہو کر جوانگی کی منزل میں قدم نہ رکھتا! اس کے بیٹے، پوتے اور خاندان کے دوسرے افراد گولیوں اور پھانسیوں کی نذر ہو چکے تھے یا قید خانے میں ناگفتہ بہ مصائب کے تازیانے کھا رہے تھے ، اس کی اپنی زندگی برسوں کی نہیں مہینوں کی رہ گئی تھی۔ اس چند روزہ زندگی کا دامن رسوائیوں کے آلام سے بھر لینے میں عزت کا کون سا پہلو تھا؟ معلوم ہوتا ہے ۔ شاہ جہان و عالمگیر کی میراث کے اس آخری حامل کو شیب و پیری نے فکر و نظر اور عزم و ہمت کی بلندی ہی سے نہیں بلکہ احساساتِ صحیحہ کی دولت سے بھی بالکل محروم کر دیا تھا۔

تذلیل در تذلیل

مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں کہ گوروں نے اپنا دل بہلانے کے لیے قلعے کے لاہوری دروازے پر بہادر شاہ کی ایک تصویر بنائی تھی جس کے گلے میں پھانسی ڈالی تھی۔[1]

مسز مٹر بادشاہ کو پیشی کے لیے لانے کا منظر پیش کرتی ہوئی لکھتی ہے کہ جب بدنصیب بادشاہ کو لائے تو اس نے:

> اس مکان کی دیواروں پر چاک سے بنائے ہوئے دو نہایت عمدہ خاکے دیکھے ہوں گے، جہاں اقبال مندی کے زمانے میں اس اس کے خاص پہریدار رہتے تھے۔ دونوں خاکے اس کے تیکھے خط و خال اور ہلکے پھلکے جسم کا مرقع تھے۔ ان کے نیچے جو الفاظ لکھے گئے تھے، ان کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ خاکے خود منہ سے بول رہے تھے۔ ایک کے نیچے مرقوم تھا۔
>
> "شاہِ دہلی، جیسا وہ ہے"
>
> دوسرے خاکے میں اسے پھانسی پر لٹکایا گیا تھا اور نیچے لکھا تھا:
>
> "شاہِ دہلی، جیسا اُسے ہونا چاہیے"

آپ نے عظمت و جلال کی بلندیوں سے گرے ہوئے بے بس اسیروں کی بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی، لیکن کیا ایسا بھی کوئی منظر آپ کی نظروں سے گزرا، فاتحوں نے فخر و غرور کی سرمستیوں میں اکثر ایسی حرکتیں کیں، جن پر انسانی شرف ہمیشہ خون کے آنسو بہاتا رہے گا، لیکن کوئی ایسا نقشہ بھی آپ کے سامنے آیا، جیسا انگریزوں نے فتح دہلی کے بعد پیش کیا؟

بادشاہ کی پیشی

ڈیڑھ گھنٹے تک دیوان خاص کے باہر ٹھہرائے رکھنے کے بعد بادشاہ کو

---

[1] ذکاء اللہ ص ۲۳۷۔ [2] مسز مٹر ص ۱۴۷۔

کمیشن کے سامنے لائے۔ ایک طرف سے شہزادہ جواں بخت اور دوسری طرف سے ایک ملازم خاص اُسے سہارا دیے ہوئے تھے۔ کمیشن کے صدر اور جج ایڈووکیٹ جنرل کے درمیان اسے بٹھا دیا گیا، جہاں تکیے رکھے تھے، شہزادہ بائیں جانب کھڑا ہو گیا، پیچھے فوجی پہرے دار کھڑے تھے۔[1]

مسز مٹر اس موقع پر موجود تھی۔ وہ بتاتی ہے کہ بادشاہ کی پالکی دیوان خاص کے اندر لائے، شہزادہ جواں بخت ساتھ تھا، جو اس کی اولاد میں تنہا زندہ رہ گیا تھا۔ کمیشن اس کے سامنے بیٹھا تھا جس کے خوفناک احکام سے اس کے خاندان کے بہتیرے افراد موت کے گھاٹ اُتر چکے تھے۔ پہرے داروں نے انھیں سپاہیوں کی وردیاں پہن رکھی تھیں، جن کی گولیوں نے شہزادوں کو ختم کیا تھا۔ ابتدا میں اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آتے تھے، پھر بے پروائی اور بے توجہی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ بہ ظاہر اس پر اک گونہ غنودگی کی کیفیت طاری تھی۔ کارروائی کے دوران میں عموماً اس کی آنکھیں بند رہیں۔[2]

انگریزی اور دیسی تہذیب جس تذلیل کا ذکر ہو چکا ہے۔ انگریزوں نے باوجود ادعائے تہذیب اسی پر اکتفا نہ کی۔ فوجی کمیشن بہ ہر حال معمولی گورے سپاہیوں پر نہیں بلکہ خاصے بلند پایہ افسروں پر مشتمل تھا، جن سے تہذیب و شائستگی کی زیادہ سے زیادہ امید رکھی جا سکتی تھی۔ انھیں یہ احساس بھی ہونا چاہیے تھا کہ جو ایوان خاص چرخ نیلوفری کی ایک گردش سے ان کے قبضے میں آ چکا ہے، وہ دوسری گردش سے چھن بھی سکتا ہے۔ لیکن دورانِ مقدمہ وہ بہادر شاہ کو برابر "تم" سے خطاب کرتے رہے!!

مسز مٹر لکھتی ہے:

---

[1] گیرٹ دیباچہ ص ،
[2] مسز مٹر ص ۱۴۸-۱۴۹

بادشاہ پر نکبت و ذلت کی جو بارش ہو رہی تھی، اس کے دوران
بہت سے گواہوں کا طرزِ عمل دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ وہ گواہی کے
لیے بلائے جاتے تو ہاتھ باندھ کر اور جھک کر اس آفت زدہ وجود کو
"جہاں پناہ" کہتے جو غنگڑی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اگرچہ کمیٹی (کمیشن) "تم" سے
خطاب کرتی۔ گواہ بے دست و پا بوڑھے بادشاہ کے لیے
عزت و احترام کے وہ آداب ملحوظ رکھتے، جو عدالت کے تعلق میں
ملحوظ نہ رکھتے، حالانکہ عدالت کا ایک اشارہ انھیں موت کے گھاٹ
اتار سکتا تھا۔[1]

یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ پیشی کے پہلے دن شہزادہ جواں بخت کا طرزِ عمل کمیشن کو بہت ناخوشگوار معلوم ہوا، اس لیے کہ وہ اپنے ملازموں سے ہنس ہنس کے باتیں کرتا رہا۔ لہٰذا حکم دے دیا گیا کہ وہ آیندہ بادشاہ کے ساتھ نہ آئے۔

استغاثہ

ابتدائی رسمی کارروائی کے بعد جج ایڈووکیٹ جنرل نے استغاثہ پیش کیا جو چار الزامات پر مشتمل تھا۔ ان کا مفاد یہ ہے۔

۱ ـــ بہادر شاہ نے برطانوی حکومت ہند کا وظیفہ خوار ہونے کے باوجود ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء تک محمد بخت خاں صوبیدار توپ خانہ، نیز ایسٹ انڈیا کمپنی کے بہت سے کمیشن یافتہ افسروں اور سپاہیوں کو بغاوت و سرکشی پر اکسایا، امداد دی اور حصہ لیا۔

۲ ـــ بہادر شاہ نے اپنے بیٹے میرزا مغل کو، جو برطانوی رعایا تھا، دہلی میں اور ممالک غربی و شمالی کے غیر معلوم باشندوں کو حکومت سے بغاوت اور جنگ آزمائی

---

[1] مسز مٹر ص ۱۵۱

آمادہ کیا، امداد دی اور حصّہ لیا، حالانکہ وہ سب بھی برطانوی رعایا تھے۔

۳ —— بہادر شاہ نے برطانوی حکومت ہند کی رعایا ہونے کے باوجود ۱۱۔مئی یا اس کے آس پاس خود ہندوستان کا بادشاہ اور حکمران ہونے کا اعلان کیا اور دہلی پر دغا بازی سے قبضہ کر لیا۔ سرکار انگلشیہ کی بربادی کے لیے سازشوں میں وہ شریک رہا اور سرکار سے لڑا۔

۴ —— بہادر شاہ ۱۶۔مئی ۱۸۵۷ء کو لال قلعے کی حدود میں یورپی نسل کے انچاس افراد کو جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے، بیدردی سے قتل کر دینے کا موجب بنا اور اس فعل میں معاون رہا۔ قاتلوں کو نوکریاں، ترقیاں اور اعزاز دیے یا ان سے وعدے کئے۔ نیز مختلف دیسی حکمرانوں کے نام عیسائیوں اور انگریزوں کے قتل کے احکام صادر کیے اور یہ سب اعمال ایکٹ ۱۶ مصدرہ ۱۸۵۷ء کے رُو سے جُرم ہیں۔[1]

ابتدا میں یہ مسئلہ بھی متنازعہ فیہ رہا کہ فردِ جرم تیار کی جائے یا نہ کی جائے۔ جج ایڈووکیٹ جنرل کی رائے تھی کہ فرد جرم میں تیار کرنی چاہیے۔ جان لارنس کہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ شہادتیں لے لینے پر اکتفا کی جائے۔ آخر اس مسئلے کو حکومت ہند کی منظوری پر چھوڑ دیا گیا۔ جج ایڈووکیٹ جنرل نے فرد تیار کر کے اس کی کاپیاں اخباروں کو بھجوا دیں۔ جان لارنس اور حکومت ہند نے اس طرز عمل کی سخت مذمت کی۔[2]

اقرار یا انکار؟

الزامات پیش کیے جا چکے تو رسم کے مطابق بادشاہ سے پوچھا گیا کہ اقرار کرتے ہو یا انکار؟ بادشاہ نے یا تو استفسار کا مطلب نہ سمجھا یا ظاہر کیا کہ سمجھ میں نہیں آیا کیا پوچھ رہے ہیں؟ ساتھ ہی کہا کہ میں ان الزامات کی نوعیت سے

---

[1] گیرٹ ص ۳۰۲۔ [2] گیرٹ دیباچہ ص ۶۔

بالکل ناواقف ہوں اور نہ مجھے ان اختیارات کا علم ہے، جن کی بنا پر یہ سب پوچھ گچھ جاری ہے آخر ترجمان کے سمجھانے بجھانے کے بعد بادشاہ نے کہا: مجھے الزامات سے انکار ہے۔ اس کے بعد کمیشن کی کارروائی جاری ہوئی۔

اس سلسلے میں ایک اور امر قابل توجہ ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ میرٹھ کی سپاہ ۱۱۔مئی کی صبح کو دہلی پہنچی تھی۔ اس سے پیشتر دہلی کے تمام انگریز افسر اطمینان سے اپنے کاروبار میں لگے ہوئے تھے اور بادشاہ ۲۲۔ ستمبر کو گرفتار ہوا۔ اُسی وقت اُسے انگریزی حراست میں لے لیا گیا۔ تاہم الزامات میں بادشاہ کے جرائم کا آغاز اپریل سے کیا گیا اور ان کی آخری حد یکم اکتوبر برقرار دی گئی۔

روئداد کا خلاصہ

مقدمہ میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ تمام متعلقہ مسائل کو مختلف حصّوں میں بانٹ لیا تھا۔ ہر حصّے کے متعلق گواہ پیش ہوتے۔ ساتھ ہی متعلقہ کاغذات پیش کیے جاتے۔ گواہوں میں بادشاہ کے ملازم بھی تھے۔ دوسرے آدمی بھی اور انگریز افسر بھی۔ اکیس روز کی پیشیوں میں میرے اندازے کے مطابق کل ایک سو اسی کاغذات داخل کیے گئے۔ ان کے علاوہ اخباروں میں سے غالباً پندرہ اقتباسات پیش کیے گئے۔ چونی لال نامی ایک شخص کا روزنامچہ بھی پڑھا گیا، جس میں ۱۱۔مئی سے ۲۰۔مئی تک کے حالات تفصیلاً درج تھے۔ گواہوں میں سب سے بڑھ کر جامع، مفصل اور مرتب شہادت حکیم احسن اللہ خاں کی تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بادشاہ نے حکیم صاحب پر بہت احسانات کیے تھے۔ انھیں سب سے بڑھ کر معتمد علیہ مشیر سمجھتا تھا، لیکن گواہی میں حکیم صاحب نے بہادر شاہ سے کسی بھی نوع کی ہمدردی کا ثبوت نہ دیا، اگر کسی دوسرے شخص کے خلاف ایسی گواہی دی جاتی تو اس حالت میں بھی مذموم ہی سمجھی جاتی، لیکن جس بادشاہ سے خطاب پائے، جس کی ملازمت میں زندگی کا بڑا حصّہ صرف کیا، جس کی وجہ سے عزت و شہرت پائی، اس کے ساتھ نہایت نازک ساعت اور خوفناک

مصائب کے وقت میں ایسے غیر ہمدردانہ بلکہ ایک حد تک معاندانہ سلوک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اہم نکات

حکیم صاحب کی پوری گواہی تو درج نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے بعض ضروری نکات ملاحظہ فرمایئے:

۱ــــ بہادر شاہ اس لیے انگریزوں سے ناراض تھا کہ اول لارڈ ایمن برانے عیدین اور نوروز کی نذریں بند کر دی تھیں، دوسرے بادشاہ کی خواہش کے خلاف شہزادہ جواں بخت کے بجائے شہزادہ فخر الدین فتح الملک کو ولی عہد بنا دیا تھا۔

۲ــــ بادشاہ کے عزیز میرزا حیدر (ابن کام بخش بن سلیمان شکوہ) نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ شاہ ایران کو خط لکھا جائے۔ میرزا حیدر کا بھائی میرزا نجف ایران گیا۔ بادشاہ کی طرف سے سدی تبنر کو بھیجا گیا کہ یہ کاغذات میرزا نجف کو دکھا کر شاہ ایران کے پاس پیش کیے جائیں۔ میرزا حسن عسکری نے رات کے وقت مہری کا غذات سدی تبنر کو دیے۔ میں نے (حکیم صاحب نے) شاہ ایران کے نام کا خط نہیں پڑھا لیکن میرزا علی بخت نے سب کچھ بتا دیا۔

۳ــــ میرا خیال ہے کہ بادشاہ نے شاہ ایران سے روپے اور فوج کی مدد مانگی ہوگی۔ وہ زر پرست تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ بڑھاپے میں لالچ کی وجہ سے اپنا مذہب تبدیل کرا لیا[1]

---

[1] اس میں ایک خاص واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۸۵۳ء میں بادشاہ سخت بیمار رہا۔ میرزا حیدر بھی لکھنؤ سے آیا واپس جا کر اس نے بادشاہ کی صحت یابی کے لیے شاہ عباس کی درگاہ پر علم چڑھایا اور مشہور کیا کہ بادشاہ شیعہ بن گیا ہے۔ بادشاہ نے اس واقعے کی پُرزور تردید کی۔

۴ ـــــ بہادر شاہ کی رائے قطعاً یہ تھی کہ انگریز لوگوں کا مذہب واقعی تبدیل کر دینا چاہتے ہیں، جب میں نے یہ بتایا کہ انگریز دانا ہیں، ایسا کبھی نہ کریں گے تو وہ مطمئن ہو گیا۔

۵ ـــــ دیسی فوج کے ہندو اور مسلمان دونوں انگریزوں کے طرز عمل سے غیر مطمئن تھے فوج میں ہندوؤں کی کثرت تھی، لیکن دہلی کے ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں کم غیر مطمئن تھے۔

۶ ـــــ شہزادوں میں سے میرزا ابوبکر اور میرزا خضر سلطان فرنگیوں کو قتل کرانے میں پیش پیش تھے۔ میں نے بادشاہ سے کہا کہ ہمارے مذہب میں عورتوں اور بچوں کا قتل جائز نہیں، فتوے لے لیجیے۔ اس وقت بادشاہ نے قتل کی منظوری نہ دی لیکن بعد میں اسے راضی کر لیا گیا۔ اگر بادشاہ عورتوں اور بچوں کو اپنے زنانہ محل میں لے جاتا تو وہ یقیناً قتل نہ ہوتے۔

۷ ـــــ ان لوگوں کو سدی ناصر، اللہ داد ولایتی، گلاب شاہ کے سواروں اور بعض خاص برادرانِ شاہی نے قتل کیا۔

۸ ـــــ اس ہنگامے میں "وہابیوں" نے بھی نمایاں حصّہ لیا۔ وہ نہ صرف ٹونک سے بلکہ ہر جگہ سے آئے۔ بخت خاں خود "وہابی" تھا۔ اس کے علاوہ محمد شفیع رسالدار، مولوی امام خاں رسالدار، سرفراز علی، جسے بخت خاں نے غازیوں کا سالار بنایا، سب وہابی تھے۔ انھوں نے فتویٰ بھی چھاپا کہ مسلمان مذہبی جنگ کے لیے میدان میں آ جائیں۔ جے پور، بھوپال، ہانسی، حصار وغیرہ سے بھی "وہابی" آ گئے۔

اس شہادت میں باقی امور کا تعلق دوسرے حالات سے ہے جن کا ذکر موقع پر آئے گا۔

بہادر شاہ کا بیان

اکیسویں اور آخری پیشی کے دن یعنی ۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ کے تحریری بیان کا ترجمہ پڑھا گیا۔ یہ بیان بادشاہ نے اپنے وکیل

غلام عباس کی مدد سے تیار کیا تھا جو پورے مقدمے میں بہادر شاہ کے ساتھ رہا۔

اس بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱۱۔ مئی کو آٹھ بجے صبح تک مجھے کسی فتنہ و فساد کی خبر نہ تھی۔ میں نے انگریزوں کو بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن بے بس تھا۔ سپاہی دیوانِ خاص میں گھس آئے۔ تسبیح خانے میں مجھے گھیر لیا۔ سب طرف سنتری بٹھا دیے اور مجھ سے کہا آپ چپ چاپ تماشا دیکھتے جائیں۔ ہم اپنی جانوں پر کھیل گئے ہیں۔ اب جو ہماری طاقت میں ہے، وہ کریں گے۔ مجھے یہ خوف دامنگیر رہا کہ وہ مجھے مار نہ ڈالیں۔ میں نے کسی کے قتل کا حکم نہیں دیا۔ ممکن ہے میرزا مغل، میرزا خضر سلطان میرزا ابوبکر اور میرے ملازم خاص بسنت نے میرا نام خواہ مخواہ لے دیا ہو۔ میری حالت قیدی کی تھی۔ جس کاغذ پر چاہتے دستخط کرا لیتے۔ اگر میں مختار ہوتا تو حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں کو نہ بچا لیتا؟ ایک روز وہ میری بیگم زینت محل کا مکان لوٹنے کے لیے گئے، لیکن دروازہ نہ توڑ سکے۔ ایک روز انھوں نے کہا کہ زینت محل کو ہمارے حوالے کر دو۔ انگریزوں سے اس کی خط و کتابت ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کسی غریب سے غریب آدمی سے بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی بیوی ہمارے حوالے کر دو، ہم اسے قید میں رکھیں گے۔ ایک موقعے پر وہ میری جگہ میرزا مغل کو بادشاہ بنانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ میری مہر اور دستخط سے جتنے کاغذات پیش کیے گئے ہیں مجھے ان کا کوئی علم نہیں اور میں بتا ہی چکا ہوں کہ فوجی جو کچھ چاہتے تھے کرتے تھے اور میں بالکل بے بس تھا۔

تبصرہ

میرے نزدیک یہ بیان فی الجملہ درست تھا۔ بادشاہ کو انگریزوں کا تسلط کسی حالت میں بھی پسندیدہ قابل برداشت نظر نہ آ سکتا تھا، خواہ ان کا برتاؤ کتنا ہی اچھا ہوتا۔ صرف انگریزوں کے تسلط نہیں بلکہ ہر تسلط کی یہی کیفیت تھی۔ بادشاہی کا مزاج ہی ایسا ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنی حکمرانی میں کسی بھی نوع کی روک گوارا نہیں کرتی۔ انگریزوں کے غلط، غیر ہمدردانہ بلکہ میرے نزدیک غیر شریفانہ طرز عمل نے بادشاہ کو مزید رنجیدہ کر دیا۔ لیکن اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جن حالات میں گزرا تھا، ان میں کسی مجاہدانہ صلاحیت کے پرورش پانے کا کوئی امکان نہ تھا، پھر وہ عمر کی ایسی منزل پر پہنچ چکا تھا، جس میں حرکت و سرگرمی یا محنت و جفاکشی یا بلند مقاصد کے لیے

جدوجہد کی قوت ہی باقی نہ رہتی، للہذا امان لینا چاہیئے کہ وہ بے بس تھا، اگرچہ انگریزوں کی تباہی اسے دل سے پسند تھی، لیکن خود نہ کسی مخالفانہ و مجاہدانہ تحریک کا رہنما بن سکتا تھا اور نہ کوئی حائل ہو کر حصہ لے سکتا تھا، چنانچہ ایک بے دست و پا آدمی کی حیثیت میں وہ سب کچھ کرتا رہا، گویا وہ ایک تنکا تھا سیل کی موجیں کبھی اسے ایک طرف لے جاتیں اور کبھی دوسری طرف، یقیناً وہ انگریز عورتوں اور بچوں یا مردوں کے قتل پر قطعاً راضی نہ ہوگا۔ تاہم عوام کے غیظ و غضب کا طوفان بپا ہُوا تو بہادر شاہ اسے روکنے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا ہوگا۔ شاید اسے یہ خیال ہوا ہو کہ اگر اختلاف پر اصرار کیا گیا۔ تو سپاہی یہ سمجھیں گے، یہ تو انگریزوں سے ملا ہُوا ہے۔ آخر زینت محل اور احسن اللہ خاں کے متعلق بھی تو یہی رائے قائم ہو چکی تھی۔

فیصلہ

ایڈووکیٹ جنرل نے طویل تقریر کی جس میں الزام کو ثابت شدہ قرار دیا۔ کمیشن نے تھوڑی دیر میں یہ فیصلہ سُنایا۔

> عدالت، اس شہادت کے مطابق جو اس کے سامنے ہے اس رائے پر پہنچی ہے کہ قیدی محمد بہادر شاہ سابق شاہ دہلی کے خلاف جو الزامات لگائے گئے، وہ سب کُلاً اور جزواً پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں۔

میرٹھ ڈویژن کے کمان افسر میجر جنرل پنی نے جو فوجی کمیشن بنانے کا ذمہ دار تھا، ۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو کمیشن کا فیصلہ منظور کر لیا اور اس کی تصدیق کر دی۔

باب ۱۳

آخری منزل

جلاوطنی کا فیصلہ فوجی عدالت کے فیصلے کی تصدیق کے بعد بہادر شاہ کے لیے موت کے سوا کوئی سزا تجویز نہیں ہو سکتی تھی۔ چونکہ اس کی جان بخشی کا وعدہ ہو چکا تھا، اس لیے یہ سزا خارج از بحث تھی۔ جب پوری کارروائی حسب قاعدہ جان لارنس کے پاس پہنچی تو اس نے حکومت ہند کے نام ایک طویل مراسلہ لکھا، جس میں سفارش کی کہ بادشاہ کے لیے حبس دوام بہ عبور دریائے شور تجویز کی جائے۔ زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کو اختیار دے دیا جائے کہ وہ چاہیں تو بادشاہ کے ساتھ جائیں، چاہیں تو بنگال میں کسی مقام پر نظر بند رہنا منظور کر لیں۔ حکومت ہند نے یہ سفارش منظور کر لی اور حکم صادر کر دیا کہ بہادر شاہ کو سنگین پہرے میں کلکتہ بھیجا جائے۔ اس کی آیندہ منزل کا فیصلہ کلکتہ پہنچنے کے بعد کیا جائے گا۔[1]

حُلیہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے ۱۸۵۷ء سے کم و بیش دس سال پیشتر کا حلیہ یوں بیان کیا ہے

> میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت اُبھری ہوئی ہیں۔ لمبی گردن۔ چوکا ذرا اونچا۔ پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ، گہری سانولی

---

[1] گیرٹ دیباچہ ص ۱۳-۱۴۔

رنگت، چھدری داڑھی، لبیں کتری ہوئیں، بال سفید جھک، پھر بھی
داڑھی میں اِکّادُکّا سیاہ بال، چہرے پر جھرّیاں ۔

رچرڈ ڈپل نے گرفتاری سے چار ماہ بعد بادشاہ کو محل کی ایک تاریک کوٹھڑی میں دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ خط و خال بڑے تیکھے تھے۔ توسی بھرب، المبوترا چہرہ، زیتونی رنگ پر بیماری کی زردی چھائی ہوئی، چہرے کے عضلات کھچے ہوئے۔ نازک اور سبک انگلیاں تسبیح میں مصروف تھیں، عام رنگ ڈھنگ ایسا جیسے بخار کا اضطراب طاری ہو۔ سب کچھ مل جل کر بادشاہ ایک ایسا مرقع بن گیا تھا، کہ ایشیا کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی ناظر اسے دیکھ کر غیر متاثر نہیں رہ سکتا تھا۔[1]

مسز مٹر لکھتی ہے:

بادشاہ کا قد میانہ تھا، جسم نحیف اور کمزور چہرہ کی وضع قطع بے حد خوبصورت تھی۔ ناک لمبی، ستواں اور مڑی ہوئی۔ خط و خال سے دانشمندی ٹپکتی تھی اور تہذیب و شائستگی کی ایک ایسی جھلک نظر آتی تھی، جو اس کی اعلیٰ خاندانی حیثیت کے لیے باعث ننگ نہ تھی۔[2]

دہلی سے روانگی

بادشاہ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو گرفتار ہوا تھا۔ ۹ مارچ ۱۸۵۸ء تک مقدمہ جاری رہا۔ حکومت ہند کا آخری حکم صادر ہونے تک تو دہلی میں انتظار ضروری تھا ہی، معلوم ہوتا ہے کہ بعد ازاں گرمی اور برسات کے باعث روانگی ملتوی رہی۔ نومبر ۱۸۵۸ء میں یعنی گرفتاری سے ایک سال دو مہینے بعد بہادر شاہ، زینت محل اور جواں بخت کا قافلہ دہلی سے روانہ ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بیٹا عباس شاہ اور ایک بیگم تاج محل بھی قافلے میں شامل تھے۔ مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] رچرڈ ڈپل کی کتاب ص ۱۳۵ ۔ [2] مسز مٹر ص ۱۴۸۔ ۱۴۹ ۔

جب بادشاہ دہلی سے ایک ڈولی میں سوار ہو کر گوروں
کے پہرے میں منزل بہ منزل روانہ ہوا تو راہ میں ان لوگوں کے گھر
میں ماتم تھا جو اس کے باپ دادا کی دی ہوئی اراضی میں سے اب تک
روٹی کھاتے تھے [۱]

قیصر التواریخ کا بیان قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ بادشاہ ۲۹۔ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ (مطابق ۷۔ نومبر ۱۸۵۸ء) کو دہلی سے روانہ ہوئے۔ قافلے کی کیفیت یہ تھی:

۱۔ نواب زینت محل
۲۔ نواب تاج محل
۳۔ خیرن بائی
۴۔ ظہورن بائی
۵۔ شہزادہ میرزا جواں بخت (اب... رشاہ)
۶۔ شہزادہ میرزا عباس " (خیرن بائی کے بطن سے)
۷۔ میرزا قیصر شکوہ موسوم بہ غلام قنبر علی (ابن سلیمان شکوہ)
۸۔ نواب شاہ بادی (اہلیہ شہزادہ جواں بخت)
۹۔ شہزادہ جواں بخت کی ساس
۱۰۔ شہزادہ جواں بخت کا سالا
۱۱۔ بہادر شاہ کے فرزند میرزا عبداللہ کی بیگم
۱۲۔ احمد بیگ آبدار
۱۳۔ باسط علی

ان کے علاوہ بھی کچھ ملازمین تھے۔ سب کی تعداد سولہ تھی۔ چھ سو گورے سوار پہرہ داری کے لیے تھے اور توپ خانہ ساتھ تھا [۳]

چشم دید نقشہ سید کمال الدین حیدر کے ایک دوست نے کان پور میں اس غریب الوطن شاہی خاندان کو دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

---

[۱] ذکاء اللہ ص ۲۸۷ ۔ [۲] بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے بڑی منت سماجت سے اپنے آپ کو پرستار شاہ لکھوایا تھا ۔ [۳] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۵۲ ۔

ایک پنس میں بادشاہ گیرو سے لباس میں، پچیس گورے گرد۔
دو اور پنسیں، دو تین کرانچیاں زنانی مردانی، آٹھ روپیہ یومیہ مقرر تھے۔
اب سنتے ہیں، چھ سو روپیہ ماہواری بادشاہ۔ بیس روپیہ یومیہ تین سو
کا ایک شخص مہتمم سرکاری، آٹھ کہار، ایک گاڑی بہ خرچ سو
روپیہ ماہواری سرکار سے مقرر ہوئے۔ کچھ جوڑے کبوتروں کے
بادشاہ کو بھیجے تھے۔ حکام رنگون بہت محبت سے پیش آتے ہیں۔
شہزادے اکثر ہوا کھانے گاڑی پر جاتے ہیں۔[1]

رنگون بادشاہ کی سواری کلکتہ پہنچی تو اس وقت تک اسے رنگون بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس سلسلے میں ضروری انتظامات بھی کر دیے گئے تھے۔ چنانچہ کلکتہ پہنچتے ہی بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کو جہاز پر سوار کر دیا گیا اور جہاز بے تامل روانہ ہو گیا۔

میرزا غالب کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے تمام ساتھی خود نہیں گئے تھے، بلکہ انھیں بہ صورت قید و حبس بھیجا گیا تھا۔ فرماتے ہیں:

تاج محل، میرزا قیصر، میرزا جواں بخت کے سالے
میرزا ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے
رہائی ہو گئی ہے۔ بادشاہ۔ میرزا جواں بخت، میرزا عباس شاہ
زینت محل کلکتہ پہنچے۔[2]

غربت کی زندگی تفصیلاً معلوم نہیں کہ عالم غربت میں بادشاہ کی حیاتِ مستعار کے باقی دن کیوں کر گزرے۔ منشی امیر احمد صاحب علوی نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۸ء کے اختتام سے پیشتر رنگون پہنچ گئے تھے اور یہ عین قرین قیاس ہے

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۵۴ - ۴۵۵۔ [2] خطوط غالب مرتبہ مہر ص ۲۷۲۔

اس لیے کہ کلکتہ میں انھیں زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا اور کلکتہ سے رنگون تک کا سفر چند روز کا تھا۔ جہاز سے اتارتے ہی انھیں صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلے میں لے گئے، جو گھڑ دوڑ کے پرانے میدان کے قریب تھا۔ جس سڑک پر یہ بنگلہ واقع تھا، اسے آج کل "وائٹل روڈ" کہتے ہیں۔

بنگلے کے گرد گوروں کا پہرہ رہتا تھا اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، سرکار انگلشیہ سے صرف چھ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ بہادر شاہ نے خود کوئی درخواست پیش کرنا گوارا نہ کیا۔ زینت محل کے پاس کچھ زیورات باقی تھے، انھیں کو بیچ بیچ کر معاش کی ضرورتیں پوری کرتے رہے[1]۔

زمانۂ اسیری کی چند نظمیں بھی مشہور ہیں، لیکن ان کا انتساب محل نظر ہے۔ اس زمانے میں انھوں نے جو کچھ کہا ہوگا، اس کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف کا دامن خونِ جگر سے تر ہوگا؛ لیکن کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی، اس لیے کہ وہ خود ایک ایسا دردناک نوحہ بن کر رہ گئے تھے، جو کسی شرح کا محتاج نہ تھا۔

وفات

بیان کیا جاتا ہے کہ چہل قدمی یا ہوا خوری کے لیے بھی بہت کم باہر نکلتے تھے۔ جس دنیا میں ان کے وجود کا ایک ایک ذرہ ایسے آلام و محن کے شکنجوں سے گزر چکا تھا، جن کا تصور بھی ہر حساس قلب پر لرزہ طاری کر دیتا ہے، اس میں ہوا خوری یا چہل قدمی کے لیے انھیں کیا دلچسپی رہ سکتی تھی۔ بیشتر وقت خدا کی یاد اور تسبیح و استغفار میں گزارتے تھے۔ ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۹ھ (مطابق ۷۔ نومبر ۱۸۶۲ء) کو قیدِ حیات اور قیدِ فرنگ دونوں سے نجات پائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

---

[1] بہادر شاہ ظفر ص ۱۳۲۔

وفات کی بہت سی تاریخیں کہی گئی ہوں گی۔ مندرجہ ذیل کا علم ہو سکا:

۱۔ ندا درداد ہاتف بہرِ سالش
بہادر شاہ از دنیا برفت آہ

۲۔ چراغ دہلی جلوس کا سال تھا سواب بھی مطابق اس کے
سروشِ غیبی نے سالِ رحلت کہا، بجھا ہے چراغِ دہلی

۳۔ سراج دین نبی ابوظفر بہادر شاہ — ہوئے وہ عالم فانی سے راہ گیر بقا
سروش سے جو کہا میں نے بہرِ سالِ وفات — تو مجھ سے کہنے لگا چپ "چراغ ہند بجھا"

---

۴ یافت چو ابوظفر سراج الدین — از ریاض بہشت رنگ و بو
از وفاتش چو شد جہاں تاریک — گفت ہاتف چراغ دہلی سو

بیان کیا جاتا ہے کہ سکرات موت کے وقت زینت محل، جواں بخت، ان کی بیوی اور ایک خورد سال بچی کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ وفات کے بعد حکام سے دفن کی اجازت طلب کی گئی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بابر، شاہ جہاں اور عالمگیر اعظم کے اس آخری وارث کی تجہیز و تکفین کیوں کر ہوئی اور جنازے میں کون کون شریک ہوئے۔ بہ ہر حال انھیں اسی بنگلے کے احاطے میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

قبر کی کیفیت قبر کچی تھی۔ پاس بیری کا ایک درخت تھا۔ وہی درخت بالآخر قبر کا نشان باقی رہ گیا۔ زینت محل نے شوہر سے کوئی چوبیس سال بعد ۱۷۔ جولائی ۱۸۸۶ء کو انتقال کیا اور انھیں بھی شوہر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ شہزادہ جواں بخت والدہ سے

دو سال بیشتر بہ مقام مولمین (جنوبی برما) وفات پا چکے تھے۔ ان کی قبر کا نشان تک موجود نہیں۔

• زینت محل نے کچھ مدت اسی بنگلے میں گزاری۔ پانسو روپے ماہوار انھیں ملتے تھے اور پانسو شہزادہ جواں بخت کے لیے مقرر تھے۔ پھر انھیں دوسرے مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ جس احاطے میں بہادر شاہ اور زینت محل کی قبریں تھیں، وہ ایک یورپین کو ٹھیکے پر دے دیا گیا، جس کا نام ڈاسن تھا اور ڈاسن اینڈ کمپنی سے متعلق تھا۔ قبل ازیں لوگ فاتحہ خوانی کے لیے مزار پر چلے جاتے تھے اور خادم چراغ بھی جلا آتے تھے، ڈاسن نے راستہ بند کر دیا۔ قبر کے ایک طرف ٹینس کھیلنے کا میدان بنا لیا گیا، دوسری طرف گھوڑے سدھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس حالت میں قبروں کا کوئی بھی نشان باقی نہ رہا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں عبدالسلام نامی ایک دردمند شخص مزار کی جستجو کرتے ہوئے اس جگہ پہنچے اور بیری کے درخت سے قبر کا سراغ لگایا۔ انھوں نے اخباروں میں مضامین لکھے۔ حکومت برما سے خط و کتابت کی تو اس مقام پر ایک کتبہ لگایا گیا کہ دہلی کے معزول بادشاہ بہادر شاہ نے ۷۔ نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں وفات پائی اور اسے اس جگہ کے قریب دفن کیا گیا۔ پھر زینت محل کی قبر پر بھی تاریخ وفات لگا دی گئی۔ بعدازاں دونوں قبروں کو ملا کر ایک تعویذ بنا دیا، اردگرد لوہے کا کٹہرا لگا دیا اور اوپر ٹین کے سائبان کا انتظام کر دیا۔ بہادر شاہ کے پوتے سکندر بخت وہاں مجاوری کے لیے بیٹھ گئے۔[1]

مولانا آزاد کا بیان

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ ۱۸۵۲ء میں ایک معزز شہزادے خدابخش نے قلعے میں مشاعرہ شروع کیا تھا اور حضور سے بھی غزل کا وعدہ لے لیا تھا۔ دوسرے شعراء کے علاوہ ذوق مرحوم بھی شہزادے کے اصرار پر اس میں شریک ہوئے۔ حضور بالا بالا آئے اور پس پردہ بیٹھے۔ ایک خواص نے

---

[1] بہادر شاہ ظفر ص ۱۲۴ - ۱۲۵ ۔

حضور کی غزل سنائی۔

ایک شعر اس کا مجھے اب تک نہیں بھولا اور نہ بھولے گا:

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو

ہم بے کسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

دلی میں تو سات پشت خاندان زیرِ زمین آباد ہے۔

سکندرہ میں اکبر، آگرہ میں شاہجہان، اور نگ آباد میں

عالمگیر۔ اس غریب کو کوئی جگہ پسند نہ ہوئی۔ پسند کہاں؟ رنگون[1]

آزاد خود فرماتے ہیں کہ یہ غزل بہادر شاہ کے کسی دیوان میں نہیں لکھی گئی، لیکن جب یہ شعر مجھے یاد آتا ہے تو دیدۂ عبرت سے لہو ٹپکتا ہے۔

دیکھو خانہ برباد کا واقعہ بھی اسی پسند پر ہوا۔ کابل میں مرا

ہوتا، بابر کا مقبرہ موجود تھا۔ دکن میں مُوا ہوتا تو اورنگ آباد

میں عالمگیر کا مقبرہ تھا، اکبرآباد بھی دارالسلطنت تھا وہاں مرتا،

شاہ جہان کا مقبرہ تھا۔ سکندرہ پاس تھا وہاں مرتا، اکبر کے

دامن میں سوتا۔ لاہور میں آن مرتا، جہانگیر کی خواب گاہ حاضر تھی

مُوا تو کہاں؟ رنگون میں[2]

اس شعر کو ظفر کا سمجھیے یا یہ مانیے کہ مولانا آزاد نے اپنے قلب کی شدت تاثر کو بہادر شاہ سے منسوب کرنا مناسب سمجھا، لیکن اس میں واقعیت کا جو پُرتاثیر نقشہ پیش کیا گیا ہے، اس کی دردانگیزی اور حزن افزائی میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟ یہ ایک شعر

---

[1] دیوان ذوق مرتبہ آزاد ص ۱۲۴-۱۲۵ ۔ [2] ایضاً ایضاً عالمگیر کا مقبرہ اورنگ آباد میں نہیں بلکہ اس کے پاس خلد آباد میں ہے۔ مولانا نے شہرت کی بنا پر اورنگ آباد لکھ دیا۔

پورے مرثیے پر بھی بھاری ہے۔

آخری وصیتیں

۲۵۔ دسمبر ۱۸۶۲ء کے "جلوہ طور" میں شائع ہوا تھا کہ بہادر شاہ نے حالت نزع میں دو وصیتیں کی تھیں

۱۔ ان کی میت سپرد زمین ہو کر دہلی میں ان کے خاندانی مقبروں میں بھیجی جائے۔

۲۔ ان کی اولاد کو قید سے آزادی مل جائے۔

وہ جانتے تھے کہ میت کو رنگون سے دہلی منتقل کرنا جلد ممکن نہ ہوگا، لہٰذا فرمایا کہ میت کو فی الحال امانتاً رنگون میں رکھا جائے اور مناسب وقت کے بعد دہلی پہنچایا جائے۔ دہلی میں ان کے خاندانی مقبرے دو تھے، ایک ہمایوں کا مقبرہ، دوسرا قطب صاحب میں وہ مقبرہ جہاں شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی دفن ہوئے تھے۔ دونوں میں سے کسی ایک میں تدفین ان کے لیے باعث آسودگی روح ہوتی، لیکن انگریزوں سے ایسی کشادہ دلی کی امید کب پوری ہو سکتی تھی؟ پھر اگر کوئی قصور تھا تو بہادر شاہ کا تھا، جواں بخت یا شہزادہ عباس کا کیا قصور تھا اور بہادر شاہ کی وفات کے بعد انھیں رہا کرنے میں تامل کی کون سی وجہ تھی؟ انگریزوں نے یہ بات بھی نہ مانی، حبس دوام بہ عبور دریائے شور والے قیدی ایک معین مدت کے بعد رہا ہو سکتے تھے۔ بہادر شاہ کی اولاد کے لیے نجات کی کوئی بھی صورت نہ تھی۔ چنانچہ ان سب نے زندگی کے دن اجنبی سرزمین میں گزار دیے اور وہ اسی سرزمین کی آغوش میں یوم حساب کا انتظار کر رہے ہیں۔

بہادر شاہ کی یاد

بہادر شاہ کا لال قلعے سے نکل کر رنگون کی غربت میں دم توڑنا، محض ایک برائے نام بادشاہ ہی کی موت نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ مغلوں کے شانۂ اقبال کا وہ چراغ بھی گل ہو گیا تھا، جس کی لو پر مدت مدید سے ٹمٹماہٹ کا احتضار طاری تھا۔ یقیناً اس مسکین سے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہ پا سکا جو اس کی یاد کے چراغ دلوں میں روشن رکھتا، لیکن وہ گردش روزگار سے مظلومیت کی ایک ایسی تمثال بن گیا

کہ اس کے اسلاف کرام میں سے بعض جلیل القدر ہستیوں کے ہمیشہ زندہ رہنے والے کارناموں میں بھی نفوذ و تاثیر کی ویسی صلاحیت شاید ہی مل سکے۔ چنانچہ بہادر شاہ کی یاد سے دل کبھی غافل نہ ہوتے اور وہ یاد ہمیشہ قلب و جگر کے خون میں ڈوبی ہوئی تازہ ہوتی اور روحوں میں انتہائی اضطراب و بے تابی پیدا کر دیتی۔ مولانا راشد الخیری نے لکھا ہے کہ ۱۸۸۲ء میں مغرب کی نماز شاہی مسجد کے اندر ادا ہوئی۔ اس میں نواب احمد سعید خاں، حکیم عبدالمجید خاں، شہزادہ سلیمان جاہ وغیرہ شریک تھے۔

بہادر شاہ کی وفات پر بیس برس گزر چکے تھے۔ ان کے لیے
مغفرت کی دعا مانگی گئی تو سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

دوسری جنگ یورپ کے دوران میں سبھاش چندر بوس نے برما سے ہندوستان کی آزادی کے لیے قومی فوج تیار کی تھی۔ جب اسے ہندوستان کی طرف کوچ کا حکم دیا تو اس سلسلے میں ایک رسم بہادر شاہ کے مزار پر بھی ادا کی گئی تھی، جس میں سبھاش نے حلف اٹھایا تھا کہ ہم ہندوستان کو آزاد کرائیں گے تو اے مغلوں کی آخری یادگار! اے غریب الوطن بادشاہ دہلی! ہم تیری میت کو خاک غربت سے نکال کر وطن محبوب کی سرزمین میں سلائیں گے تاکہ تیری روح مظلوم آسودگی سے ہمکنار ہو! سبھاش بوس ہندوستان کو آزاد نہ کرا سکے، لیکن بعد میں ہندوستان آزاد ہوا۔ اس پر بارہ سال کی مدت گزر چکی ہے۔ دیکھیں غریب الوطن بہادر شاہ کا ڈھانچہ کب دہلی پہنچ کر آسودگی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

صوبہ

غربِ شمال اور اودھ

باب ۱

صوبے کی عام کیفیت

نام

جس صوبے کو انگریزوں نے ۱۸۵۶ء کے بعد صوبجاتِ متحدہ آگرہ و اودھ یونائٹڈ پراونسز یا یوپی) کا نام دیا، وہ الحاق اودھ سے پیشتر انگریزی حکومت کی اصطلاح میں "غرب و شمال" (نارتھ ویسٹرن پراونس) کہلاتا تھا، لیکن یہ اس کا اصلی نام نہ تھا اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس صوبے کو ہندوستان کی انگریزی حکومت میں سرحد غرب و شمال کی حیثیت حاصل تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ انگریزوں کے قبضے میں آئے تو ان تینوں کو ملا کر احاطہ بنگال (بنگال پریذیڈنسی) کا نام دے دیا گیا۔ پھر غربی حصے میں کچھ اضلاع آہستہ آہستہ شامل ہوتے رہے۔ وہ سب ابتدا میں احاطہ بنگال ہی کا جزو بنتے گئے ۱۸۳۳ء میں انتظامی سہولت کے پیش نظر احاطہ بنگال کی تقسیم عمل میں آئی تو شامل شدہ اضلاع کو الگ کر کے ایک نیا صوبہ بنا دیا گیا۔ چونکہ یہ صوبہ احاطہ بنگال کے غرب و شمال میں واقع تھا لہٰذا اسے یہ نام دے دیا گیا اور آگرہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔

ڈویژن

۱۸۵۷ء میں ہنگامے کا آغاز ہوا تو صوبہ غرب و شمال کے چھ ڈویژن تھے جن میں سے پانچ کی تفصیل مع متعلقہ اضلاع کے ذیل میں درج ہے:

نمبر شمار	ڈویژن	اضلاع
۱۔	آگرہ	آگرہ، متھرا، مین پوری، اٹاوہ، ایٹہ فرخ آباد۔
۲۔	میرٹھ	میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور، بلند شہر

نمبر شمار	ڈویژن	اضلاع
		ڈیرہ دون اور علی گڑھ۔
۳۔	بریلی	بریلی، شاہ جہان پور، مرادآباد، بجنور، اور بدایوں۔
۴۔	الہ آباد	الہ آباد، فتح پور، کان پور، باندہ اور ہمیر پور۔
۵۔	بنارس	بنارس، مرزاپور، جون پور، غازی پور گورکھ پور اور اعظم گڑھ

گورکھ پور کو بعدازاں دو ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا، ایک گورکھ پور اور دوسرا بستی، اسی طرح پیلی بھیت بھی بعدازاں بریلی سے الگ کر کے ایک مستقل ضلع بنا دیا گیا تھا۔

دہلی

اس وقت دہلی بھی صوبہ غرب وشمال ہی میں شامل تھا اور اسے بھی ایک مستقل ڈویژن کی حیثیت حاصل تھی، جس میں دہلی، گوڑگانوہ، رہتک، حصار اور پانی پت کے اضلاع شامل تھے۔ پانی پت کی جگہ بعدازاں کرنال کو ضلع کا صدر مقام مقرر کیا گیا۔ اسے ضلع تھانیسر بھی کہا جاتا تھا۔

جب پنجاب زیر تصرف آنے لگا تو لدھیانہ، انبالہ اور فیروز پور کو نئے صوبے میں شامل کر دیا گیا لیکن دہلی شہر بدستور صوبہ غرب وشمال کا ایک حصہ رہا اور اس پر آگرہ سے حکومت ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پیشتر دہلی کے تمام کاغذات آگرہ بھیجے جاتے تھے، نہ کہ لاہور، جو پنجاب کا دارالحکومت تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی شہر کو بھی پنجاب میں شامل کر دیا گیا تاکہ صوبہ غرب وشمال کا دائرہ کسی قدر کم ہو جائے۔ اودھ کے شمول کا اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ یوں ۱۸۵۷ء سے دہلی پنجاب کا جزو بنا، جسے ۱۹۱۱ء میں دوبارہ الگ کر کے دارالحکومت ہند کی بنیاد رکھی گئی، لیکن اس کے اضلاع بدستور پنجاب میں شامل رہے

یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم عمل میں آئی۔ پنجاب پر ایک مرتبہ ۱۹۰۱ء میں بھی تقسیم کا عمل ہوا تھا، جب صوبہ سرحد کے اضلاع اس سے الگ کیے گئے تھے۔

اودھ اودھ کے حدود ابتداءً ہی خاصے وسیع تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے مختلف حصے کٹتے گئے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں اس کے حدود اربعہ یہ تھے، شمال میں نیپال، مشرق، جنوب اور مغرب میں صوبہ غرب وشمال۔ اس کے کل بارہ ضلعے تھے جن کے نام یہ ہیں، لکھنؤ، بارہ بنکی، اناؤ، رائے بریلی، سلطان پور، پرتاب گڑھ، فیض آباد، گونڈہ، بہرائچ، سیتاپور، ہردوئی اور لکھیم پور کھیری۔

۱۸۵۶ء میں الحاق کے بعد پہلے اودھ کے لیے ایک چیف کمشنر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء تک یہی انتظام جاری تھا۔ ہنری لارنس چیف کمشنر ہی کی حیثیت میں گولہ لگنے سے زخمی ہو کر فوت ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی شہر کو صوبہ غرب وشمال سے الگ کر لیا گیا، اودھ کو ۱۸۷۷ء میں شامل کیا گیا اور اس کا نام صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ قرار پایا۔ اس کا صدر مقام پہلے آگرہ سے الہ آباد میں منتقل ہوا۔ ہمارے زمانے میں لکھنؤ کی پرانی عظمت کی بحالی کا تقاضا یہ ہوا کہ اسے صدر مقام بنایا جائے، نیز اسے الہ آباد کے بجائے صوبے میں زیادہ مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

ضروری گزارش یہ تفصیلات اس لیے ضروری تھیں کہ جو حالات آئندہ بیان کیے جائیں گے، انھیں سمجھنے میں سہولت رہے اور خوانندگان کرام کے ذہن میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔

یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ تفصیل کا جو پیمانہ دہلی کے سلسلے میں پیش نظر رہا، اسے اگر ہر مقام اور ہر حصے کے تعلق میں قائم رکھا جائے تو کتاب غیر معمولی ضخامت اختیار کرے گی، لہٰذا یہی مناسب سمجھا گیا کہ جس حد تک ممکن ہو، ایجاز و اختصار کا دامن نہ چھوڑا جائے۔ بایں ہمہ کوئی ضروری واقعہ اور کوئی قابل ذکر حادثہ نظر انداز نہ ہونے پائے۔

دہلی اپنی مرکزی اور جغرافیائی اہمیت کے اعتبار سے خاص توجہ کا مستحق تھا۔ وہاں انگریزوں

نے ظلم و جور کے جو طوفان بپا کیے، ان کی مثالیں تاریخ میں بہت ہی شاذ ملیں گی۔ پھر ظلم و جور کی یہ بجلیاں شاہی خاندان، امرا و اکابر اور اصحابِ علم و فضل پر گرائی گئیں، جو اس وسیع سرزمین کی عظمت و فضیلت کا عصارہ اور خلاصہ تھے۔ اس وجہ سے تفصیلات غیر موزون معلوم نہ ہوئیں، لیکن ہر مقام کی حالت وہ نہ تھی، جو دہلی کی تھی، اگرچہ ظلم و جور میں کہیں بھی کمی روا نہ رکھی گئی۔

دو بنیادی باتیں ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں دو باتوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور انھیں ہر لحظہ سامنے رکھنا چاہیے:

۱ــــــ جہادِ آزادی کا احساس زیادہ سے زیادہ وسیع بلکہ ہمہ گیر تھا، اگرچہ جوش و حمیت نے عملاً ہر مقام پر یکساں حیثیت اختیار نہ کی۔ اس کے خاص اسباب، خاص وجوہ اور خاص عوامل تھے، جو ضمناً جا بجا پیش ہوتے رہیں گے، اس سے واضح ہو گا کہ یہ تحریک نہ ایک خاص طبقے کے فوجیوں تک محدود تھی اور نہ اُسے غیر ذمہ دارانہ عناصر کی وقتی ہنگامہ آرائی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ واقعی قومی تحریک تھی اور یہی ۱۸۵۷ء کے جنگِ آزادی ہونے کی بنیاد و اساس ہے۔

۲ــــــ انگریز پہلے بھی اس ملک کے باشندوں سے عموماً حد درجہ غیر ہمدردانہ بلکہ معاندانہ برتاؤ کرتے تھے۔ مثلاً انھیں بہ اعتبارِ نسل و قوم فروتر سمجھا جاتا تھا اور خویشی و یگانگی کی طرف کبھی کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ لوگوں میں ان کے خلاف، غصے، ناراضی اور رنج کا جذبہ پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خاص طبقے کے سوا، جس کے دنیوی فوائد کا رشتہ انگریزوں کے دامن سے وابستہ تھا، کسی نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں ان سے دلی ہمدردی کا اظہار نہ کیا۔ البتہ ان پہ جو ظلم و جور ہوئے، ان سے ہر شریف اور مذہب دوست آدمی کو رنج پہنچا اور یہ ظلم کسی پر بھی ہوتے تو بہر حال رنج ہی پہنچتا۔ اس لیے کہ نہ مذہب ان کا روادار

تھا، نہ انسانیت ان پر مطمئن ہو سکتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے دوران میں اور اس کے بعد انگریزوں نے جو کچھ کیا، وہ تاریخ پاک و ہند ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم کا ایک نہایت تاریک اور خونچکاں باب ہے۔

جو حالات آیندہ بیان ہوں گے، ان میں یہ دو بنیادی باتیں برابر پیش نظر رہیں گی۔ لٰہذا اختصار و اجمال کے باوجود اصولاً انھیں ۱۸۵۷ء کا صحیح نقشہ سمجھنے اور ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔

اب آپ مختلف ڈویژنوں کی کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ کان پور کے حالات اہمیت کے اعتبار سے ایک جداگانہ باب میں بیان ہوں گے۔

باب ۲

آگرہ ڈویژن اور میرٹھ ڈویژن

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہونے کے وقت جان کالون[1] صوبہ غرب وشمال کا گورنر تھا۔ خود انگریزوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ اسے نظم ونسق کے جزئیات پر پورا عبور حاصل تھا، لیکن اس میں خود اعتمادی یا غیر متزلزل قوتِ فیصلہ باقی نہیں رہی تھی۔ جب آک لینڈ ہندوستان کا گورنر جنرل تھا تو کالون اس کا معتمد علیہ سیکرٹری تھا۔ پہلی جنگ افغانستان کے سلسلے میں آک لینڈ نے جو احمقانہ قدم اٹھائے تھے، ان میں کالون کی بھی رائے شامل رہی تھی۔ جب جنگ افغانستان انگریزی قوت کی تباہی پر منتج ہوئی اور مسلک اقدام کا کھوکھلا پن دنیا بھر پر آشکارا ہوگیا تو کالون کے قلب و دماغ پر ایسی ضرب لگی کہ اسے اپنی رائے اور قوت فیصلہ پر قطعاً بھروسا نہ رہا بلکہ وہ ایک مستقل تذبذب کا شکار ہوگیا۔ اس وجہ سے وہ ۱۸۵۷ء کے نازک حالات میں ذمہ داری کا اونچا عہدہ سنبھالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ صرف ملازمت کی طوالت کے لحاظ سے دوسروں پر فائق ہونے کے باعث گورنر بن گیا تھا، یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔

جان کالون

جن انگریزوں کی یہ رائے تھی وہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اگر کالون کی جگہ کوئی اور شخص صوبے کے نظم ونسق کا کفیل ہوتا تو وہ فوراً ایسے اقدامات کرتا کہ سرکشی کی آگ جا بجا نہ بھڑکتی، لیکن یہ تصوّر بالکل بے بنیاد ہے۔ میرٹھ میں فوج کے ہنگامے

غلط تصوّر

---

[1] JOHN COIVIN

کی خبر شائع ہونے کے بعد جگہ جگہ ہنگامے اس لیے برپا ہوئے کہ عوام میں رنج و ناراضی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ کالون کی جگہ کوئی دوسرا شخص بھی ہوتا تو وہ کیا کرتا؟ لوگوں کے دلوں سے رنج و ناراضی کے داغ دھو نہیں سکتا تھا۔ انگریزوں نے اپنے معاندانہ اندازِ حکومت سے جو چرکے لگائے تھے، ان کے لیے مرہم کا انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی اجنبیت اور بیگانگی کو خویشی و یگانگی نہیں بنا سکتا تھا۔

پھر ہندوستان کے ہر حصے میں کالون ہی کی حکومت نہیں تھی۔ لیکن کیوں جا بجا خوفناک ہنگامے برپا ہوئے؟ کیوں مختلف مقامات پر سرکشی کے طوفان اُٹھے؟ کیا کالون کو قوتِ فیصلہ اور اعتمادِ نفس سے محروم قرار دینے کا سبب یہ تھا کہ اس ہنگامے کی خبر سنتے ہی اہلِ ملک کو توپ و تفنگ سے اڑانے کا بندوبست کیوں نہ کر لیا؟ انگریزوں نے جبر و تشدد میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن کیا اس طرح ۱۸۵۷ء کا طوفان آخری حد پر پہنچنے سے رُک گیا؟ کچھ معلوم نہیں کہ انگریزوں نے کالون سے کیا کیا امیدیں لگا رکھی تھیں، جن کے پُورا نہ ہونے پر اسے نازک حالات میں کام کے قابل نہ سمجھا گیا۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ عام انگریزوں کے مقابلے میں اہلِ ملک کا زیادہ ہمدرد نہ تھا اور یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ انگریزی سلطنت کے استحکام کی خاطر اسے جبر و تشدد کا موقع ملتا تو وہ کوئی کسر اُٹھا رکھتا۔

مجلس مشورت

میرٹھ کے ہنگامے کی خبر ۱۱۔ مئی کو آگرہ پہنچی تھی، ساتھ ہی یہ افواہ پھیل گئی کہ میرٹھ سے جو سپاہ دہلی آئی ہے، وہ جلد سے جلد آگرہ کا رُخ کرے گی۔ اس پر گہری سراسیمگی پیدا ہوئی اور کالون نے مناسب سمجھا کہ ہر طبقے کے نمایندہ انگریزوں کو بلا کر احتیاطی تدابیر کے متعلق مشورہ کرے۔ آگرہ صوبے کا صدر مقام تھا اور وہاں بڑے بڑے انگریز موجود تھے۔ ۱۲۔ مئی کو مجلس مشاورت منعقد ہوئی، جس میں ملکی اور فوجی افسروں کے علاوہ کاروبار کرنے والے انگریز بلکہ پادری بھی موجود تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پادریوں کو کس غرض سے بلانا ضروری سمجھا گیا۔ اس اثنا میں دہلی کے اندر بھی آگ لگ چکی تھی۔

کالون کی اپنی رائے یہ تھی کہ حفاظت کے نقطۂ نگاہ سے تمام انگریزوں کو قلعے میں جمع کر لینا چاہیے اور شہر کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اس پر ہر طرف سے مخالفت کا شور مچ گیا ایسی حالت پیدا ہو گئی کہ جن انگریزوں کو بلایا نہیں گیا تھا، وہ بھی بے تکلف اندر آ کر مشورے پیش کرنے لگے۔ بڑی رد و کد کے بعد فیصلہ ہوا کہ خوف و ہراس کا اظہار کیے بغیر قلعے کو دیسی سپاہ سے خالی کرا لینا چاہیے اور انگریز رضاکاروں کا ایک جیش بھرتی کر کے ۱۴ مئی کی صبح کو دیسی فوج کے لیے پریڈ کا حکم جاری کر دینا چاہیے تاکہ اس سے ہتھیار لے لیے جائیں۔

اعتماد و بے اعتمادی کی مشترکہ نمائش

مجلس کے باہر انگریز خاصی تعداد میں جمع ہو چکے تھے۔ کالون فیصلے کے بعد انھیں تلقین کرنے کی غرض سے باہر نکلا۔ پہلے اس نے کہا کہ اپنے دیسی رفیقوں پر خواہ مخواہ بے اعتمادی نہ کرو۔ ساتھ ہی بولا۔

> دیکھو، ان بدمعاشوں (سرکشوں) نے دہلی میں ایک پادری کی بیٹی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ ان سے میدان میں مقابلے کا موقع آئے تو اس الم ناک واقعے کو بھلا نہ دینا۔[1]

کالون کو یہ خیال نہ آیا کہ میرٹھ کے انگریز فوجی افسروں نے ان بچاسی دیسیوں سے کیا سلوک روا رکھا تھا، جو بیسیوں میدانوں میں انگریزی سلطنت کی توسیع کے لیے سر بکف رہے تھے؛ اسے صرف پادری جننگس[2] کی بیٹی کا خیال رہا اور اشتعال جذبات کے عالم میں اس واقعے کا ذکر زبان پر لانے کا طبعی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ انگریز اور زیادہ مشتعل ہو جاتے ان میں اور زیادہ جوش و خروش پیدا ہو جاتا۔ وہ دیسیوں کو جلد سے جلد اندھا دھند موت کے گھاٹ اتار دینے کے لیے دیوانے بن جاتے۔ ہومز نے لکھا ہے، انگریزوں کی حالت

---

[1] ہومز ص ۱۲۷ نیز سین ص ۳۲۲۔ [2] JENNINGS

یہ تھی کہ موقع پاتے تو اسی وقت اور اسی جگہ دیسی سپاہیوں کو بندوقوں کی باڑ کا نشانہ بنا لیتے۔[1]

یہ کالون تھا جسے رائے اور عمل میں متذبذب قرار دیا گیا! وہ متذبذب نہ ہوتا تو خدا جانے کیا کرتا۔

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

بھرت پور اور گوالیار سے امداد

جب حالات زیادہ نازک ہو گئے تو کالون نے گوالیار اور بھرت پور کے راجاؤں کو امداد کے لیے پیغام بھیجا۔ شاید خیال ہو کہ یہ دونوں ریاستیں آگرہ سے قریب تھیں اور وہاں سے امداد جلد پہنچ سکتی تھی۔ ممکن ہے یہ درست ہو، لیکن مولوی ذکاء اللہ فرماتے ہیں:

> کالون کا خیال یہ تھا کہ دہلی کے بادشاہ کے درباریوں کی سازش سے یہ بنگال کی سپاہ کا غدر برپا ہوا ہے، اس لیے اس نے یہ خیال کر کے کہ مرہٹے اور جاٹ دہلی کی بادشاہی کے سخت جانی دشمن ہیں، مہاراجا گوالیار اور بھرت پور سے امداد کی درخواست کی کہ وہ اپنی مرہٹوں اور جاٹوں کی سپاہ سے امداد کریں، جن کو وہ جانتے تھے کہ پہلی عداوتوں کے سبب سے دہلی کے بادشاہ سے وہ خوب لڑیں گے۔[2]

دیکھا، اس اسلوب فکر سے قطعی طور پر روشن ہو جاتا ہے کہ انگریز ملک پر کس ذریعے، کس طریقے اور کس تدبیر سے قابض ہوئے تھے! یہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ تفرقہ انگیزی اور اختلاف آرائی ہی کے ذریعے سے وہ اپنا قبضہ بحال رکھنا چاہتے تھے اور یہی گُر ان کی کامیابی کا باعث بنا۔

---

[1] جوہر، ص ۱۲۰ ؛ [2] ذکاء اللہ، ص ۱۸۷

۲۵۔مئی کا اعلان یکایک کالون کو خیال آیا کہ اگر سرکش سپاہیوں کو یقین دلادیا جائے کہ ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہ کیا جائے گا تو اکثر لوگ سرکشی سے باز آجائیں گے۔ چنانچہ اُس نے ایک اعلان شائع کر دیا کہ جو سپاہی معافی مانگ لیں گے اور ہتھیار ڈال دیں گے، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے گا، البتہ جن لوگوں نے مفسدانہ طریق پر بغاوت کی آگ مشتعل کی یا انگریز افسر کو قتل کیا، وہ معافی سے مستثنیٰ ہیں۔ انھیں ضرور سزا ملے گی۔

اس اعلان کا کچھ اثر ہوتا یا نہ ہوتا لیکن گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اسے دیکھتے ہی سوچا کہ اس طرح تو بہت سے لوگوں کو معافی مانگنے کا موقع مل جائے گا، حالانکہ انھیں سزائیں ملنی چاہئیں۔ چنانچہ گورنر جنرل نے کالون کے اعلان کو منسوخ کر کے اپنی طرف سے نیا اعلان شائع کرایا، جس میں معافی کو پہلے اعلان کے مقابلے میں محدود کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں اعلان اصل مقصد و مدعا کے خلاف گئے۔ سپاہیوں کو اور بھی یقین ہو گیا کہ انھیں انگریزوں سے کسی بھلائی کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ سوال نیتوں کا نہیں بلکہ صرف تدبیر کی ظاہری حیثیت کا ہے۔ یا تو کالون کو چاہیے تھا کہ گورنر جنرل سے مشورے کے بغیر کوئی اعلان نہ کرتا۔ یا گورنر جنرل کو چاہیے تھا کہ ایک اعلان ہو چکا تھا تو صبر کے ساتھ اس کے نتائج کا انتظار کر لیتا۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہر شخص صرف اپنے خیالات کی پابندی میں سرگرمی کا اظہار کر رہا تھا اور کسی کو خیال نہ تھا کہ معاملے کا تعلق تنہا انگریز حاکموں سے نہیں، لاکھوں ہندوستانیوں سے بھی ہے، جو حاکموں کے زیرِ اقتدار نہیں تھے۔

علی گڑھ اب آگ پھیلنے لگی۔ ۲۱ مئی کو خبر آئی کہ علی گڑھ بھی گیا جو میرٹھ اور آگرہ کی درمیانی شاہراہ پر آگرہ سے پچاس میل اور میرٹھ سے اسی میل تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سپاہی اطمینان سے بیٹھے تھے، اگرچہ تشویشناک خبریں برابر پھیل رہی تھیں۔ چونکہ ضلع کے مختلف حصوں سے بُری اطلاعات آ رہی تھیں، اس لیے فوج کے ایک دستے کو سچ جھوٹ کی چھان بین کے لیے باہر بھیجا گیا۔ وہ لوگ دو روز کے بعد واپس ہوئے اور شہر میں سے ہو کر

اپنی لائنوں کی طرف جا رہے تھے تو قصابوں نے انھیں یہ ترغیب دی کہ انگریز افسروں کو قتل کردو اور آزادی کے مجاہدوں میں شامل ہو جاؤ۔ اس وقت سپاہیوں کی یہ حالت تھی کہ جو لوگ انھیں ایسی ترغیب دیتے، انھیں اپنے افسروں کے حوالے کر دیتے۔

ایسے ہی آدمیوں میں سے ایک برہمن بھی تھا، جسے عام روایت کے مطابق اس پاس کے دیہاتیوں نے سپاہ کو ورغلانے کے لیے بھیجا تھا۔ اس برہمن نے سپاہیوں سے کہا کہ ہم باہر سے ایک برات لائیں گے، تم اس کے ساتھ شامل ہو کر افسروں کو مار دینا۔ پھر خزانہ لوٹ لیں گے جس میں سات لاکھ روپے ہیں۔ اس برہمن کے خلاف مقدمہ قائم ہوا اور ۲۰ مئی کو اسے دیسی سپاہ کے روبرو پھانسی دے دی گئی۔ سپاہی چپ چاپ یہ منظر دیکھتے رہے۔ یکایک ایک سپاہی آگے بڑھا اور برہمن کی لٹکتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کر کے بلند آواز سے بولا:

"بھائیو، اسے دیکھو جس نے دھرم کی خاطر جان قربان کر دی۔"

بس یہ سننا تھا کہ سپاہی ایک ملے میں بگڑ گئے۔ انھوں نے افسروں کو تو کوئی آزار نہ پہنچایا، لیکن ان سے اور تمام دوسرے فرنگیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ علی گڑھ سے جلد از جلد چلے جائیں۔ پھر انھوں نے خزانہ لوٹا، جیل خانہ توڑا، قیدی چھڑائے اور دہلی روانہ ہو گئے۔ واضح رہے کہ کسی انگریز یا عیسائی کو قتل نہ کیا البتہ برطانوی حکمرانی کا نظام درہم برہم کر ڈالا۔[1]

مین پوری

مین پوری آگرہ سے مشرقی جانب قریباً اکہتر میل پر تھا۔ علی گڑھ کی خبر مین پوری ۲۲ مئی کو پہنچی۔ وہاں کا راجا انگریز افسران بندوبست کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اٹھا چکا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کا دل صاف نہ ہو گا، لیکن اس کے چچا بھوانی سنگھ نے اس غرض سے انگریزوں کا ساتھ دیا کہ ریاست اسے مل جائے گی۔ وہاں کے مجسٹریٹ نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ بچوں اور عورتوں کو بہ عجلت تمام آگرہ پہنچا دیا جائے اور سپاہیوں کو مین پوری سے

---

[1] دوسری کتابوں کے علاوہ ملاحظہ ہو سین کی کتاب ص ۳۲۲۔

نکال کر بھو گاؤں لے جائے۔ چنانچہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ ایک منزل تک ایک انگریز گیا، پھر انھیں ایک مسلمان کے حوالے کر دیا گیا، جس پر پورا اعتماد تھا۔ اس مسلمان نے سب کو بحفاظت آگرہ پہنچا دیا۔ سپاہیوں کو سمجھانے میں کوئی دقیقہ سعی نہ اٹھا رکھا گیا۔ ترغیب و ترہیب دونوں سے کام لیا گیا، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بعض فرنگی فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ایک فوجی افسر لفٹنٹ ڈی کانٹزو[1] نے آخری وقت تک سپاہیوں کو سمجھانے اور روکنے کا فرض ادا کیا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ غرض یہ سپاہی بھی مین پوری سے نکلے اور دہلی روانہ ہو گئے۔

اٹاوہ

اٹاوہ۔ آگرہ سے ستر میل جنوب مشرق میں ہے۔ جب میرٹھ میں ہنگامے کی خبر پہنچی تو وہاں کے کلکٹر اور مجسٹریٹ ایلن ہیوم[2] نے چھوٹے چھوٹے طلایہ گرد دستے تیار کر لیے تاکہ وہ سڑکوں پر چکر لگاتے رہیں اور جسے مشتبہ دیکھیں گرفتار کر لیں۔ ۱۹۔ مئی کو ان لوگوں نے ایک رسالے کے سات آدمی پکڑے، جو سرکشی اختیار کر چکا تھا مگر ان سے ہتھیار نہ لیے۔ وہ لوگ موقع پا کر انگریز افسر پر پل پڑے۔ گارد کے آدمیوں نے سات میں سے پانچ کو مار دیا اور دو بھاگ گئے۔ ان میں سے بھی ایک بعد ازاں پکڑا گیا۔

بہرحال اس واقعے نے رنج اور غصے کی آگ تیز کر دی۔ ۲۳۔ مئی کو ہنگامہ بپا ہوا۔ ۲۵۔ کو گوالیار کی فوج کا ایک دستہ کمک کے لیے پہنچ گیا اور امن قائم کر دیا گیا۔

متھرا

۳۰۔ مئی کو متھرا کی فوج نے اطاعت کا جُوا اتار پھینکا۔ راجا بھرت پور نے جو دستہ کالون کی طلب پر بھیجا تھا، وہ ہوڈل میں مقیم تھا۔ ہوڈل متھرا اور دہلی کی شاہراہ پر اول الذکر مقام سے قریباً سینتیس[3] میل ہے۔ جب اس دستے سے کہا گیا کہ ایک مناسب مقام پر چوکس ہو کر بیٹھ جاؤ تو اس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا بلکہ انگریز افسروں کو تنبیہ کر دی کہ چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ میلی سن لکھتا ہے کہ اب انکشاف ہوا:

---

[1] DEKANTZOW ← [2] ALLAN HUME, ←

بغاوت صرف ان سپاہیوں تک محدود نہ تھی جو

انگریزوں کی ملازمت میں تھے بلکہ ساعت بہ ساعت زیادہ سے

زیادہ قومی بن رہی تھی[1]

بلند شہر

بلند شہر میں قتل کی کوئی واردات نہ ہوئی، البتہ سپاہی اُٹھے، خزانہ لوٹا اور رخصت ہو گئے۔ انگریز افسر جا ہی چکے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر گوجروں نے بڑا ہنگامہ بپا کیا۔ جیل خانہ توڑا، سرکاری دفتر تباہ کیے اور ریکارڈ جلا دیے۔ یہاں کا مجسٹریٹ برینڈ سا پٹے[2] بڑا ہمت ور ثابت ہوا۔ وہ ۲۵۔ مئی کو پھر اپنے صدر مقام پر پہنچا۔ وہاں سے اُسے گورکھوں کا ایک جیش مل گیا جس کے ذریعے سے بحالی امن کی کوشش کی، تاہم وہ کچھ نہ کر سکا اور خود بلا سپور جا کر پناہ لی۔ انھیں گوجروں کی ترکتازیوں کو ختم کرنے کی غرض سے نواب ولی داد خاں رئیس مالاگڑھ کو بہادر شاہ ظفر نے بھیجا تھا، جس کے حالات الگ لکھے جا چکے ہیں۔

مظفر نگر

مظفر نگر میں خزانے کی حفاظت کے لیے جو دستہ مامور تھا، وہ میرٹھ کی اس سپاہ میں سے تھا جو ۱۰۔ مئی کے واقعات کی ذمہ دار تھی۔ ظاہر ہے کہ اس دستے کے لیے خاموش بیٹھے رہنا ممکن نہ تھا۔ وہاں کے مجسٹریٹ برفورڈ[3] نے جب میرٹھ میں سپاہ کی سرکشی کا حال سُنا تو دفاتر بند کرا دیے، خود ایک مکان میں جا بیٹھا اور جو گارد جیل خانے پر پہرے کے لیے متعین تھی۔ اُسے اپنی حفاظت کے لیے مقرر کر لیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ تمام لوگوں کو یقین ہو گیا۔ انگریزی راج کا سُورج ڈوب چکا ہے، اب جو چاہو کرو۔ چنانچہ لوگوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ سپاہی کب تک بیٹھے رہتے؟ وہ بھی اُٹھے، خزانہ لوٹا اور مراد آباد روانہ ہو گئے۔

---

[1] میلی سن جلد سوم ص ۱۰۹، [2] BRAND SPATE [3] BEFORD.

سہارن پور سہارن پور بوجوہ نہایت اہم مقام تھا۔ یہاں نہر کا صدر مقام تھا۔ جہاں سے انجینئر دہلی بھیجے گئے۔ نیز وہاں انجینئری کا کالج تھا۔ پھر اسی جگہ سے ڈیرہ دون اور مسوری کے پہاڑی مقامات کو راستے جاتے تھے۔ وہاں رابرٹ اسپینکی[1] مجسٹریٹ تھا۔ اس نے اپنے رفیقوں کی امداد سے سہارن پور کو سنبھالے رکھا۔ دو مرتبہ سرکشی کے واقعات پیش آئے۔ ایک مرتبہ ۳- جون کو اور دوسری مرتبہ ۱۱- جولائی کو، لیکن دونوں مرتبہ حالات پر قابو پا لیا گیا۔ یہاں تک کہ ستمبر میں شہر دہلی فتح ہو گیا۔ ساتھ ہی تشویش کے اسباب ختم ہو گئے۔

آگرہ ہم نے آگرہ ڈویژن اور میرٹھ ڈویژن کے مختلف اضلاع کی کیفیت اجمالاً بیان کر دی۔ ایٹہ کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا کہ وہاں سرکشی ہوئی۔ مجسٹریٹ مدد حاصل کرنے کے لیے بدایوں پہنچا تو وہاں بھی سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور حالات بگڑ چکے تھے۔ فرخ آباد کا ذکر آگے آئے گا۔ ضلع میرٹھ کے حالات آغاز میں بیان ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں پھر آگرہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

۳۱- مئی کو آگرہ کی سپاہ سے ہتھیار لے لیے گئے۔ جب ہنگامے کے شعلے دُور دُور تک پہنچ گئے، نیمچ اور نصیر آباد کی فوجوں نے آگرہ کی طرف کوچ کیا تو اواخر جون میں کالون اس بات پر راضی ہوا کہ انگریز عورتوں اور بچوں کو قلعے میں پہنچا دیا جائے۔ اب سوال یہ تھا کہ اس خطرے کا مقابلہ کیوں کر کیا جائے، جو باہر سے آگرہ پر بڑھا چلا آ رہا تھا۔

اس وقت گوروں اور وفادار سپاہیوں کے سوا یا تو راجا کوٹہ کا ایک دستہ انگریزوں کے پاس تھا یا ایک مقامی رئیس نواب سیف اللہ خاں نے اپنا ایک دستہ

---

[1] ROBERT SPANKIE

تیار کر کے انگریزوں کی خدمت شروع کر دی تھی۔ کوٹہ کے دستے پر اعتماد نہ تھا۔ لہٰذا تجویز
پیش ہوئی کہ اس سے ہتھیار لے لیے جائیں۔ انگریز سالار نے ایسا قدم اُٹھانے کے
بجائے یہ مناسب سمجھا کہ دستے کی وفاداری کا امتحان لے لیا جائے۔ چنانچہ اس دستے
کو حملہ آوروں پر بھیجا گیا۔ وہ لوگ مقابلے کے بجائے خود حملہ آوروں سے جا ملے۔ عین
اس حالت میں سیف اللہ خاں نے اطلاع دی کہ میرے آدمی بھی اب قابلِ اعتماد
نہیں رہے۔ چنانچہ انھیں بھی ایک طرف گاؤں میں بٹھا دیا گیا۔

تشویشناک حالات

تشویش ہر لحظہ بڑھ رہی تھی۔ حالات بے حد نازک تھے۔
جو انگریز قلعے میں بیٹھے تھے، ان پر تذبذب کی ایسی خوفناک
حالت گزر رہی تھی، گویا زندگی اور موت کے درمیان لٹکے ہوئے تھے۔ اور کالون کی
جسمانی قوت جواب دے چکی تھی۔ ڈاکٹر اسے مشورہ دیتے تھے کہ کام چھوڑ کر آرام کرو۔
وہ کہتا کہ خدا نے جو فرض میرے ذمے عاید کر دیا ہے، اسے کس کے حوالے کروں؟ نہ باہر
سے مخابرت کی کوئی اچھی صورت تھی اور نہ کسی کمک کے پہنچنے کی امید تھی۔ کمک کہاں سے
پہنچتی؟ جہاں جہاں انگریز بیٹھے تھے، آفات و حوادث کے نرغے میں آئے ہوئے
تھے۔ ایک جگہ آگ بجھتی اور دس جگہ بھڑک اٹھتی تھی۔ یقیناً اس وقت آگرہ کے
انگریزوں کی حالت وہی تھی جیسے مسافروں کے جہاز کا لنگر ٹوٹ جائے، بادبان تار
تار ہو جائیں، ملاحوں کے بازو شل ہوں اور جہاز موجوں کے تلاطم میں تنکے کی طرح ادھر
اُدھر تھپیڑے کھاتا پھرے۔ نہ کوئی سہارا ہو اور نہ کوئی آسرا۔

جنگِ ساسیہ

آخر ۵۔ جولائی کو بعد دوپہر چھوٹی سی انگریزی فوج حملہ آوروں سے
مقابلے میں نکلی۔ ساسیہ میں جنگ ہوئی جو آگرہ کے نزدیک ہے
اس جنگ کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ انگریزی
فوج تھوڑی تھی۔ سپہ سالار نے بچاؤ کی غرض سے پیادوں کو حکم دے دیا کہ زمین پر لیٹ

جائیں اور توپ خانے کی جنگ جاری رہی۔ انگریزی توپیں کارگر نہ ہوسکیں۔ جب دباؤ بہت بڑھ گیا اور انگریزوں کا گولہ بارود ختم ہونے لگا تو پیادہ فوج کو مقابلے کا حکم ملا لیکن وہ بھی کچھ نہ کرسکی اور انگریزی سالار نے اس اندیشے سے کہ کہیں پیچھے سے راستہ کٹ نہ جائے فوج کو آگرہ کی جانب مراجعت کا حکم دے دیا۔

کالون کی وفات

اب حالات اور بھی نازک ہو گئے۔ انگریز قلعے میں ہو بیٹھے، شہر عوام کے قبضے میں آگیا۔ قلعے کے اندر موتی مسجد انگریزوں کا ہسپتال بن گئی۔ باہر بنگلوں اور دفتروں کو آگ لگ رہی تھی۔ یہ دور جولائی سے ستمبر تک ممتد ہوا۔ ۹ ستمبر کو کالون نے وفات پائی اور اس کا عہدہ عارضی طور پر ریڈ[1] نے سنبھال لیا جو ریونیو بورڈ کا سینئر ممبر تھا۔

---

[1] REODE

باب ۳

روہیل کھنڈ اور فرخ آباد

تشویش و اضطراب

بریلی اسی علاقے کا مرکزی مقام ہے جسے عام طور پر روہیل کھنڈ کہا جاتا ہے۔ اس علاقے نے روہیلوں کے زمانۂ اقتدار میں بڑی اونچی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ شجاع الدولہ والی اودھ نے وارن ہیسٹنگز کو روپے کا لالچ دے کر ساتھ ملایا اور دونوں کی مشترکہ قوت نے روہیلوں کو تباہ کر دیا۔ روہیلوں میں سے حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہت ممتاز و نامور تھے۔

صرف بریلی نہیں بلکہ پورے روہیل کھنڈ میں اسی وقت سے تشویش و اضطراب کی لہریں دوڑنے لگی تھیں، جب ڈم ڈم اور بارک پور میں نئی بندوق اور اس کے لیے چربی والے کارتوسوں نے سراسیمگی پیدا کی تھی۔ روہیل کھنڈ کے لوگ مذہبی معاملات میں بہت ذکی الحس تھے، پھر ان میں دینی غیرت و حمیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ وہ کیوں کر گوارا کر سکتے تھے کہ ملازمت کے سلسلے میں کسی ایسی حرکت کے مرتکب ہوں، جو ان کے مذہب کے خلاف تھی؟ میلی سن لکھتا ہے، وہ بار بار کہتے تھے کہ ہم نے اور ہمارے آباؤ اجداد نے انھیں پرانی بندوقوں سے ہندوستان کو مسخر کر لیا، پھر اب نئی بندوق کی کیا ضرورت ہے؟ فوجی افسروں کو اس تشویش و اضطراب کا احساس تھا، اگرچہ ان حالات کا کوئی اندازہ نہ تھا جو آگے چل کر پیش آنے والے تھے۔

احتیاطی تدابیر

بریگیڈیر سبالڈ[1] بریلی چھاؤنی کا افسر اعلیٰ تھا۔ وہ دورے پر گیا ہوا تھا۔ اور اس کی جگہ کرنیل کالن ٹروپ[2] کمانڈر اعظم کے فرائض انجام

---

[1] SIBBALD [2] TROUP,

دے رہا تھا، جب میرٹھ کی سرکشی کی اطلاع بریلی پہنچی۔ اس کے علاوہ فوجی افسروں میں سے کپتان الیگزانڈر میکنزی[1] قابل ذکر ہے، جس نے ہنگامے کو روکنے کے لیے بڑی جانبازی سے کام لیا، اگرچہ کامیاب نہ ہو سکا۔

میرٹھ سے سرکشی کی خبر آتے ہی کرنیل ٹروپ نے انگریز عورتوں اور بچوں کو نینی تال بھیج دیا۔ جتنے دیسی جیش بریلی میں موجود تھے، ان میں سے ۸ بے قاعدہ رسالہ نیک نامی میں بہت مشہور تھا۔ اور اس کی وفاداری پر انگریزوں کو خاص اعتماد تھا، لہٰذا کرنیل ٹروپ نے فیصلہ کیا کہ اس کی تعداد دُگنی کر لی جائے۔ ساتھ ہی تمام سول افسروں کو خط لکھ دیے کہ جہاں جہاں قابل اعتماد سوار ملیں۔ انھیں ملازمت کے لیے بھیج دیا جائے۔ کپتان میکنزی اسی رسالے کا کمانڈر تھا۔ ٹروپ نے سپاہیوں کے شکوک و شبہات دُور کرنے کی بھی کوشش کی لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اس اثنا میں دہلی، میرٹھ اور فیروزپور سے قاصد برابر پہنچ رہے تھے اور خان بہادر خاں (ابن ذوالفقار خاں، ابن حافظ رحمت خاں) کی ایجنٹ سے ضلع میں سازشوں کا جال بچھایا جا رہا تھا[2]

ہنگامے کی ابتدا

۱۹۔ مئی کو سپالڈ دورے سے واپس آیا اور دس دن بہ ظاہر اطمینان سے گزر گئے۔ ۲۹۔ مئی کو کمشنر کی طرف سے ایک نوٹ کرنیل ٹروپ کے پاس پہنچا کہ جو اطلاعیں ملی ہیں ان کے مطابق ۶۸ پیادہ فوج آج ہی بغاوت کرنے والی ہے۔ عین اُسی وقت سارجنٹ میجر نے اطلاع پہنچائی، دریا میں نہاتے وقت ۱۸ اور ۶۸ کے آدمیوں نے حلف اٹھائے ہیں کہ رات کے دو بجے اُٹھ کر تمام انگریزوں کو قتل کر دیا جائے گا[3]

---

[1] MACKENZIE. [2] میلی سن جلد سوم ص ۲۰۵ – ۲۰۶ [3] بیان کیا جاتا ہے کہ کپتان میکنزی کو ایک ہندو رسالدار نے بھی یہی اطلاع دی تھی اور اس رسالدار نے (باقی ص ۲۹۲ پر)

ایک دن رات سخت تشویش میں گزرے۔ ۲۱ کی صبح سے ہنگامے کے تمام آثار یکے بعد دیگرے رونما ہونے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے ۱۱ بجے کا وقت باہم طے ہو چکا تھا۔ چنانچہ ادھر گیارہ بجے، ادھر ۶۹ کے سپاہی دوڑ کر توپوں پر جا پہنچے اور آس پاس کی عمارتوں پر گرداب مارنے لگے۔ باقی سپاہیوں نے بندوقیں سنبھالیں، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائیں اور انگریز افسروں کے بنگلوں کا رُخ کیا۔

میکنزی کی کوششیں اب کپتان میکنزی نے کوششیں شروع کر دیں کہ اپنے سپاہیوں کو قابو میں لائے۔ وہ ایک فریق کو راضی کر کے لاتا تو دوسرا بگڑ جاتا۔ برگیڈیر سبالڈ مارا جا چکا تھا۔ کرنیل ٹروپ نے نینی تال جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ تیار ہو گئے۔ میکنزی نے ہمت نہ ہاری، اگرچہ انجام کار اسے بھی ناکام ہو کر نکل جانا پڑا۔

یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ سپاہیوں کو اٹھانے اور مقصد آزادی کے لیے جانیں لڑا دینے کے لیے جن لوگوں نے مسلسل اور متواتر سرگرمی سے کام کیا وہ دو تھے، اوّل بخت خاں جو توپ خانے کا صوبیدار تھا اور آگے چل کر جنگ آزادی کے ممتاز رہنماؤں میں محسوب ہوا، دوم محمد شفیع جو ۸ بے قاعدہ رسالے میں رسالدار میجر کے منصب پر فائز تھا۔ میکنزی کی کوششوں کو ناکام بنانے کا سب سے بڑھ کر ذمہ دار محمد شفیع ہی تھا۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ صرف تیس آدمی رہ گئے، جنھوں نے انگریزوں کا ساتھ نہ

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۹۱)

اپنے ہندو سپاہیوں سے سب کچھ سُنا تھا جو دربار پر بہانے کی غرض سے گئے تھے۔ ڈاکٹر سین لکھتے ہیں کہ رسالے کے ہندو کلرک درگا داس بنڈ پادھیا نے سپاہیوں کی بدلی ہوئی روش کے متعلق انگریز افسروں کو مطلع کیا تھا۔ (۲۴۶)

چھوڑا اگرچہ انھیں بڑے لالچ دیے گئے۔[1]

خان بہادر خاں

انگریز رخصت ہو گئے تو خان بہادر خاں کی حکمرانی کا اعلان ہو گیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، وہ حافظ رحمت خاں کا پوتا تھا۔ انگریزوں کی مداخلت سے پیشتر روہیل کھنڈ کی حکومت اس کے جدِ امجد کے ہاتھ میں تھی اور مسند حکومت چھن جانے کے باوجود اس کے خاندان کو نہ صرف بریلی بلکہ پورے روہیل کھنڈ میں انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

بڑے کارکنوں میں سے محمد شفیع رسالدار، خان بہادر خاں ہی کے پاس رہا۔ بخت خاں فوج اور روپیہ لے کر دہلی پہنچ گیا اور وہاں اس نے جو کارنامے انجام دیے وہ سرگزشت دہلی میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ بعد میں جو کچھ کیا وہ اودھ کے حالات میں آئے گا۔ خان بہادر خاں نے اپنے خاندان کے پرانے متوسلوں کو بھی جمع کر لیا بلکہ کہنا چاہیے وہ لوگ خود بخود خدمت گزاری کے لیے آ گئے۔ مقصود یہ نہ تھا کہ عہدے اور منصب لیں، مقصود یہ تھا کہ جہادِ آزادی کے تعلق میں اپنا قومی اور مذہبی فرض ادا کریں۔

شاہ جہان پور

جس روز بریلی میں ہنگامہ بپا ہوا تھا، اسی روز شاہ جہان پور میں آزادی کا پرچم لہرایا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ نہ صرف بریلی اور شاہ جہان پور کے درمیان بلکہ روہیل کھنڈ کے دوسرے مرکزوں کے درمیان بھی مخابرت اور مشورے کے سلسلے

---

[1] میلی سن جلد سوم ص ۲۱۱۔ ڈاکٹر بیبن نے لکھا ہے کہ انگریز راجپوت ٹھاکروں اور پٹھانوں کی دیرینہ رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر انھیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے کے خواہاں تھے۔ خان بہادر خاں، جو مسلم امرا میں سے ممتاز تھا، روزانہ کپتان الیگزانڈر کمشنر سے ملتا تھا نیز محمد شفیع رسالدار میجر نے اوائل مئی ہی میں یقین دلا دیا تھا کہ رسالہ کسی بھی حالت میں بغاوت نہ کرے گا (۳۴۵ - ۳۴۶) ساتھ ہی واضح کر دیا ہے کہ خان بہادر خاں نے کمشنر کو بتا دیا تھا، حالات بگڑ چکے ہیں، سپاہ ضرور بغاوت کرے گی اور اپنی جان بچاؤ (۳۴۷)

جاری ہوں گے۔

انگریز ۳۱-مئی کو گرجے میں جمع تھے، جب ان پر اچانک یورش ہوئی۔ بعض انگریز زخمی ہوئے۔ پھر انھوں نے گرجے کا دروازہ بند کر لیا اور عورتوں کو مینار پر پہنچا دیا۔ اتفاق یہ کہ سپاہی حملے کے لیے آئے تو کسی کے پاس بندوق نہ تھی۔ سب کے ہاتھ میں یا تلواریں تھیں یا ڈنڈے تھے۔ پھر ایک انگریز بندوق لے کر آیا تو سپاہی بھی بندوقیں سنبھالنے کے لیے دوڑے۔ اس اثنا میں انگریزوں کے ملازم ان کے اسلحہ لے آئے۔ ہتھیار پا کر انگریزوں نے گرجے کا دروازہ کھولا تو گاڑیاں بھی موجود تھیں جن میں سوار ہو کر وہ گرجے پہنچے تھے اور کچھ سکھ سپاہی بھی ان کی حفاظت کے لیے آ گئے تھے۔ اس اثنا میں چھاؤنی کے اندر ہنگامہ عام بپا ہو گیا اور انگریزوں کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ شاہ جہان پور کو چھوڑ کر کوئی محفوظ مقام تلاش کریں۔ وہ پوائیں کے راجا کے پاس پہنچے، اس نے پناہ دینے سے انکار کر دیا[1] بعد میں وہ کہاں کہاں گئے؟ یہ تفصیل پیش نظر موضوع سے خارج ہے۔

بدایوں بریلی اور شاہ جہان پور سے ملا ہوا بدایوں ہے۔ اس کے گرد و پیش ہنگامے بپا ہو چکے تھے۔ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ بدایوں ان سے غیر متاثر رہتا؟ پھر وہاں زمینداروں کی بہت بڑی آبادی انگریزوں کے جاری کردہ نظام مالگزاری کے باعث تباہ ہو چکی تھی۔ ہیلی سن لکھتا ہے کہ وہ لوگ حکومت برطانیہ کو اپنی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ پھر ان کے ساتھ ہزاروں لاکھوں کسان وابستہ تھے، جن کی ہمدردیاں بہر حال انھیں کے لیے وقف تھیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھ لینا چاہیے کہ انگریزوں نے جو نظام مالگزاری جاری کیا تھا،

---

[1] یہی بدبخت راجا تھا جس نے مولانا احمد اللہ شاہ کو دھوکے سے شہید کیا تھا اور انگریزوں نے اسے پچاس ہزار روپے انعام میں دیے تھے۔

اس سے آخر کس کو فائدہ پہنچا؟ زمیندار تباہ ہوئے۔ کاشتکار جیسے محروم پہلے تھے، ویسے ہی محروم بعد میں رہے اور ان کی ہمدردیاں زمینداروں کے ساتھ رہیں، جن کی زمینیں کاشت کرکے وہ زندگی گزارتے تھے۔ یہ اور اس قسم کی بیسیوں دوسری چیزیں تھیں، جن سے انگریزوں کی اجنبیت اور بیگانگی نہایت رنجدہ شکل میں نمایاں ہوتی تھی اور عوام یہ یقین کر لینے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ جب تک ان اجنبیوں سے کامل نجات حاصل نہ ہو جائے گی، اطمینان کی ساعت نہ آئے گی۔ ایسے ہی معاملات ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی تیزی کا ایک بڑا سبب تھے۔

ہنگامہ

بدایوں کے مجسٹریٹ اور کلکٹر کا نام ولیم ایڈورڈز تھا۔ اسے آبادی کے رنج و غصہ سے پوری آگاہی تھی۔ جب میرٹھ میں ہنگامے کی خبر ملی تو اس نے اپنی بیوی اور بچے کو نینی تال بھیج دیا، خود تنہا بدایوں میں بیٹھا رہا، اگرچہ یقین تھا کہ موقع پاتے ہی عام لوگ اٹھیں گے اور اس وقت پولیس بھی کام نہ دے سکے گی۔ چنانچہ بریلی میں ہنگامہ کی اطلاع ملتے ہی بدایوں میں بھی افراتفری پیدا ہو گئی۔ ایڈورڈز اور اس کے تین ساتھی ایک سکھ اردلی ——— وزیر سنگھ ——— کے ہمراہ بدایوں سے نکلے اور چکر کھاتے ہوئے فتح گڑھ کی طرف گئے۔ ایک ساتھی راستے میں مارا گیا اور باقی منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ فتح گڑھ میں بھی عین اسی وقت ہنگامہ بپا ہونے والا تھا لہٰذا ایڈورڈز بعض دوسرے ساتھیوں کو لے کر دھرم پور چلا گیا، جہاں کا رئیس ہردیو بخش انگریزوں کا حامی تھا۔ کم و بیش تین مہینے وہیں گزارے۔ ستمبر میں وہ کان پور پہنچا جب ہنگامے کا پورا دور گزر چکا تھا اور انگریزی تسلط بحال ہو چکا تھا۔

بجنور

بجنور کے ہنگامے میں ممتاز ترین کارکن نواب محمود خاں تھا جو نواب نجیب الدولہ مرحوم کے خاندان کا ایک معزز رکن تھا۔ بجنور کے کلکٹر شکسپیئر نے خود ضلع کا انتظام نواب موصوف کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر وہاں مختلف مقامات کے ہندو رئیسوں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ انجام کار سب نے نواب محمود خاں کی حکومت

تسلیم کر لی۔

فرخ آباد

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، فرخ آباد، آگرہ ڈویژن میں شامل تھا، لیکن اس کے حالات ہم یہاں بیان کریں گے، ہومز کہتا ہے کہ اگرچہ وہاں مسلمانوں کی آبادی تھوڑی تھی، لیکن صوبہ غرب و شمال کے کسی بھی حصے میں اتنے جوشیلے اور نظم و امن کے اتنے مخالف لوگ موجود نہ تھے، جتنے فرخ آباد میں تھے۔ تاہم وہاں دیر تک امن رہا۔ ۱۶ جون تک یہ حالت تھی کہ سیتا پور (اودھ) کی سرکش فوج نے فرخ آباد کی فوج کے پاس سرکشی کا پیغام بھیجا اور کہا کہ انگریز افسروں کو قتل کر دو تو فوجیوں نے یہ پیغام اپنے کرنیل کے پاس پہنچا دیا، جس کا نام سمتھ تھا۔ لیکن دو روز کے بعد یکایک سرکشی کے لیے تیار ہو گئے اور تمام افسروں سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کسی کا حکم نہیں مانیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ چلے جائیں۔ اس وقت سے فرخ آباد کے نواب تفضل حسین خاں کو انھوں نے اپنا حاکم بنا لیا۔

فتح گڑھ

فرخ آباد سے صرف تین میل مشرق میں دریائے گنگ کے کنارے فتح گڑھ تھا، جو بڑا اہم اور مستحکم مقام تھا اور یہاں ایک قلعہ بھی تھا۔ اسی جگہ فرخ آباد کی چھاؤنی تھی۔ سپاہ کی سرکشی کے بعد کرنیل سمتھ قلعے ہی جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ قریباً ایک سو انگریز تھے، مگر ان میں سے صرف سینتیس آدمی ایسے تھے جو جنگی خدمات انجام دے سکتے تھے۔

سمتھ نے قلعے میں مناسب مقامات پر توپیں نصب کرا دیں، جتنا سامان جنگ مل سکا، فراہم کر لیا اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ ۲۵ جون کو فتح گڑھ پر حملہ ہوا۔ دو مرتبہ سیڑھیاں لگا کر قلعے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی گئی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پاس کے ایک گاؤں حسین پور کے اونچے مکانوں پر سے قلعے کے اندر آتشبازی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں متعدد انگریز مارے گئے۔ ساتھ ہی سرنگیں لگا کر ان میں بارود بھری

گئی اس سے قلعے کی عمارت میں شدید تزلزل تو ضرور پیدا ہوا، تاہم صرف بیرونی دیوار کا ایک حصہ اڑا، اندرونی دیوار بہ دستور سلامت رہی۔

کشتیوں میں روانگی ظاہر ہے کہ مٹھی بھر انگریز مقابلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھ سکتے تھے، للذا بچ نکلنے کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ کشتیاں قلعے کی دیوار سے لگالی جائیں۔ پہلے غیر مصافی لوگوں کو سوار کیا جائے، پھر مصافی سوار ہوں انھوں نے سارا سامانِ جنگ تباہ کیا اور ۳- جولائی کی رات کو دو بجے کشتیوں میں روانہ ہوئے۔ مطلع صاف تھا، اس لیے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ انگریز جارہے ہیں۔ ان پہ گولیاں چلائی گئیں لیکن کسی کو نقصان نہ پہنچا۔

کشتیاں تین تھیں، ان میں سے ایک ناکارہ ثابت ہوئی تو اس کے مسافروں کو باقی دو میں سوار کرا لیا گیا۔ سنگھرام پور پہنچنے کے بعد ایک کشتی مرمت طلب نظر آئی۔ مرمت کی جا رہی تھی کہ گاؤں والوں نے ہلہ بول دیا۔ ان سے لڑائی ہوئی، پھر ایک کشتی ریت میں اٹک گئی اس کی بعض سواریاں تیر کر بچ نکلیں، بعض ڈوب گئیں اور بعض گرفتار ہوگئیں۔ دوسری کشتی کسی نہ کسی طرح محفوظ مقام پہ پہنچ گئی۔

باب ۴

بنارس ڈویژن اور الہ آباد ڈویژن

بنارس بنارس ہندوؤں کا بہت بڑا اور پرانا مذہبی مرکز تھا۔ یہ کلکتہ سے کوئی چار سو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ شہر سے تین میل پر سکرولی میں انگریزی چھاؤنی تھی۔ وہیں عدالت اور کچہریاں تھیں، وہیں گرجا تھا، وہیں گورنمنٹ کالج تھا۔ اسی جگہ متعدد مشنری ادارے اور شفا خانے تھے۔ برگیڈیر پونسن بائی[1] فوج کا کمانڈار تھا، ہنری ٹکر[2] کمشنر فریڈرک گبنس[3] جج اور لنڈ[4] مجسٹریٹ۔ ان کے علاوہ بھی افسروں اور حاکموں کی خاصی تعداد موجود تھی۔

میرٹھ اور دہلی میں ہنگاموں کی اطلاع ملتے ہی بنارس میں تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ بعض انگریزوں کی رائے تھی کہ بچاؤ کی غرض سے بنارس کو چھوڑ کر چنار میں جا بیٹھنا مناسب ہوگا، جہاں مستحکم قلعہ تھا، اور وہ مقام بنارس سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر تھا، لیکن لنڈ نے سب کو بہ منت والتجا راضی کر لیا کہ بنارس کو کسی بھی حالت میں ترک نہ کرنا چاہیئے۔

ضروری انتظامات تشویش ضرور تھی تاہم کوئی عمل ایسا نہ ہوا، جسے وجہ نزاع بنایا جا سکتا، غذائی اجناس میں گرانی پیدا ہوئی جو خاصی پریشان کن تھی، لیکن گبنس نے تاجروں کو سمجھا بجھا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ نفع خوری ہی پر نظر نہ رکھیں، بلکہ عوام کا اطمینان بھی ضروری سمجھیں، ورنہ وہ لوگ اٹھ کر لوٹ مار شروع کر دیں گے۔ اس طرح

---

[1] PONSON BY
[2] HENRY TUCKER
[3] FREDRIC GUBBINS,
[4] LIND,

غذائی اجناس کی قیمتوں میں کم وبیش پندرہ فی صد کی تخفیف کا بندوبست ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ نازک مواقع پر بے اطمینانی کے اسباب میں تھوڑی سی تخفیف بھی عموماً اچھا اثر پیدا کرتی ہے بایں ہمہ تشویش کے وجوہ باقی تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ سرکشی بالقوہ موجود ہے اور اس کے بالفعل آنے کے لیے معمولی سا بہانہ بھی کافی ہو گا۔

اعظم گڑھ

اس اثنا میں بنارس ڈویژن کے ضلع اعظم گڑھ میں حالات بگڑ گئے۔ وہاں بھی تشویش تو موجود تھی، لیکن اچانک اسے ایک زبردست محرک مل گیا۔ گورکھ پور سے پانچ لاکھ سرکاری روپے آئے تھے۔ ان میں دو لاکھ اعظم گڑھ کے خزانے سے شامل ہونے تھے اور یہ پوری رقم بنارس بھیجی جانے والی تھی۔ سپاہیوں نے مطالبہ کیا کہ رقم اعظم گڑھ سے ہٹائی نہ جائے، لیکن یہ رقم بھیج دی گئی۔ ۳۔ جون کو سپاہی سرکشی پر آمادہ ہو گئے۔ انگریز بنگلوں کو چھوڑ کر کچہری میں جا بیٹھے، جسے پہلے سے خوب مستحکم کر لیا گیا تھا اور سپاہیوں نے خزانے کا تعاقب کیا۔ جو انگریز افسر خزانے کے محافظ دستے کے ساتھ تھے وہ بنارس چلے گئے۔ سپاہی سات لاکھ روپے لے کر اعظم گڑھ لوٹ گئے۔ اس اثنا میں اعظم گڑھ کے تمام انگریز بھاگ کر غازی پور پہنچ گئے اور ضلع خالی ہو گیا۔ سپاہیوں نے اعظم گڑھ کو خالی دیکھا تو باقاعدہ سپاہ کی شکل میں فیض آباد کا رُخ کر لیا۔

بے دریغانہ قتل

اعظم گڑھ کے واقعے کا اثر بنارس اور دوسرے مقامات پر بھی پڑا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ حالات کیا صورت اختیار کرتے عین اعظم گڑھ کے ہنگامے کے دن (۳۔ جون) کرنل جیمس نیل[1] ملک لے کر کلکتہ سے بنارس پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی فیصلہ کر لیا کہ بنارس کی دیسی فوج سے ہتھیار رکھوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ ۴۔ جون کو ہتھیار رکھ دینے کے لیے کہا گیا۔ دیسی فوج کے لوگ اس حکم کی تعمیل کر رہے تھے کہ اچانک گورہ

---

[1] JAME NEIL

فوج نمودار ہوئی۔ اُس پر افراتفری پھیلی۔ جن لوگوں نے ہتھیار رکھ دیے تھے، وہ بھی دوڑے، رکھے ہوئے ہتھیار اُٹھا لیے اور گوروں پر آتش باری شروع کر دی۔ توپ خانے کے انگریز افسر نے توپوں کا رُخ ان کی طرف پھیر دیا۔

یہ حالت تھی جب سکھوں کا جیش آیا۔ وہ گوروں کے معاون تھے، لیکن پیچھے سے گولی چلی تو سکھوں نے سمجھا کہ خود ان پر آتش باری شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ وہ توپوں پر حملہ آور ہوئے۔ کچھ مارے گئے اور کچھ بھاگ نکلے۔ نیل نے ان کا تعاقب کیا اور بڑی بے دردی سے انھیں مارا۔ گویا اس نے اپنے معاونوں کا بھی کچھ خیال نہ کیا۔

ذمہ دار انگریزوں کے بیانات

بنارس کے کمشنر ہنری ٹکر نے اس واقعے کی جو رپورٹ گورنر جنرل کے پاس بھیجی، اس میں صاف صاف اعتراف کیا کہ فوج سے ہتھیار رکھوانے کا انتظام بہت ناقص اور خراب تھا۔ ایک اور انگریز منٹگمری مارٹن نے لکھا کہ ہتھیار رکھوانے کا عمل ہی سراسر غلط تھا۔ پونسن بائی نے خود اقرار کیا کہ یہ سب کچھ چونکہ میری نگرانی میں ہوا تھا، لہٰذا ہر الزام مجھ پر عائد ہونا چاہیے۔ ہومز کہتا ہے کہ جو لوگ حالات کے شاہد اور رائے دینے کے اہل تھے، انھیں یقین تھا کہ اگر ۴۔ جون کو ہتھیار نہ رکھوا لیے جاتے تو اسی رات دیسی فوج سرکشی اختیار کر لیتی، البتہ اس بات کا افسوس ہے کہ اس سلسلے میں وفادار سپاہیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔[۱]

ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ سکھ اور بے قاعدہ دستے دونوں وفادار تھے۔ چھ کمپنیاں یکے بعد دیگرے ہتھیار رکھ چکی تھیں۔ اس اثنا میں گورا فوج کارتوس اور گرداب لیے ہوئے آئی۔ اس پر سراسیمگی پھیلی۔ سپاہیوں نے کہا کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ پھر انھیں کیوں بلایا گیا ہے۔ اور کس گناہ میں سزا دی جا رہی ہے؟ پونسن بائی کو لُو لگ گئی تھی۔ نیل نے کمان سنبھالی اور

---

[۱] ہومز ص ۲۱۱ حاشیہ ۲۰

وفاداروں کو بے دردی سے قتل کرادیا۔(۱۵۳)

درحقیقت یہ سب کچھ نیل کی جابریت، بے دردی، سنگ دلی اور اہلِ ملک کی جانوں سے سراسر بے پروائی کا کرشمہ تھا۔ یہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اس شخص کا پہلا سیاہ کارنامہ تھا۔ بعدازاں اس نے جو کچھ کیا وہ آگے چل کر بیان ہوگا۔ تاہم اسے انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے ممتاز بہادروں میں شامل کیا۔ انجام کار وہ خود بھی مارا گیا، جس طرح کہ اس جیسے دوسرے "بہادر" مارے گئے مثلاً نکلسن، ہوڈسن وغیرہ۔

بنارس شہر میں نظر بہ ظاہر امن قائم ہو گیا لیکن جو سپاہی بھاگے تھے وہ دیہات میں پہنچ گئے اور ضلع کے اکثر مقامات پر افراتفری پھیل گئی۔ نیل اور اس کے ساتھیوں نے قیام "امن" کے لیے جو تدبیریں اختیار کیں، ان کا ذکر فی الحال ملتوی کیا جاتا ہے۔

جون پور

سکھ رجمنٹ کے ساتھ بنارس میں جو سلوک ہوا تھا، وہ سرسری طور پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی رجمنٹ کا ایک حصہ جون پور میں مقیم تھا۔ جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ گوروں نے ان کے بھائیوں اور رفیقوں پر گولیاں چلائیں تو وہ ایک دم مشتعل ہو کر اُٹھے، اپنے کمان افسر اور جائنٹ مجسٹریٹ کو قتل کیا، خزانہ لوٹا، جیل خانہ توڑا، اور جون پور سے انگریزی حکومت کا نشان اسی طرح مٹا دیا، جس طرح اعظم گڑھ میں مٹ چکا تھا۔ جو انگریز افسر زندہ رہ گئے تھے، انھوں نے نہایت ذلت خیز شکل میں ہتھیار حوالے کیے اور محفوظ مقامات کی تلاش میں بھاگ نکلے۔ انگریزوں کے بنگلے جلائے گئے ان کا سامان لوٹ لیا گیا۔

گورکھ پور

اب گورکھ پور کا حال بھی اختصاراً سُن لیجیے۔ وہاں ولیم ونیاڈ جج اور پیٹرسن کلکٹر تھا۔ پیٹرسن رخصت پر روانہ ہونے والا تھا کہ میرٹھ میں ہنگامے کی خبر

---

۱۵۳ WILLIAM WINRAD ؎ PATERSON ؎

گورکھ پور پہنچی۔ ڈینارڈ نے کہہ سن کر اُسے روک لیا کہ ذرا صورت حالات کو دیکھتے جاؤ۔

گورکھ پور میں اس وقت دیسی فوج کی دو کمپنیاں مقیم تھیں ایک کا صدر مقام اعظم گڑھ تھا اور دوسری کا سگولی۔ ڈینارڈ خزانے سے پانچ لاکھ روپے اعظم گڑھ بھیج چکا تھا، للذا مالی خطرہ کوئی نہ تھا اور وہ سپاہیوں کو سمجھانے بجھانے میں لگا رہا۔ ۷۔ جون کو جیل خانہ کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد بھی سرکشی کا قدم اٹھایا گیا لیکن دونوں مرتبہ صورت حال پر قابو پا لیا گیا۔ اس اثنا میں نیپال کے انگریز ریزیڈنٹ نے خبر بھیج دی کہ گورکھوں کا ایک جیش امداد کی غرض سے بھیجا جا رہا ہے اور ڈینارڈ کی تمام امیدیں اسی فوج کے پہنچنے سے وابستہ ہو گئیں۔

ضلع بھر میں بے چینی

بلاشبہ گورکھ پور کے حالات مختلف وجوہ سے بڑے تشویشناک تھے۔ مثلاً یہ ضلع عام شاہراہ سے ہٹا ہوا تھا اور وہاں کمک جلد پہنچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ جنوب میں اعظم گڑھ اور جون پور سرکشی اختیار کر چکے تھے۔ ادھر بہار میں خوفناک صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی اور وہاں سے بے شمار لوگ ضلع میں داخل ہو رہے تھے۔ پریشانی کی اس حالت میں ۲۸۔ جون کو دو سو گورکھے نیپال سے گورکھ پور پہنچے۔ ڈینارڈ نے انھیں کی امداد سے قیام امن کی کوششیں شروع کر دیں۔ ۲۵۔ جولائی کو گورکھوں کے ایک اور جیش کی آمد کا حال معلوم ہو گیا۔ لیکن ۲۸ کو سگولی کی فوج نے سرکشی اختیار کر لی اور اپنے کمانڈر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ضلع کا تخلیہ

گورکھے گورکھ پور پہنچے تو انھوں نے کہا کہ ضلع کو خالی کر دینا چاہیے اس لیے کہ انھیں الٰہ آباد پہنچنے کا حکم تھا اور ان کے پاس اتنے آدمی نہ تھے کہ ایک دستے کو پیچھے گورکھ پور کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیتے چنانچہ مشورے کے بعد ایک انگریز کو گورکھ پور میں چھوڑ دیا گیا اور باقی سب لوگ گورکھوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اس سے پیشتر گورکھ پور میں جو دیسی فوج تھی، اس

سے ہتھیار رکھوا لیے گئے تھے[1]

غازی پور

غازی پور میں مئی کا مہینہ بظاہر اطمینان سے گزر گیا۔ اعظم گڑھ کی سرکشی کے بعد سیکڑوں آدمی غازی پور پہنچ گئے اور پورے ضلع میں آگ لگ گئی، یہاں تک کہ حکومت کا نظام بالکل معطل ہو گیا۔ غازی پور کے لیے پھر ایک مرتبہ شدید تشویش کا دور پیدا ہوا۔ بہار کے ممتاز مجاہدین آزادی میں سے ایک راجا کنور سنگھ جگدیش پوری بھی تھا۔ وہ پہلے بہار میں انگریزوں سے لڑتا رہا، پھر اس نے اودھ کا رُخ کر لیا اور کچھ دیر اعظم گڑھ پر بھی قابض رہا۔ جب اسے دوبارہ بہار کی طرف ہٹنا پڑا تو جاتے ہوئے اس نے ضلع غازی پور میں بڑی افراتفری پھیلائی تھی۔

الٰہ آباد

الٰہ آباد بنارس سے ستر میل دُور گنگا اور جمنا کے سنگم پر واقع تھا۔ یہاں ایک مضبوط قلعہ تھا، جس میں کثرت سے سامان جنگ بھرا ہُوا تھا۔ میرٹھ اور دہلی کی خبریں ملتے ہی حالات خاصے تشویشناک ہو گئے۔ زیادہ اندیشہ اس امر کا تھا کہ روزانہ زیادہ سے زیادہ اضطراب انگیز افواہیں پھیلتی تھیں۔ مثلاً ایک موقع پر یہ افواہ اڑی کہ انگریز فیصلہ کر چکے ہیں، قلعے میں مناسب مقامات پر توپیں نصب کر لیں۔ پھر سپاہیوں کو پریڈ کا حکم دے کر چربی والے کارتوس ان کے حوالے کریں۔ اگر سپاہی انکار کی طرف مائل ہوں تو

---

[1] گورکھ پور میں سرکشی کے حالات سید احمد شاہ نے "کشف البغاوت" کے نام سے منظوم لکھے تھے۔ یہ کتاب ۱۸۵۹ء میں تیار ہوئی اور ۱۸۶۱ء میں چھپی۔ نظم نہایت معمولی ہے حالات ہیں اس کے سوا اور کوئی خاص بات نہیں کہ سرکشی میں حصہ لینے والوں کے نام درج کر دیے ہیں مثلاً محمد حسین زمیندار، جاگو پال پور یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ دینارڈ نے ضلع خالی کرتے وقت جس شخص کو پیچھے چھوڑا تھا اس کا نام برڈ (BIRD) تھا جب برڈ بھاگا تو محمد حسین ہی نے جو اپنے آپ کو ناظم اودھ کہتا تھا، اس کی گرفتاری کے لیے پانچ ہزار روپے انعام مقرر کیا تھا، لیکن برڈ دشوار گزار جنگلوں میں سے گزرتا ہُوا بہار کے ضلع چمپارن میں پہنچ گیا۔

انھیں توپوں سے اڑا دیں۔ اس طرح اہل فوج اور عوام کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اجناس کی گرانی نے اس میں اضافہ کر دیا۔

احتیاطی تدبیریں

اس اثنا میں انگریز افسر باہم مشورہ کرنے لگے کہ کیا کرنا چاہیے۔ ۲۲۔ مئی کو فیصلہ ہوا کہ عورتوں اور بچوں کو قلعے میں بھیج دینا چاہیے، لیکن کسی مرد کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی۔ پھر یہ پابندی اٹھا دی گئی اور انگریز افراتفری کی حالت میں قلعے کے اندر پہنچے۔ اس سراسیمگی سے صاف ثابت ہو رہا تھا کہ نہ انھیں اپنے اوپر اعتماد ہے، نہ باہر سے کمک کی کوئی امید ہے اور نہ وہ عوام پر اعتماد کے لیے تیار ہیں ظاہر ہے کہ اس سے آزادی کی تحریک کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچنا یقینی تھا اور تقویت پہنچی۔ اس اثنا میں انگریزوں کو اطلاع ملی کہ عید کے دن (۲۵۔ مئی) اعلان آزادی ہوگا۔ پھر دو میواتی پکڑے گئے جو فوج کو اکسا رہے تھے۔

۶۔ جون

۴۔ جون کو بنارس کی خبریں ملیں تو الٰہ آباد کے سپاہیوں نے آخری فیصلہ کر لیا ۶۔ جون کی شام کو انگریز افسر کھانے کے لیے تیار ہو چکے تھے کہ ہنگامۂ عام شروع ہو گیا۔ بعض انگریز بچ نکلے اور قلعے میں پہنچ گئے، بعض مارے گئے شہر میں بھی ہنگامہ بپا ہو گیا۔ مولانا لیاقت علی کو بالاتفاق امیر بنا لیا گیا۔ انھوں نے نظم و نسق کی درستی کا کام سنبھال لیا۔ خسرو باغ کو اپنا صدر مقام بنایا۔ مسلمانوں سے اپیل کی کہ جہاد کے لیے تیار ہو جائیں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکٹھا رکھنے اور منظم طریق پر قلعے کو فتح کر لینے کے لیے کوشش شروع کر دیں۔ مولانا کی قیادت میں قلعے پر بار بار یورشیں کی گئیں۔ لیکن مؤثر ثابت نہ ہوئیں۔ یہاں تک کہ ۱۱۔ جون کو نیل بنارس سے الٰہ آباد پہنچ گیا۔

فتح پور

فتح پور میں بنارس کے کمشنر ہنری ٹکر کا بڑا بھائی رابرٹ ٹکر جج تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ مذہبی طبیعت کا آدمی تھا۔ ہر ایک کو مسیحیت کی تلقین کرتا۔ فتح پور کے دروازے پر اس نے چار سنگین ستون نصب کرائے تھے۔ دو ستونوں پر دس موسوی

احکام فارسی اور ہندی میں کندہ کرا دیے تھے نعوذ دو مجا انجیل کی کچھ عبارتیں کھدوا دی تھیں۔

۸ جون کو فتح پور میں ہنگامے کا آغاز ہوا۔ اس کے ذمہ دار دو گروہ تھے، ایک الہ آباد سے پہنچا تھا اور دوسرا کان پور سے۔ خزانہ لوٹا گیا، جیل خانہ توڑا گیا، ریکارڈ جلا دیے گئے۔ وہاں مشنریوں کی عمارتیں بھی تھیں، ان کو بھی آگ لگا دی گئی[1] سب انگریز اِدھر اُدھر بھاگ گئے مگر ٹکر نے جگہ نہ چھوڑی، اور مارا گیا۔ یقیناً اس ضلع کا ہنگامہ مذہبی جوش ہی کا نتیجہ تھا۔ اہل وطن سمجھتے تھے کہ انگریز سب کو مختلف حیلوں بہانوں سے عیسائی بنا لینا چاہتے ہیں اور رابرٹ ٹکر عیسائیت کی تبلیغ میں سب سے آگے تھا۔ فتح پور میں تحریک کی قیادت دیوان حکمت اللہ ڈپٹی مجسٹریٹ نے سنبھال لی جو بڑے ہی نیک اور دیندار بزرگ تھے[2]

باندہ اور کالنجر باندہ میں ۸۔ جون کو اور ہمیر پور میں ۱۴ جون کو سرکشی کا علم بلند ہوا

---

[1] سین کی کتاب سے صاف واضح ہوتا ہے کہ فتح پور کے حالات اچھے تھے۔ جب بنارس سے خبریں آئیں کہ انگریزوں نے سکھوں اور پوربیوں کو پریڈ کے میدان میں موت کے گھاٹ اتار دیا، حالانکہ وہ چپ چاپ کھڑے تھے تو لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا اور تیسرے روز حالات بگڑ گئے (۱۵۷) ظاہر ہے ان پر یہی اثر پڑا ہوگا کہ انگریز سب کو اندھا دھند قتل کر رہے ہیں۔

[2] میلی سن نے خدا جانے کس بنا پر لکھا کہ ڈپٹی حکمت اللہ خاں خود قرآن مجید پڑھ رہا تھا اور اس کے حکم سے ٹکر قتل ہوا۔ یہ سراسر لغو ولایعنی ہے۔ ڈپٹی صاحب کو یقیناً انگریزوں سے سخت شکایت تھی۔ مثلاً تین سو پٹواریوں کو ہندی اور ناگری سیکھنے کے لیے فتح پور کے مشنری سکول میں داخل کیا گیا تھا، جہاں مسیحیت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ حکمت اللہ نے اس سے اختلاف کیا، مگر اس اختلاف کو قطعاً قابل توجہ نہ سمجھا گیا۔ اس طرح ثابت کر دیا کہ انگریز سرکاری کارکنوں میں بھی عیسائیت کی تبلیغ پر تُلے بیٹھے تھے۔

بلند ہوا۔ باندہ میں نواب علی بہادر نے انگریزوں کو کوئی ضرر نہ پہنچنے دیا۔ البتہ ہمیر پور میں کچھ انگریز افسر مارے گئے۔ جو بھاگ کر باندہ پہنچے نواب علی بہادر نے ان کی حفاظت اور مہانداری بھی بڑی فراخ حوصلگی سے کی۔ جب حالات بے حد نازک ہو گئے اور نواب ان کے بچاؤ کی طرف سے بے بس ہو گیا تو اس نے اپنے خاص آدمیوں کی حفاظت میں تمام انگریزوں کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔

باب ۵

کان پور

کان پور کی اہمیت کان پور الہ آباد ڈویژن کا ایک ضلع ہے اور اس کے حالات گزشتہ باب ہی میں بیان کرنے مناسب تھے، لیکن ۱۸۵۷ء میں اس شہر کے واقعات کو بوجوہ خاص اہمیت حاصل ہو گئی، للٰہذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ یہ حالات جداگانہ باب میں عرض کیے جائیں یہ کوئی پرانا اور مشہور تاریخی شہر نہ تھا، صرف چمڑے کے کاروبار کا مرکز ہونے کے باعث اس کی حیثیت بڑھ گئی تھی اور انگریزوں نے اپنی خاص مصلحتوں کی بنا پر یہاں ایک بھاری چھاؤنی بنالی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں جو ڈویژن اس چھاؤنی میں متعین تھا، اس کا سالار سر ہیو وھیلر[1] تھا، جو عمر کی زیادہ منزلیں طے کر کے اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں انسان ذمہ داری کے کام کاج سنبھالنے کے لائق عموماً نہیں رہتا۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ وھیلر کے بچوں کی رگوں میں جو خون بہ رہا تھا، وہ خالص یورپی نسل کا نہ تھا[2]

ابتدائی دور میرٹھ سے سپاہ کی سرکشی کی اطلاع ملی تو وھیلر کو یقین ہو چکا تھا کہ کان پور کی فوج کو سنبھالے رکھنا سہل نہ ہوگا۔ کچھ مدت تک امید لگی رہی کہ آہستہ آہستہ حالات طبعی رفتار پر آجائیں گے۔ لیکن میرٹھ کے بعد دہلی میں ہنگامہ شروع ہو گیا اور جگہ جگہ سے شعلے اٹھنے لگے لٰہذا وھیلر کو خیال آیا کہ نازک وقت آجانے سے پیشتر حفظ و دفاع کا کوئی پختہ بندوبست کر لینا چاہیے۔ محض فوجی انگریزوں ہی کے بچانے کا بار اس کے

---

[1] HUGH WHEELER

[2] میلی سن جلد دوم ص ۲۱۹ حاشیہ۔

ذمے نہ تھا۔ کان پور میں بہت سے امریہ ماجر، سیاح اور مشنری بھی موجود تھے۔ چونکہ وہاں مکان اچھے مل جاتے تھے، اس لیے عام فرنگی اور یوریشین بھی خاصی تعداد میں آباد ہو گئے تھے۔

استحکامات

اب پہلا سوال یہ تھا کہ پیش نظر مقصد کے لیے کون سا مقام مناسب ہو گا۔ بتایا گیا ہے کہ سب سے بہتر مقام میگزین تھا، جس میں تحفظ کی عام خوبیوں کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ برلبِ دریا واقع تھا۔ وھیلر نے اسے چھوڑ کر بارکوں میں ایک ایسی جگہ تجویز کی جو کنارۂ دریا سے ہٹی ہوئی تھی اور سپاہیوں کی بارکوں سے نزدیک تھی۔ گویا وہ ہر لحاظ سے غیر موزوں تھی۔ وہاں دمدمے بنا لیے گئے۔ استحکامات کر لیے گئے، توپیں لگائی گئیں۔ رسد بھی جمع ہو گئی۔ یہی وہ مقام ہے جس میں استحکامات کی سرگرمیاں دیکھ کر عظیم اللہ خاں نے اپنے ایک انگریز دوست سے پوچھا تھا کہ اس مقام کا نام کیا رکھو گے؟ جب انگریز نے کہا کہ یہ "حصارِ امید" ہے تو بالغ نظر عظیم اللہ خاں نے بے تکلف فرمایا کہ یہ "حصارِ یاس" معلوم ہوتا ہے۔

طلبِ امداد

وھیلر نے اودھ کے چیف کمشنر ہنری لارنس کو امداد کے لیے لکھا۔ اگرچہ لکھنؤ کے حالات بھی تشویشناک تھے تاہم لارنس نے ایک دستہ بھیجنے میں تامل نہ کیا۔ اس دستے کے ساتھ اپنے فوجی سیکرٹری فلیچر ہیز[1] کو بھی بھیج دیا تاکہ کان پور کے تمام حالات کا معائنہ کر کے صحیح رپورٹ پیش کرے۔ یہ دستہ ۲۱۔ مئی کو کان پور پہنچا۔

ساتھ ہی ڈھونڈو پنت نانا سے بھی امداد مانگی جو کان پور کے نزدیک ہی بٹھور میں رہتا تھا۔ نانا نے بھی فوراً دو سو آدمی دو توپیں دے کر بھیج دیے، جنھیں نواب گنج میں متعین کیا گیا، اس لیے کہ وہاں سے وہ خزانے اور میگزین دونوں کی حفاظت کر سکتے تھے۔ یہ ۲۲۔ مئی کا واقعہ ہے۔

---

[1] HETCHER HAYES

سپاہ کی حالت

سپاہ کی حالت قطعاً اطمینان بخش نہ تھی۔ جوش سا پھیلا ہوا تھا۔ مسلمان زیادہ تیز تھے۔ مسجدوں میں بڑے بڑے اجتماعات ہوتے تھے اور مسلمان سپاہی ان اجتماعات میں بھی شرکت کرتے تھے۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہاں کیا مشورے ہوتے تھے یا کیا تقریریں کی جاتی تھیں لیکن بے چینی نظر بہ ظاہر بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر سپاہی آپس میں بھی ساز باز کرتے رہتے تھے۔ پہلے افواہ پھیلی کہ عید الفطر کے دن (۲۵۔ مئی) یورش ہوگی۔ لیکن یہ دن امن چین سے گزر گیا۔ ساتھ ساتھ وھیلر استحکامات کرتا جا رہا تھا اور توپوں پر انگریز توپچی متعین ہو رہے تھے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ باہم بے اعتمادی بڑھے۔ بہ الفاظ دیگر وھیلر اس بات پر تلا بیٹھا تھا کہ سپاہیوں کی خاموشی اور سکون سے فائدہ اٹھا کر حفاظت کی تمام تدبیریں مکمل کرے۔ پھر جس طرح چاہے سپاہیوں سے سلوک کرے۔ سپاہی یہ سمجھ رہے تھے کہ اگر ہمیں کچھ کرنا ہے تو جلد کرنا چاہیے، ورنہ انگریز خدا جانے ہمارے لیے کیسی سخت سزا کا انتظام کریں۔

لکھنؤ کی امداد واپس

یکم جون کو وھیلر کے دل میں خدا جانے کیا بات آئی کہ فیصلہ کر لیا، لکھنؤ کی امداد واپس کر دینی چاہیے، کیوں کہ خود ہنری لارنس کو اس کی ضرورت ہوگی۔ جس طرح اس دستے کے آنے سے کان پور کی دیسی فوجیوں میں رنج و افسوس کی لہر دوڑی تھی، اسی طرح اس کی واپسی پر وہ خوشی اور مسرت کے جذبات سے معمور ہو گئے تھے۔

انگریزوں کا بیان ہے کہ اب فوجیوں کے نمایندوں اور نانا صاحب کے درمیان بات چیت شروع ہو گئی اور اس سلسلے میں سب سے بڑھ کر ٹیکا سنگھ نے حصہ لیا، جسے دیسی رسالے میں صوبیداری کا منصب حاصل تھا۔ یہی زمانہ ہے جس میں نانا نے فوجیوں کو یقین دلایا کہ میرے تمام وسائل امداد کے لیے وقف رہیں گے۔ ایک روایت مظہر ہے، ٹیکا سنگھ نے نانا سے کہا کہ ہم سب ہندو اور مسلمان اپنا دھرم بچانے کے لیے متحد ہو چکے ہیں اور بنگال کی

پوری فوج ہم آہنگ ہے۔ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ ناناؔ نے جواب دیا کہ میں بھی فوج کے ساتھ ہوں۔[1] اگر یہ بیان حقائق پر مبنی ہے اور افسانہ نہیں تو ہمارے لیے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ ناناؔ آزادی کا علم بلند کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے سپاہیوں سے امداد لینا یا انھیں ہمنوا بنانا عین قرین مصلحت تھا، لیکن "نانا ٹوپے" کا بیان ہے کہ سرکشی سے پیشتر سپاہیوں سے نانا کا کوئی تعلق نہ تھا۔

ایک عبرت ناک واقعہ ۲۔ جون کی رات کو ایک عبرت ناک واقعہ پیش آیا۔ رسالے کا ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ کاکسؔ[2] نام ایک انگریز کلرک نے اس پر گولی چلا دی۔ دوسرے روز کاکسؔ کے خلاف مقدمہ پیش ہوا۔ لیکن اس بناء پر رہا کر دیا گیا کہ وہ شراب کے نشے میں مدہوش تھا اور اسے نیک و بد کی تمیز نہ تھی۔ دیکھی آپ نے ۱۸۵۷ء کی انگریزی ذہنیت؟ گولی چلانے والا انگریز تھا لہٰذا اُسے بری کر دیا گیا حالانکہ فوجی پہرہ دار پر گولی چلانا بہت بڑا جرم تھا۔ انگریزوں کو پورا علم تھا کہ سپاہیوں میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور ایسے نازک موقع پر کوئی ایسی حرکت نہ ہونی چاہیئے جو ان کے غم و غصہ میں اضافہ کر دے تاہم انھوں نے قطعاً کسی بات کی پروا نہ کی۔ جب کاکسؔ رہا ہوا تو سپاہیوں نے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا کہ ہو سکتا ہے کل ہماری بندوقیں بھی اسی طرح اتفاقیہ سر ہونے لگیں۔[3]

ایک بیان مظہر ہے کہ انھیں دنوں نہایت خراب آٹا بازار میں بکنے لگا، روٹی پکا لینے کے بعد بھی اس میں سے بو آتی تھی۔ لیکن بھاؤ سستا تھا۔ افواہ پھیل گئی کہ اس میں گائے اور سؤر کی ہڈیاں پیس کر شامل کر دی گئی ہیں۔[4]

---

[1] میل سن جلد دوم ص ۲۲۲ حاشیہ۔ [2] COX۔ [3] میل سن جلد دوم ص ۲۳۲ حاشیہ۔
[4] بین کی کتاب ص ۱۳۱۔

۴ جون

بہر حال ۴- جون کو سپاہی اُٹھے اور مجھے یقین ہے کہ کاکس کے واقعے نے ان میں سخت اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ انھوں نے خزانہ لُوٹا، جیل خانہ توڑا، قیدی چھڑائے اور میگزین میں جو سامان تھا اس پر قبضہ کر لیا۔ وہ پہلے دہلی کی جانب روانہ ہوئے۔ نانا اور اس کے رفیقوں کو بھی ساتھ لے لیا۔ چند میل پر کلیان پور تھا۔ نانا نے وہاں انھیں روک لیا اور مشورہ دیا کہ دہلی کے بجائے کان پور واپس چلنا چاہیے۔ چنانچہ وہ واپس ہو گئے۔ اس اثنا میں وھیلر ایک لاکھ روپے کی رقم اور انگریزوں کو لے کر اس جگہ جا بیٹھا تھا جہاں اس نے استحکامات کر رکھے تھے۔ بلکہ یکم جون ہی سے اس نے اپنا خیمہ وہاں نصب کرا لیا تھا، حالانکہ اس وقت تک سرکشی کی کوئی بات سرزد نہیں ہوئی تھی۔

نانا کے متعلق مختلف روایتیں اس کے سوانح حیات میں آچکی ہیں۔ مثلاً یہ کہ انگریزوں نے اسے حفاظت کے لیے بلایا اور وہ کان پور پہنچا تو سپاہ سے ساز باز کا موقع پیدا ہوا یا یہ کہ وہ پہلے سے تنظیم کا سروسامان کر چکا تھا۔ تفصیلات ہم نے یہاں درج نہیں کیں۔

محاصرہ

سپاہ نے واپس ہوتے ہی وھیلر اور اس کے ساتھیوں کا محاصرہ کر لیا جو ۶ جون سے ۲۷ جون تک جاری رہا۔ دونوں طرف سے توپوں کی لڑائی ہوتی رہی جس میں فریقین کو خاصا نقصان پہنچا۔ انگریزوں کی جانب سے جس شخص نے محاصرے میں بہادری، کارروائی اور قربانی کے بہترین مناظر پیش کیے وہ کپتان مور[1] تھا۔

یقیناً محصورین کو سخت تکلیفیں پیش آئیں، یہاں تک کہ بالآخر رسد ختم ہو گئی، گولہ بارود بھی کم ہو گیا اور حالات ایسے تھے کہ کہیں سے بروقت کمک پہنچنے کی اُمید نہ تھی۔

حوالگی

حوالگی کے متعلق روایات مختلف ہیں۔

---

[1] MOOR

۱۔ انگریزوں کا بیان ہے کہ ۲۵۔ جون کو ایک فرنگی بڑھیا جس کا
نام مسز جیکوبی[1] تھا، ایک تحریر لائی جس پر کسی کے دستخط نہیں تھے البتہ
طرز تحریر عظیم اللہ خاں کا تھا۔ مضمون یہ تھا کہ فرنگی ہتھیار ڈال دیں گے
تو انھیں کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا، بلکہ بہ خیر و عافیت الہ آباد بھیج
دیا جائے گا۔ البتہ ان لوگوں کو معافی نہیں ملے گی جو لارڈ ڈلہوزی کے
اعمال سے تعلق رکھتے ہوں۔

۲۔ تانتیا ٹوپے نے بتایا کہ وھیلر نے بے بس ہو کر صلح کا
جھنڈا بلند کیا تھا لہٰذا اس کے پاس مسز جیکوبی کو بھیجا گیا اور اس نے
حوالگی پر آمادگی ظاہر کی، بلکہ ایک لاکھ روپے بھی نانا کے حوالے کیے
کہ انھیں اپنے پاس رکھیے۔

تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے تانتیا ہی کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ غرض اس کے بعد نانا کی طرف سے جوالا پرشاد اور عظیم اللہ خاں وھیلر کی جائے قیام پر بات چیت کے لیے گئے اور تمام شرطیں خوش اسلوبی سے طے ہوگئیں۔

واقعۂ قتل

۲۶۔ جون کو شرطیں طے ہوئیں، ۲۷ کو کشتیاں تیار کر دی گئیں بلکہ رسد کا انتظام بھی ہو گیا۔ صبح کے وقت تمام انگریزوں کو نکال کر ستی چوڑا گھاٹ پر پہنچایا گیا جہاں کشتیاں ٹھہرائی گئی تھیں۔ عورتوں، بچوں، زخمیوں اور کمزوروں کے لیے سواری کا انتظام کر دیا تھا۔ تمام لوگ کشتیوں میں سوار ہو گئے تو چلنے کا اشارہ کیا گیا۔ عین اس وقت کشتیوں پر آتش باری شروع ہو گئی۔ نانا، تانتیا ٹوپے، عظیم اللہ خاں، بالا صاحب، راؤ صاحب اور جوالا پرشاد موقع پر موجود تھے۔ کوئی کہتا ہے تانتیا نے قتل کا حکم دیا تھا، کوئی کہتا ہے تانتیا نے

---

[1] JACOBIE

نانا کے حکم کی تعمیل کی ، کسی کا بیان ہے کہ حکم دینے کا ذمہ دار راؤ صاحب تھا ۔ یا بالا صاحب تھا ۔

حقیقتِ حال حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا آدمیوں میں سے کسی ، نے بھی نہ قتل کا حکم دیا اور نہ ان کے ذہن میں ایسی کوئی بات موجود تھی ۔ سپاہی کرنیل نیل کے بے پناہ اور حد درجہ خوفناک ظلم و جور کی کہانیاں سُن چکے تھے ، جو اس نے بنارس ، الہ آباد ، فتح پور یا سیکڑوں دیہات میں بپا کیے تھے ۔ بعض اس ظلم و جور کے عینی شاہد تھے ، انھوں نے انتقام کے جوش میں ایک حد درجہ افسوسناک فعل کا ارتکاب کیا ۔ نانا ، تانتیا ، عظیم اللہ خاں یا دوسروں میں سے کسی کو ہمت نہ پڑی کہ سپاہیوں کو روکتے یا خود بھی وہیں ختم ہو جاتے ۔ ذمہ داری ان کی تھی نہ کہ سپاہیوں کی اور محولہ بالا خوں ریزی کا ذمہ دار کرنیل نیل تھا یا اس کے ساتھی وھیلر اور اس کے ہمراہیوں کو ان واقعات سے کیا تعلق تھا ؟ قرآن مجید کا واضح اصول ہے کہ ایک کی ذمہ داری کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالا جا سکتا ۔ ایک کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لینا نہ شرعاً درست ہے نہ اخلاقاً" اور جو کچھ ستی چوڑا گھاٹ پر ہُوا ، اس پر یقیناً ہر شخص کو افسوس ہونا چاہیے ۔

انجام بہرحال انگریزوں میں سے کچھ مارے گئے ، کچھ ڈوب گئے ، کچھ اسیر ہوئے ، جن کی تعداد اسّی بتائی جاتی ہے ۔ ایک کشتی بچ نکلی تھی ۔ اس کے سواروں کو بڑی تکلیفیں پیش آئیں اور ان میں سے صرف چار سلامت بچے ۔ کپتان مور بھی اسی کشتی میں سوار تھا اور راستے میں مارا گیا ۔

نانا کی حکومت نانا کی حکومت کا اعلان تو پہلے بھی ہو چکا تھا لیکن انگریز ختم ہو گئے تو باقاعدہ دوبارہ اعلان ہُوا ۔ منادی یوں کی جاتی تھی "خلق خدا کی ، ملک بادشاہ کا اور حکم نانا صاحب کا اور فوج کا ۔" نانا نے اس بارے میں بادشاہ دہلی کے پاس عرضداشت بھی بھیجی تھی ، لیکن یہ حکومت ابھی جمنے نہ پائی تھی کہ انگریزوں کا جوابی حملہ ہو گیا ۔ نانا نے شکست کھائی اور وہ کان پور چھوڑ کر پہلے اودھ ، پھر نیپال چلا گیا ۔

متفرق روایات بعض متفرق روایات ہم نے اس لیے بیچ میں درج نہ کیں کہ اصل

کہانی کے تسلسل میں خلل پیدا نہ ہو، اب ان کی کیفیت ملاحظہ فرمایئے

۱ـــ ٹیکا سنگھ کے علاوہ جن آدمیوں نے فوج کو اشتعال دلایا تھا، ان میں سے ایک رحیم خاں ساکن بشن پور اور دوسرا مدد علی ساکن باندہ تھا۔

۱ـــ تحریک آزادی کے ممتاز لیڈر (نانا اور اس کے رفیقوں کے علاوہ) یہ تھے:

صوبیدار ٹیکا سنگھ، حوالدار میجر گوپال سنگھ، شمس الدین خاں، شیخ بلاقی، سردار بیگ، اٹے سنگھ عوض علی، غوث محمد، ہنومان، الٰہی بخش، جمعدار نجو خاں، تیمار خاں، قاضی اسمٰعیل (مختار عظیم اللہ خاں) احمد علی خاں وکیل جج، قاضی وصی الدین، زین العابدین (بخشی نانا) مولوی عبدالرحمٰن، بلاس سنگھ، ریاض علی، مولوی سلامت علی، آغا میر شاہ علی، باقر علی۔

۳ـــ ۲۴ جون کو فیصلہ ہوا تھا کہ یاسین خاں (منشی رسالہ ۲) کو بادشاہ دہلی کے پاس بھیجا جائے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بھیجا گیا یا نہیں۔

۴ـــ ۸۔ جولائی کو جہاد کا علم بلند کیا گیا۔ یہ خدمت سب سے پہلے عظیم اللہ خاں نے انجام دی اور اعلان کیا کہ نانا کے احکام کی نافرمانبرداری کرنے والے کو موت کی سزا دی جائے گی۔

باب ۶

خون اور آگ

(۱)

عنوان کی توضیح

انگریزوں نے مجاہدین آزادی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ عام اہلِ وطن کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، اس کے لیے مندرجہ بالا عنوان دیکھ کر یہ نہ سمجھیں کہ میں نے جوش یا شدتِ غم کی حالت میں حد سے تجاوز کیا۔ آپ آیندہ سطور ملاحظہ فرمائیں گے تو یقین ہو جائے گا کہ میرا تجویز کردہ عنوان بالکل درست ہے اور جو کچھ میں پیش کروں گا، وہ زیادہ تر انگریزوں کے بیانات پر مبنی ہوگا شاید چند واقعات ایسے ہوں جو انگریزی روایتوں میں نہیں ملتے۔ وہ بھی انھیں لوگوں کی تحریرات سے ماخوذ ہیں جو نہ ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی سمجھتے تھے اور نہ مجاہدین آزادی کے متعلق کوئی اچھی رائے رکھتے تھے یعنی انھیں انگریزوں کے مداح نہیں تو فی الجملہ ان کے حامی ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

مارشل لا

نیل ۳۔جون کو بنارس پہنچا تھا اور اس نے آتے ہی فوج سے ہتھیار رکھوانے کے سلسلے میں جو کچھ کیا، وہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ہمیں تفصیل سے معلوم نہیں کہ اس نے نیز اس کے ماتحت فوجیوں نے گرد و پیش کیا قیامت برپا کی۔ میلی سن لکھتا ہے کہ ۹۔جون کو بنارس اور الٰہ آباد کے ڈویژنوں میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ اسی دن ہنری ٹکر نے فوجی افسروں کی جابرانہ اور ظالمانہ کارروائیوں سے متاثر ہو کر گورنر جنرل کو لکھا کہ موت و حیات کے اختیارات سول افسروں اور مجسٹریٹوں ہی کے پاس رہنے چاہئیں۔ میں اس انتظام کو مارشل لا پر ترجیح دیتا ہوں۔

میں نہیں سمجھتا کہ بیشتر فوجیوں کو موت وحیات کے اختیارات
سونپے جا سکتے ہیں۔ بے دردانہ قتل کے واقعات نے انگریزی خون
میں جوش پیدا کر دیا ہے اس لیے معمولی سی وجہ پر بھی دیسیوں کو گولی
سے اڑایا یا پھانسی دیا جائے گا، لہٰذا میں اس امر کو ترجیح دیتا ہوں
کہ یہ اختیارات ان لوگوں کے سپرد رہیں جو شہادت کو جانچنے پرکھنے
کے عادی ہیں۔ کوئی سول افسر کسی آدمی کو معقول وجہ کے بغیر سزائے
موت نہ دے گا[1]

کُتے اور گیدڑ

میلی سن لکھتا ہے کہ نگر اگرچہ ایک حد تک طبقاتی تعصب میں مبتلا تھا،
تاہم اس نے جو کچھ کہا، وہ تھا درست، اس لیے کہ:

ہمارے فوجی افسر ہر قسم کے مجرموں کو مارتے پھرتے تھے اور
درد و تاسف کے بغیر انھیں پھانسیاں دے رہے تھے۔ گویا وہ
کُتے تھے یا گیدڑ یا نہایت ادنیٰ قسم کے کیڑے مکوڑے۔ ایک معاصر
مخبر نے لکھا ہے کہ جس روز ہتھیار رکھوائے گئے۔ (۴۔ جون)
اس سے دوسرے دن صبح کے وقت ٹکسال کے پاس پھانسیوں
کی ایک قطار کھڑی تھی۔ چند روز بعد فوجی عدالتوں یا کمشنوں کے
جلاس روزانہ ہوتے اور وہ اندھا دھند بے دردی سے
بڈھوں اور جوانوں کو موت کی سزائیں سناتے جاتے۔ ان پھانسیوں
کو "کرنیل نیل کی پھانسیاں" قرار دیا گیا[2]

۔۔۔ سرو پا عذر تراشی

میلی سن اس بات کو کیونکر برداشت کر سکتا تھا کہ نیل پر الزام

---

[1] ۔۔۔ میلی سن جلد دوم ص ۱۷۷ [2] ایضاً ایضاً ایضاً

عائد ہو؟ اس نے لکھا کہ نیل تو چار پانچ روز بعد بنارس سے چلا گیا تھا، پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے مذکورہ بالا سزا ہائے موت کی تصدیق کی؟

یہ عذر بالکل بے سروپا ہے۔ نیل ۴۔ جون سے تمام معاملات کا مختار تھا، پھانسیاں ۵۔ کی صبح کو تیار ہو چکی تھیں اور نیل ۹۔ جون تک بنارس ہی میں رہا۔ اس نے سارا انتظام اپنے سامنے کرایا اور یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا لہٰذا اسے بری الذمہ قرار دینے کی کون سی وجہ ہے؟

پھر نیل کا یہی ایک کارنامہ نہ تھا۔ آیندہ جو کچھ بیان ہونے والا ہے اس کی ذمہ داری بھی نیل ہی پر ہے۔ نیز اصل معاملہ کسی ایک فرد کا نہیں جس کا نام نیل تھا، اصل معاملہ اس نظام اور اس پورے کارخانے کا تھا جس میں نیل ایک پرزہ تھا اور جس ظلم وجود کا ذکر ہوا، اس کے ذمہ دار بہر حال انگریز تھے۔ یہ نہ تھا کہ ملکی باشندے خود موت کے شوق میں پھانسیاں لے رہے تھے۔ سب سے آخر میں یہ کہ نیل نے جب ان واقعات کی کیفیت سُنی تو کیا ان پر ناراضا مندی کا اظہار کیا؟

خوفناک سنگ دلی ایک واقعہ سُنیے اور انگریزوں کی ذہنیت کا اندازہ کیجیے:

> ایک موقع پر چند کم عمر لڑکوں نے محض کھیل کے طور پر باغیانہ علم، بلند کیا اور وہ تاشے بجاتے ہوئے چکر لگا رہے تھے۔ ان پر مقدمہ چلا کر پھانسی لگنے کا حکم ہُوا۔ فوجی عدالت کے افسروں میں ایک افسر ایسا بھی تھا جو مسلح دشمن کے مقابلے میں تو انتہائی بے پروائی سے ڈٹ جاتا لیکن کمزوروں اور بے دست و پا لوگوں کے لیے اس کے دل میں رحم تھا اور بہادروں کا شیوہ یہی ہوتا ہے۔ وہ روتا ہوا کمان افسر کے پاس گیا اور بہ منت التجا کی کہ کم عمر مجرموں

کی سزا منسوخ کر دی جائے مگر کچھ رحم نہ کیا گیا[1]

کان پور، دہلی، جھانسی وغیرہ کے واقعات قتل کو بہت نمایاں کیا گیا اور ان کے بارے میں عجیب و غریب تبصرے ہوئے، بتلایئے جو واقعہ اوپر بیان ہوا ہے، کیا وہ وحشت اور درندگی کی بدترین مثال نہیں؟ جنگلوں میں جو آدم خور جانور رہتے ہیں کیا وہ انگریز اُن سے بہتر تھے، جنھوں نے مذکورہ بالا جرم کیے؟

اور سُنیے

اس قسم کے تمام واقعات نہ کوئی لکھ سکتا تھا اور نہ کسی کو لکھنے کی ضرورت تھی۔ اختیار انگریزوں کے ہاتھ میں تھا، قلم ان کے قبضے میں تھا۔ جو بات غیر مناسب معلوم نہ ہوتی، وہ معرض تحریر میں لے آئے۔ اسی ذخیرۂ روایات میں یہ روایت بھی دکھی گئی:

> پھانسی دینے والوں کے رضا کار جتھے اضلاع میں نکل جاتے تھے اور اس موقع پر غیر پیشہ ور جلادوں کی کمی نہیں رہی تھی۔ ایک صاحب اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ میں نے بہت سے لوگوں کو "لطیف فنی انداز" میں موت کے گھاٹ اتارا۔

وہ لطیف فنی انداز کیا تھا؟ یہ کہ ٹکٹکی کی جگہ آموں کے درختوں میں رسا باندھ لیتا جسے موت کی سزا دینی ہوتی اسے ہاتھی پہ سوار کرتا۔ موقع پہ پہنچ کر پھندا غریب مجرم کے گلے میں ڈالا جاتا اور ہاتھی کو بھگا دیا جاتا۔ مجرم بے چارا آٹھ کے ہندسے کی طرح درخت سے لٹک کر جان دے دیتا[2]

شراب

نیل الہ آباد پہنچا تو شراب بڑی سستی بک رہی تھی، اس لیے کہ انگریز تاجران شراب کی دکانیں لوٹی گئی تھیں۔ اور اس جنس کے گاہک مسلمان تو تھے ہی نہیں، ہندو بھی بہت کم پیتے تھے۔ سکھ اور گورے خوب پی رہے تھے۔ حالت یہ ہو گئی کہ فوجی

---

[1] بیلی سن جلد دوم ص ۱۸۱ [2] ایضاً ایضاً

نظم ونسق ہی قائم نہ رہا۔ آرتھر نیل نے مجسٹریٹ کے محکمے کو حکم دیا کہ جتنی شراب ملے خرید لو اور اسے سرکاری ذخیروں میں بند کر دو۔ پھر سکھوں کو قلعے سے باہر نکال دیا، تاکہ ان کی وجہ سے گورے بھی خراب نہ ہوں۔

یورشیں

اب اس نے انگریز عورتوں اور بچوں کو کشتیوں میں بٹھا کر کلکتے بھیج دیا۔ خود جا بجا ملے اور یورشیں شروع کر دیں۔ پہلے قلعے کی توپوں کا رخ آس پاس کی آبادیوں مثلاً کڈ گنج اور مول گنج کی طرف پھیرا اور گولہ باری شروع کر دی۔ پھر ایک دخانی جہاز میں گوروں کو سوار کیا کہ وہ دریا کی سمت سے شہر پر حملہ کریں۔ سکھوں، گوروں اور بے قاعدہ رسالے کا ایک جیش آس پاس کے دیہات کی طرف بھیجا۔ انھوں نے جو طریقے اور تدبیریں اختیار کی ہوں گی، ہم ان کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں، صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ جس طرف گئے اور جدھر سے گزرے اپنے پیچھے خوں ریزی و تباہی کے مرقعے چھوڑ گئے۔

شہر بالکل خالی

مولانا لیاقت علی نے مقابلے کی بڑی کوشش کی، لیکن لوگوں میں مزاحمت کی کوئی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ ان کی حیثیت دراصل منظم لشکر کی نہ تھی بلکہ محض ایک بھیڑ کی تھی۔ جو عموماً چلنے کی جگہ بھٹتی اور رکنے کی جگہ گر جاتی ہے۔ یعنی دونوں صورتوں میں عزم و استقامت سے خالی ہوتی ہے۔ آگے بڑھے تو سیل، پیچھے ہٹے تو سیل۔ انھیں منظم کر کے عسکری تربیت دینے کا موقع ہی نہ ملا۔

وہ انگریزوں کی آمد کے بارے میں ابتدائی خبریں سنتے ہی شہر چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ مولانا لیاقت علی کی ایک تحریر میلی سن نے درج کی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ قلعے سے شہر پر شدید گولہ باری کی افواہ پھیل گئی تھی، اس وجہ سے لوگ بھاگ گئے۔ نہ کسی گھر میں کوئی متنفس باقی رہا، نہ شہر میں کوئی چراغ نظر آتا تھا[1]

---

[1] میلی سن جلد دوم ص ۲۰۱

نیل کے کارنامے اب آپ پھر نیل کے کارنامے ملاحظہ فرمائیں جو ۱۷ اور ۱۸ جون سے شروع ہوئے:

> فوجی اور سویلین یکساں خونی عدالتوں کے اجلاس منعقد کر رہے تھے یا مقدموں کے بغیر ہی دیسیوں کو قتل کرتے جاتے تھے۔ نہ صنف کا کوئی پاس تھا، نہ عمر کا کوئی لحاظ۔ اس کے بعد خون کی پیاس اور بھی تیز ہو گئی ہندوستان کے گورنر جنرل با اجلاس کونسل کی طرف سے جو کاغذات ولایت بھیجے گئے۔ وہ برطانوی پارلیمنٹ کے ریکارڈز میں موجود ہیں۔ ان میں مرقوم ہے کہ بوڑھے، عورتیں اور بچے بھی قربان کیے گئے اور بغاوت کے مجرم بھی[1]

انگریزوں کا سرمایۂ فخر میلی سن لکھتا ہے کہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو دانستہ نہ مارا گیا بلکہ وہ اپنے دیہات میں جل کر مر گئے یا ممکن ہے اتفاقیہ انھیں گولیاں لگ گئی ہوں۔

سبحان اللہ، دیہات کو آگ کس نے لگائی؟ کس گناہ میں لگائی؟ گولیاں اس طرح اندھا دھند کیوں چلائی گئیں کہ بے جرم بھی مارے گئے؟ کیا آبادیوں کو انگریزوں نے صحرا یا جنگل فرض کر لیا تھا یا ان میں رہنے والے ویسے انسان نہ تھے جیسے خود انگریز تھے؟

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ انگریز فخر و مباہات میں بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ کبھی کہتے دیکھو ہم نے کسی کو زندہ نہ چھوڑا۔ کبھی کہتے کالوں پر خوب گولیاں چلائیں اور انھیں خوب سزا دی۔ بعض کہتے ہم نے خوب مزے لیے۔ ایک روایت ہے:

> آٹھ چھکڑوں کا کام تین ماہ تک یہ رہا کہ روزانہ طلوع سے غروب تک چوکوں اور بازاروں کے چکر لگا لگا کر ان لوگوں کی لاشیں جمع کرتے

---

[1] میلی سن جلد دوم ص ۲۰۳ یہ کاغذات ۴ فروری ۱۸۵۸ء کو پارلیمنٹ میں پیش ہوئے تھے۔

جنھیں پھانسیاں دی جاتی تھیں۔ اس طرح چھ ہزار آدمیوں کو موت کی سزا دے کر عدم آباد میں بھیج دیا گیا[1]

نیل کا روزنامچہ

اب نیل کی کہانی خود اس کی زبانی سن لیجیے: لکھتا ہے، ۱۷ جون کو عیسیٰ علی نام ایک سوار اس جرم میں میرے پاس پیش ہوا کہ اس نے مولوی لیاقت علی اور باغیوں کا ساتھ دیا تھا، حالانکہ وہ بیس برس تک ہمارے پاس ملازم رہ چکا تھا۔

میں نے اسے فوراً پھانسی دے دینے کی ہدایت کی۔ یہ پچھلا بخت ہے جسے میں نے فوری موت کی سزا کا حکم دیا۔ میں نے سب کچھ اپنے ملک کی بھلائی کے لیے کیا، اس لیے کہ میرے ملک کا اقتدار و وقار بحال ہو جائے اور یہ حد درجہ وحشیانہ اور غیر انسانی بغاوت فرو ہو جائے[2]

عام قتل و بربادی کے علاوہ یہ وہ سزائیں تھیں جو نیل نے خود براہ راست دیں پھر اسے اپنے ملک کے وقار و اقتدار کی بحالی اور اس کی بہتری کا اتنا خیال تھا، یہ خیال کیوں نہ آیا کہ جہاں وہ اپنے ملک کا اقتدار بحال کرنا چاہتا تھا وہ بھی کسی قوم کا وطن تھا؛ اس کے باشندے بھی حبِ وطن کے جذبات سے خالی نہ تھے اور انھیں حق بھی تھا کہ ان جذبات سے اپنے سینے معمور رکھیں۔

قتل و غارت کا بے پناہ سیل

اواخر جون تک نیل الہ آباد میں رہا۔ پھر اس نے کان پور کی طرف پیشقدمی کی تیاری کی۔ رینالڈ[3] کو تھوڑی سی فوج دے کر ہراول کے طور پر پہلے روانہ کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسے کیا ہدایات دیں؟ یہ کہ

راستے کے آس پاس جو مقامات ایسے ہیں کہ ان پر دشمن نے قبضہ کر رکھا ہو، ان پر حملہ کرو اور تباہ کر ڈالو، البتہ دوسرے مقامات

---

[1] بیلی سن جلد دوم ص ۲۰۳ [2] ایضاً ایضاً ص ۲۰۶ حاشیہ [3] RENAVD

کو نہ چھوڑو۔

بہت سے "مجرم دیہات" کے نام بتلا دیے گئے کہ انھیں بالکل تباہ کر ڈالو اور ان میں جتنے مرد رہتے ہیں اُن سب کو موت کے گھاٹ اُتار دو۔ باغی رجمنٹوں کے سپاہی ملیں اور وہ اپنے طرزِ عمل کے بارے میں اطمینان بخش جواب نہ دے سکیں تو انھیں پھانسی پر لٹکا دو۔ فتح پور پر حملہ کر دو۔ پٹھانوں کے محلے کو منہدم کر ڈالو، وہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کر دو:

> باغیوں کے تمام سرداروں، خصوصاً فتح پور کے باغیوں کو پھانسیاں دے دو۔ اگر ڈپٹی کلکٹر پکڑا جائے تو اُسے بھی پھانسی پر لٹکا دو۔ اس کا سر کاٹ کر قصبے کی سب سے بڑی اور ممتاز اسلامی عمارت پر آویزاں کر دو[۱]

یہ نیل تھا جس کی جوانمردی اور کاروائی کے گُن گاتے گاتے انگریز تھکتے نہ تھے۔ بھلا سوچیے کہ ان جابرانہ احکام کے لیے جواز کی کون سی وجہ موجود تھی۔

تاتاری اور انگریز جنھیں ہم آزادی کے مجاہد کہتے ہیں، انگریزوں کے نقطۂ نگاہ سے انھیں "باغی" فرض کر لیجیے۔ وہ انگریزی حکومت سے لڑے اور ان سے لڑائی بالکل بجا تھی۔ دورانِ مقابلہ میں انھیں زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے پر بھی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر وہ ایک مقام پر ناکام ہو جانے کے بعد دوسری بستیوں میں جا بیٹھے تو ان بستیوں کا کیا گناہ تھا کہ انھیں برباد کر ڈالنے کا حکم عام دے دیا جاتا؟ یہ فاتحیت کا جنون اور حق و انصاف کا خون تھا، جرنیل جیسے بے حوصلہ، بے ہمت اور بے ضبط لوگوں کے دماغوں پر سوار ہو چکا تھا۔ جن لوگوں نے اپنے ملک اور اپنے وطنِ عزیز کے لیے ایسی ہی آزادی کا خواب دیکھا تھا، جیسی انگریزوں کو اپنے وطن میں حاصل تھی، انھیں جنگلی درندوں کی طرح مارا، لوٹا اور برباد کیا جا رہا تھا۔ آپ نے "تاتاریوں کی خونریزیوں اور تباہ کاریوں کی بہت سی داستانیں سنی

---

[۱] میلی سن جلد دوم ص ۲۰۶

ہوں گی، لیکن نیل یا اس کے ساتھیوں کی داستان خونچکاں کسی چنگیز اور کسی ہلاکو سے کم دردانگیز نہ تھی۔ چنگیز اور ہلاکو تیرھویں صدی عیسوی میں گزر چکے تھے۔ جب یورپی تصوّر کے مطابق تہذیب ابتدائی مراحل میں تھی۔ نیل اور اس کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا، انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں کیا، جب "یورپی تہذیب" کا درجہ بہت بلند ہو چکا تھا:

ایک دیسی بیان

سب سے آخر میں الٰہ آباد کے متعلق سید کمال الدین حیدر کا بیان پڑھیے۔ لکھتے ہیں:

> الٰہ آباد میں سب سے زیادہ پھانسی دی گئی۔ دریاباد کی پٹھان رعایا وغیرہ نے مل کر کچھ خزانہ لوٹا پھر جہاد پر کمر باندھ مقابلہ کیا۔ آخر فوج نے قلعے سے نکل کر ان سب کا ستیاناس کر دیا۔ گرد شہر کے آگ لگا دی۔ بعد تسلط سات ہزار کو پھانسی دی۔[1]

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۵۰-۲۵۱

باب ۷

خون اور آگ

— (۲) —

نیل کے بجائے ہیوے لاک

نیل نے الٰہ آباد اور اس کے گرد و نواح میں ظلم و جور کی بھٹیاں دہکا رکھی تھیں۔ اس اثنا میں اس کی جگہ ہنری ہیوے لاک کو سپہ سالار بنا دیا گیا اور ہیوے لاک ۳۰۔ جون کو الٰہ آباد پہنچ گیا۔ نیل جتنا کام انجام دے چکا، اس کی تفصیلات بیان کیں، نیز بتایا کہ رینا ؤ کو ہراول کے طور پر بھیجتے وقت اس نے کیا کیا ہدایات دیں۔ ہیوے لاک نے ان تمام ہدایات پر تحسین کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تصدیق کر دی۔ گویا ظلم و جور اور بے پناہ تشدد محض نیل ہی کو پسند نہ تھا، تمام انگریز جرنیل ایسے ہی طور طریقوں کو پسند کرتے تھے۔

رینا ؤ کی پیش قدمی

رینا ؤ نے الٰہ آباد سے فتح پور کی طرف سے پیش قدمی کس انداز میں کی اور جو ہدایات اسے نیل کی طرف سے مل چکی تھیں، ان پر کس طرح کاربند ہوا؟ یہ کہانی بھی آپ ایک انگریز کی زبان سے سنیے۔ وہ ولیم رسل تھا، جسے "لنڈن ٹائمز" نے نامہ نگار کے طور پر پاک و ہند بھیجا تھا اور اس نے اپنے تمام شاہدات ایک کتاب میں مرتب کر دیے تھے، جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ رسل لکھتا ہے کہ ایک افسر رینا ؤ کے کالم میں متعین تھا۔ اس نے بات چیت کے دوران میں مجھے بتایا کہ دیسی باشندوں کا قتل آخری درجے پر پہنچ چکا ہے۔

دو روز میں بیالیس آدمیوں کو بر سرِ راہ پھانسیاں دی گئیں۔ بارہ آدمیوں کے ایک گروہ کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ جب کالم کوچ کرتا ہُوا ان کے پاس سے گزرا تو انھوں نے منہ پھیر رکھے تھے۔ رینا ڈ جب پڑاؤ ڈالتا تو سامنے کے تمام دیہات کو آگ لگوا دیتا۔ اس تشدد کو کان پور کے واقعہ قتل کی بنا پر جائز ثابت نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ یہ سب کچھ اس شیطانی فعل (کان پور کے واقعہ قتل) سے پیشتر واقع ہو چکا تھا افسر مذکور نے رینا ڈ کے پاس احتجاج کیا کہ اگر یہ طریقہ جاری رہا تو دیہات خالی ہو جائیں گے اور فوج کو رسد نہیں مل سکے گی۔[1]

میلی سن کی معذرت

میلی سن کو یہ راست بازی کیونکر گوارا ہو سکتی تھی؟ اس نے معذرت کے طور پر لکھا:

۱ —— رینا ڈ بے رحم آدمی نہ تھا، لیکن اس زمانے میں جرم و بے جرمی کے درمیان امتیاز مشکل تھا۔

۲ —— جس افسر کا بیان اُوپر نقل ہُوا ہے، وہ رینا ڈ کے مشوروں میں شریک نہ تھا، ممکن ہے رینا ڈ کے سامنے ان تشددات کے لیے معقول وجوہ موجود ہوں۔

۳ —— بے شک اس وقت تک کان پور میں قتل کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن میرٹھ اور دہلی کے واقعات ہمارے اہلِ وطن کے غیظ و غضب کی آگ انتہائی درجہ اشتعال پر پہنچا چکے تھے۔

۴ —— یہ بھی واقعہ ہے کہ اس وقت تک دوآبہ گنگا و جمنا کے دیسی باشندوں کی اکثریت ہماری دشمن تھی۔[2]

---

[1] ڈائری ان انڈیا بحوالہ میلی سن جلد دوم ص ۲۱۵ حاشیہ۔ [2] میلی سن جلد دوم ص ۲۱۵ حاشیہ۔

اس قسم کے عذر تراش لینا مشکل نہیں، لیکن ان میں سے کون سا عذر ہے جسے کسی بھی درجے میں معقول سمجھا جا سکے؟ جرم و بے جرمی میں امتیاز کیوں مشکل تھا؟ اگر انگریز فوجی افسر وحشیوں اور حیوانوں کے ایک گروہ کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک منظم حکومت کے کارندوں کی حیثیت میں کام کر رہے تھے، تو کیا وجہ ہے کہ وہ نرمی، ملائمت یا کم از کم انصاف سے کام نہ لے سکے؟ رینالڈ کے پاس بے پناہ تشدد کے لیے کون سی مخفی وجوہ ہو سکتے تھے، جن سے ان کے رفیق ناواقف تھے؟ اگر میرٹھ اور دہلی کے واقعات کی بنا پر وہ سب کچھ جائز تھا جس کی کیفیت ولیم رسل نے پیش کی ہے تو پھر کان پور کے واقعات قتل پر ٹسوے بہانے کا کون سا موقع ہے؟ وہ نیل اور رینالڈ کے ظلم و جور کے جواب تھے کیا ان لوگوں کے ہم وطنوں کو بدلہ لینے کا حق نہ تھا؟ جن پر نیل اور رینالڈ نے ظلم کیے تھے؟ اگر ہم یہی کہیں گے کہ ہندوستان جو ایسی حرکت کی وہ افسوسناک تھی نیز اگر دوآبے کی اکثریت انگریزوں کی دشمن تھی کہ دوستی میں بدل لینے کا طریقہ وہ تھا جس سے رینالڈ نے کام لیا۔

مقدماتِ جنگ

رینالڈ بڑھا جا رہا تھا۔ ۷۔ جولائی کو ہیوے لاک الٰہ آباد سے چلا اور ۱۲۔ کو فتح پور سے ۴ میل پر بلندہ میں رینالڈ سے مل گیا۔ رینالڈ کو اطلاع ملی تھی کہ فتح پور میں غنیم کی فوج بہت کم ہے۔ دراصل یہ اطلاع غلط تھی اور رینالڈ اگر پیش قدمی کرتا رہتا یا ہیوے لاک اس سے نہ آ ملتا تو انگریزی فوج کا ہراول بالکل تباہ ہو جاتا۔ یہاں پھر اس امر پر تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی کہ کان پور پر قبضے کے بعد نانا یا اس کے ساتھیوں نے کیوں فتح پور یا اس سے بھی آگے بڑھ کر استحکامات نہ کر لیے تاکہ انگریزوں کے قدم اٹھانے کا موقع ہی نہ مل سکتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جنگی صلاحیت رکھنے والا کوئی بھی آدمی موجود نہ تھا۔ بہرحال انگریزی پیش قدمی کی خبر ملی تو نانا نے اپنے بھائی بالا صاحب کو فوج دے کر فتح پور بھیجا۔ جوالا پرشاد بھی ساتھ تھا۔

جنگِ فتح پور

۱۲۔ جولائی کو انگریزی فوج بلندہ میں خورد و نوش کی تیاری کر رہی تھی اور اسے قطعاً احساس نہ تھا کہ کوئی دیسی فوج مقابلے کے لیے آ گئی ہے۔ یکا یک ایک

بھاری گولہ ہیوے لاک کے قریب آ کر گرا۔ فوراً لڑائی کی تیاری ہو گئی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ انگریزی ساز و سامان بھی بہتر تھا اور سپاہ بھی زیادہ منظم تھی۔ بنر بالا صاحب یا جوالا پرشاد میں سے کوئی بھی کاروان جرنیل نہ تھا۔ ایسی لڑائیوں میں خالی بہادری اور جوش سے کام نہیں چل سکتا۔ نانا کی فوج کا توپ خانہ اگرچہ انگریزی توپ خانے کے مقابلے میں زیادہ اچھا تھا لیکن انجام کار اس فوج کو پسپا ہونا پڑا اور فتح پور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا[1]

شہر فوج کے حوالے

جنگ میں کامیابی کے بعد شہر فوج کے حوالے کر دیا گیا اور اس نے لوٹ مار میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ کیوں کیا گیا؟ اس لیے کہ میلی سن کے بیان کے مطابق یہ شہر مجرم تھا! اس کا دامن خون سے آلودہ ہو چکا تھا۔

> یہ چند ہفتے پیشتر بغاوت کر چکا تھا اور اب اس کی پیشانی پر مکافات کا داغ لگنا چاہیے تھا[2]

میلی سن کس بے تکلفی بلکہ جوش مسرت سے لکھتا ہے کہ لوٹ کا بہت سا سامان گھروں اور دکانوں میں جمع تھا، جسے ہراس زدہ باشندے پیچھے چھوڑ گئے تھے:

> بس اب ہمارے سپاہیوں، گوروں اور سکھوں کو کھلی اجازت دے دی گئی۔ دن گزرنے سے پیشتر سب مال سمیٹا جا چکا تھا اگلے دن صبح کو فوج فتح پور سے روانہ ہوئی تو سکھوں کو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ وہ اس خیال پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے کہ قصبے کو آگ لگانے کا خوشگوار کام ان کے حوالے کیا گیا[3]

---

[1] بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بالا صاحب اور جوالا پرشاد کے علاوہ ٹیکا سنگھ اور مولانا لیاقت علی الہ آبادی بھی نانا کی فوج کے ساتھ تھے۔ مولانا لیاقت علی الہ آباد کی تسخیر کے بعد کانپور پہنچ گئے تھے۔ [2] میلی سن جلد دوم ص ۲۷۳۔ [3] میلی سن جلد دوم ص ۲۷۸۔

پھانسیاں یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ فتح پور میں جو لوگ بھی ملے انھیں پھانسیوں پر لٹکا دیا گیا۔ انھیں میں دیوان حکمت اللہ خاں بھی تھا، جس نے آخری وقت تک جگہ نہ چھوڑی۔ اس غریب کو بھی پھانسی کی سزا ملی لیکن کس طرح؟ یہ ولیم میور کی زبان سے سُنیے۔ وہ لکھتا ہے:

> معلوم ہوتا ہے دیوان کو موت کی سزا دینے میں بڑا بھونڈا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس پر بہت افسوس ہے۔ کہا جاتا ہے، سپاہیوں کو اجازت دے دی گئی کہ اس بدبخت کے منہ میں سور کا گوشت ٹھونسیں انگریزوں کو ایسی کارروائیوں سے بالا رہنا چاہیے۔[1]

کیا اس پر کسی تبصرے کی ضرورت ہے؟

ہیوے لاک کا کوچ آپ رینالڈ کے جیش کی پیش قدمی کا نظارہ پہلے فرما چکے ہیں، اب ہیوے لاک کی فوج کے کوچ کی کیفیت ملاحظہ کریجیے۔ یہ بھی ایک انگریز سول افسر ولاک[2] کے بیان پر مبنی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> راستے کے بہت سے گاؤں جلا دیے گئے تھے اور انسان وہاں قطعاً نظر نہ آتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف دلدل تھی جلی ہوئی جھونپڑیوں کے سیاہ کھنڈر تھے جنھیں موسم کے اثرات نے اور زیادہ بدوضع بنا دیا تھا۔ ایک بھی صدا نہیں سُنی جاتی تھی۔ جو کسی انسان کے وجود کا پتا دیتی یا معلوم ہو سکتا کہ آدمی کام کاج میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی صداؤں کی جگہ مینڈکوں کے ٹرانے کا شور تھا یا ٹڈیوں کی تلخ و تیز بانسریاں بج رہی تھیں یا ہزاروں پردار کیڑے دھیمے دھیمے غن غنا رہے تھے

---

[1] انڈین میوٹنی اینٹلی جنس ریکارڈز جلد اول ص ۴۳۰ [2] WILLOCK

بد موسم کی نمی اور حدت کے باعث پیدا ہو گئے تھے۔ پھر نیم کے
درختوں کی ناخوشگوار بو تھی۔ کہیں کہیں لٹکی ہوئی نعشوں کی بدبو ہوا کو خراب
کر رہی تھی اجنھیں ہماری آنکھوں کے سامنے مکروہ شورزمے سے
کھا رہے تھے۔ یہ سب چیزیں ہمارے حواس پر اثر انداز رہی
تھیں اور مل کر بربادی، تباہی اور رنج و ماتم کا ایک ایسا مرقع تیار کر
رہی تھیں جو میرے نزدیک موجود لوگوں میں سے کسی کو عمر بھر فراموش نہ ہوگا۔

یہ "ہیوے لاک کا کارنامہ" تھا، جسے دوسرے انگریز جرنیلوں کے مقابلے میں عموماً
رحم دل سمجھا جاتا ہے۔

کان پور میں داخلہ

فتح پور سے آگے بڑھ کر ایک لڑائی ۱۵۔ جولائی کو اونگ نام ایک گاؤں
میں ہوئی۔ پھر اسی روز پانڈو ندی پر مقابلہ ہوا۔ نانا کی فوج کہیں بھی
کامیاب مزاحمت نہ کر سکی اسی موقع پر نانا نے انگریز قیدیوں کے قتل کا حکم دیا۔ اس نے تاکید کر
رکھی تھی کہ قیدی خفیہ خط و کتابت نہ کرنی چاہیے، لیکن انگریز خواتین باز نہ آتی تھیں۔ عین آخری
وقت میں بھی ان کے دو خفیہ خط پکڑے گئے اور اسی پر غصے کی حالت میں نانا نے وہ حکم دے دیا
جو یقیناً حد درجہ رنجدہ تھا اور جس کے لیے کوئی وجہ جواز پیش نہیں کی جا سکتی۔ ۱۶۔ جولائی کو نانا
نے خود پانچ ہزار فوج کے ساتھ کانپور کے باہر ہیوے لاک کا مقابلہ کیا لیکن یہ بھی بے نتیجہ رہا۔
۱۷۔ جولائی کو انگریز کانپور میں داخل ہو گئے۔ گویا کانپور میں نانا کی مستقل حکومت ۲۷۔ جون
سے ۱۷۔ جولائی تک رہی۔

خوفناک حالت

کانپور میں داخلے کے بعد انگریزی فوج کے "دو کارنامے" بطور خاص
قابلِ ذکر ہیں۔ اول سب نے اندھا دھند شراب نوشی شروع کر دی جس کے

۱؎ میلی سن جلد دوم ص ۲۲۷۔

وسیع ذخیرے وہاں موجود تھے۔ خود ہیوے لاک کو لکھنا پڑا کہ میں ۱۶۔ جولائی کو فتح حاصل کرنے میں لگا ہوا تھا اور میرے آدمی چپتے چپتے کمسٹریٹ کو لوٹ رہے تھے۔ دوم کانپور میں جو تشددات اور جو زیادتیاں ہوئیں، ان کے بارے میں میلی سن نے لکھا ہے کہ ان سے بڑھ کر کہیں نہ ہوئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دس ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ قتل و غارت کے سوا فوج کا کوئی کام نہ تھا۔ بالآخر ہیوے لاک کو حکم دینا پڑا کہ جو سپاہی لوٹ مار کرتا ہوا پکڑا جائے گا، اسے اسی مقام ہی میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا[1] نانا صرف کانپور بلکہ بٹھور سے بھی رخصت ہو گیا تھا۔ جولائی کو بٹھور میں پیشواؤں کا محل تباہ کر دیا گیا۔

انگریزی ذہنیت کا نقشہ

وولزلے[2] اس زمانے میں معمولی فوجی افسر تھا۔ بعد ازاں اونچے عہدے پر پہنچا۔ جب ہیوے لاک نے کانپور سے لکھنؤ کی طرف کوچ کیا تو وولزلے کو حکم ملا تھا کہ فتح پور سے کانپور پہنچ جائے۔ اس نے انگریزوں کے واقعہ قتل کو ایک عجیب انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور حیرت انگیز تفصیلات بتائی ہیں۔ جنھیں ایک لمحے کے لیے بھی درست نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ لکھتا ہے:

> باقی رہے ہمارے آدمی تو جوشِ انتقام ان کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ جن لوگوں کو ہم ہر پہلو سے فروتر سمجھتے تھے، ان کے ہاتھوں ایک خود بین اور خود دار قوم کے افراد کی بے حرمتی کا تصور کر کے دماغ کھولنے لگتا تھا۔ یہ خیال کہ ایک دیسی نے انگریز عورت پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کی، ہم اہلِ جزیرہ کی خودداری کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ہمارے دلوں میں بے دردی سے انتقام لینے کا ہمہ گیر جوش موجزن تھا اگرچہ یہ سب سے بڑھ کر غیر مسیحی جذبہ تھا۔

---

[1] میلی سن جلد دوم ص ۲۹۱-۲۹۲ ٭

[2] WOLSELEY

یہ ذہنیت تھی جس کے ساتھ انگریز ۱۷۔ جولائی کو کانپور میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد نتائج کے بارے میں کچھ کہنے کی حقیقتاً ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

ایک دیسی بیان

اب تک آپ نے انگریزی بیانات سُنے۔ اب ایک دیسی بیان بھی ملاحظہ فرمایئے۔ سید کمال الدین حیدر لکھتے ہیں کہ ۱۶۔ جولائی کو انگریزوں نے کان پور کا انتظام کیا۔

> بس ہنگامہ یہاں سے گرم ہُوا۔ جسے پایا، بے تحقیق روبکاری بے تکلف پھانسی دے دیا۔ کئی ہزار کی نوبت پھانسی کی پہنچی۔ اکثر اپنے تئیں بے قصور جان کر رہ گئے۔ بھاگے ہوئے ہزاروں گرفتار ہو کر پھانسی دیے گئے۔ از انجملہ اعظم علی خاں کو لوگ باتفاق کہتے ہیں کہ بے قصور تھے۔ شریک باغیوں کے ٹھہرے تھے۔ پہلے بر آشتی جو کچھ لیا تھا یا نقد و جنس سے، بعد اس کے پھانسی دے دی۔ ہر چند داد بیداد اپنی بے حرفی کی، نہ سُنا[1]

نیل کی آمد

نیل ہیورے لاک کے ساتھ کان پور نہ آیا۔ بعد میں الہ آباد سے پہنچا۔ جو کچھ پہلے ہو چکا تھا، اس نے کافی نہ سمجھا۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں نے وہ کمرہ دیکھا جس میں انگریز قیدی مارے گئے تھے۔ اس کی دیواروں پر خون کے دھبے موجود تھے،

> جو لوگ اس فعل کے ذمہ دار تھے، ان پر کون رحم کر سکتا تھا؟ جو طرزِ عمل شروع میں تشدد نظر آتا ہے، وہ آخر میں رحم بن جاتا ہے۔ میں ہندوستان کے باشندوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ ایسے افعال کے لیے ہماری طرف سے سخت ترین سزا دی جائے گی، جو ان کے احساسات کے لیے زیادہ سے زیادہ مکروہ ہو گی اور جسے وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے[2]۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص: ۲۵۰۔ [2] میلی سن جلد دوم ص ۲۹۹

وحشیانہ حکم

چنانچہ نیل نے ۲۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو ایک وحشیانہ حکم جاری کیا، وہ کہتا ہے کہ ہمارے بعض سن رسیدہ اصحاب کو جن پر "برہمنیت" کا اثر پڑ چکا ہے، یہ حکم غالباً قابلِ اعتراض معلوم ہوگا، لیکن میرے نزدیک یہ موقع کے لحاظ سے بہت موزوں ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ جس کوئیں میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں، اس پر قبر کی شکل بنا دی جائے۔ جس مکان میں انھیں قتل کیا گیا، اسے نہ انگریز دھوئیں گے اور نہ صاف کریں گے۔

> بریگیڈیر جنرل نیل کا عزم مصمم ہے کہ بے گناہوں کے خون کا ہر دھبا ان بدمعاشوں سے قبل از نفاذ سزائے موت صاف کرایا اور دھلوایا جائے جو غدر میں سرگرم حصہ لینے کی بنا پر آئندہ گرفتار ہوں انھیں حیثیت، ذات اور درجہ جرم کی بنا پر اس کام کے لیے منتخب کیا جائے۔ ہر بدمعاش کو موت کی سزا کا حکم سن لینے کے بعد پہرے کے ساتھ متعلقہ مکان میں لے جایا جائے گا اور مجبور کیا جائے گا کہ وہ دھبوں کا ایک حصہ صاف کرے۔ یہ کام زیادہ سے زیادہ کراہت انگیز بنا دینا چاہیے۔ اگر مجرم پورا کام نہ کرے تو فوجی کوتوال تازیانے لگوائے۔ اپنے حصے کا کام پورا کر چکنے کے بعد مجرم کو پھانسی دے دی جائے۔ اس غرض سے پھانسی پاس ہی نصب کی جائے گی۔[1]

مرقع عبرت

پہلا مجرم ایک برہمن تھا جو ۶ پیادہ فوج میں صوبیدار کے عہدے پر مامور تھا۔ اسے جھاڑو پکڑوا دی گئی کہ صفائی کرے۔ نصف فٹ جگہ صاف کرنے کے بعد برہمن نے اس کام پر اعتراض کیا۔ معاً اس پر تازیانے برسنے لگے۔ وہ چیخا اور پھر صفائی میں لگ گیا۔ بعد ازاں اسے پھانسی دی گئی اور لاش سڑک میں دفن کی گئی۔

اسی طرح یکے بعد دیگرے یہ سلسلہ جاری رکھا گیا۔ ایک معزز مسلمان آیا جو عدالت میں

---

[1] میلی سن جلد دوم صفحہ ۳۰۰

سررشتہ دار تھا۔ اس نے صفائی پر اعتراض کیا تو تازیانے لگے اور حکم دیا گیا کہ دھبّے زبان سے چاٹ کر صاف کرو۔[1]

ایک عجیب واقعہ

سید کمال الدین حیدر نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ لکھنؤ کا ایک سقّا بیکار تھا۔ دوسروں کے ساتھ وہ بھی کان پور جا کر ملازم ہو گیا۔ انگریز پہنچے تو کسی کے گھر میں چھپ گیا۔ پھر گھر والے نے کہا، جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ میرے ہاں نہ رہو۔ باہر نکلا تو پکڑا گیا۔ اس نے ہر چند کہا کہ میرا کوئی قصور نہیں۔ کہا گیا کہ تم ضرور نانا کے ہاں ملازم تھے۔ تم نے انگریزوں کے قتل میں حصّہ لیا ہے۔ مسلمان ہو اور تمھارے خدا میں طاقت ہو گی تو وہ خود چھڑا لیگا

غرض اس کی مشکیں باندھ کر ایک درخت کے نیچے بٹھا دیا گیا۔ کھانے پینے کو کچھ نہ دیا۔ تیسرے دن شدید بارش ہوئی۔ فوج کے کوچ کا بگل بجا۔ سقّا چپ چاپ مشکیں کھول کر اٹھا اور درخت پر چڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک انگریز کا سائیس کسی شے کی تلاش میں آیا۔ سقّے کو درخت پر دیکھا تو سمجھا کہ کوئی دیوانہ ہے اور چلا گیا۔ سقّا فوراً درخت سے اتر کر بھاگا۔ بٹھور کے گھاٹ سے پار اترا تو اطمینان کا سانس لیا۔[2]

باقی حالات

ہم نے بنارس، الٰہ آباد اور کان پور کے حالات تفصیل سے بیان کر دیے۔ باقی اضلاع مثلاً باندہ، فرخ آباد، بدایوں، بریلی، شاہ جہان پور، مراد آباد، اٹاوہ، ایٹہ، آگرہ، علی گڑھ، مین پوری، بلند شہر، مظفر نگر، سہارن پور وغیرہ میں بھی اسی طرح انگریزوں نے پیش قدمی کی۔ ہر مقام پر لوگوں کو اندھا دھند موت کی سزائیں دی گئیں اور ان کی جائدادیں ضبط کر لیں۔ وہ لوگ بہ ظاہر بڑے خوش نصیب تھے جنھیں جلا وطنی یا حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزائیں ملیں۔ یہ تمام حالات تفصیل سے بیان کیے جائیں تو کتاب کی ضخامت بڑھ جائے گی۔ تاہم اتنا بتا دینا چاہیے

---

[1] میلسن جلد دوم ص ۳۰۰ ☆ [2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۵۱–۲۵۲ ☆

کر رڈ سا ہی ہے :

۱ ــــ نواب تفضّل حسین خاں والی فرخ آباد نے جان بخشی کے وعدے پر حوالگی منظور کی تھی، بایں ہمہ ان کے خلاف مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی ۔ وعدے کی بنا پر یہ سزا ملتوی ہو گئی اور نواب کو اس کی خواہش کے مطابق حجاز پہنچا دیا گیا۔ مکہ معظمہ میں فوت ہوئے۔

۲ ــــ نواب محمود خاں کے لیے حبس دوام کی سزا تجویز ہوئی، لیکن روانگی انڈیمان سے پیشتر انھوں نے قید میں وفات پائی ۔

۳ ــــ خان بہادر خاں کو پھانسی دی گئی حالانکہ وہ بہت سن رسیدہ تھا اور ڈاکٹر ہین کے قول کے مطابق سن رسیدگی ہی کے باعث حالات کے مطابق سرگرمی سے کام کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔

۴ ــــ علی بہادر خاں والی باندہ کو اندور میں نظر بند کر دیا گیا اور ریاست ضبط ہو گئی ۔

علاوہ بریں عام لوگوں پر جو ظلم ہوئے، ان کا سرسری اندازہ نجیب آباد اور متعلقات کے حالات سے ہو سکتا ہے۔ نگینہ کے باغیوں میں سے جو لوگ چھپ گئے تھے، انھیں پاتے ہی تہ تیغ کر دیا گیا۔ قاضی محلہ کے سب آدمی مارے گئے ۔ دھام پور کی سڑک پر جتنے نیل سوار تھے، موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ خاص دیہات کو باغی قرار دے کر حکم جاری کیا گیا کہ انھیں غارت کر دیا جائے اور باغیوں کے سران دیہات میں لٹکائے جائیں۔ کم و بیش یہی حالات دوسرے مقامات پر پیش آئے۔

باب ۸

اودھ

تمہید اودھ کا جغرافیائی خاکہ اس حصے کے آغاز میں پیش کیا جا چکا ہے اور الحاق کے بارے میں جو کچھ ضروری تھا وہ ۱۸۵۷ء کے اسباب میں زیر غور آ چکا ہے اس سے یقیناً ہمہ گیر بے چینی پیدا ہوئی۔ میلی سن نے بالکل درست لکھا ہے کہ کوئی بھی طبقہ ایسا نہ تھا، جو اس سے متاثر ہو کر انگریزوں کا مخالف نہ بنا ہو۔ مثلاً:

۱ —— والیانِ ریاست کو یقین ہو گیا کہ اب ان میں سے کسی کے لیے انگریزوں کی دستبرد سے بچے رہنے کا کوئی امکان نہیں۔ نہ وفاکیشی اور فرمانبرداری کا کوئی بڑے سے بڑا مظاہرہ انھیں بچا سکتا ہے اور نہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا منہ روپیہ دے کر بند کیا جا سکتا ہے اودھ سے بڑھ کر کسی نے وفاداری نہیں کی تھی، اس سے بڑھ کر انگریزوں کا فرمانبردار کوئی نہ تھا اور اس سے زیادہ روپے بھی کسی نے نہیں دیے تھے۔

۲ —— زمیندار اور جاگیر دار اس لیے مخالف ہو گئے کہ ان کی جاگیریں بعض حالتوں میں نصف اور بعض حالتوں میں اس سے بھی زیادہ چھن گئی تھیں۔

۳ —— درباری اس لیے مخالف ہو گئے کہ انھیں ذاتی منفعت اور اختیار کے جو مواقع بادشاہی کے زمانے میں حاصل تھے، وہ انگریزی حکومت اور نظم و نسق کے ماتحت نہیں حاصل رہے تھے اور نہ حاصل ہونے کا کوئی امکان تھا۔

۴ —— سپاہ اس لیے مخالف ہو گئی کہ اس کے روزگار کا سلسلہ جاتا رہا۔

۵ —— انگریزی فوج کے جو سپاہی اودھ میں بھرتی کیے جاتے تھے، وہ بھی الحاق کے مخالف

ہو گئے اس لیے کہ بادشاہی کے زمانے میں وہ انگریز ریذیڈنٹ کے ذریعے سے
بہت کچھ کرا لیتے تھے۔ الحاق کے بعد یہ صورت باقی نہیں رہی تھی۔

۶ ــــــ کسان اور چھوٹے سے چھوٹے پیشہ ور بھی انگریزوں کے نظام کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے کہ جو نظام پہلے سے رائج تھا، اس کے تمام پہلوؤں سے وہ واقف تھے اور پشتوں سے اس میں زندگی بسر کرنے کے باعث اس کے ساتھ اک گونہ موافقت پیدا ہو گئی تھی نئے نظام سے انھیں قطعاً آشنائی نہ تھی۔ نیز اس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہر چھوٹی بڑی چیز پر ٹیکس لگ جاتے تھے۔

غرض اودھ کے الحاق نے ایک ایسے ملک کو جس سے انگریزوں کو کبھی کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا، بے چینی، بے اطمینانی اور اضطراب کا آتشکدہ بنا دیا۔

ابتدائی دور

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، الحاق ۱۳- فروری ۱۸۵۶ء کو عمل میں آیا تھا اور انتظامی لحاظ سے اودھ کے لیے میجر جنرل سر جیمس اوٹ رم[1] کو چیف کمشنر بنا دیا گیا تھا۔ اسی شخص کے ذریعے سے واجد علی شاہ کی معزولی کے احکام نافذ ہوئے تھے۔ وہ تجربہ کار تھا اور اہل ملک کے حالات و جذبات کو بخوبی سمجھتا تھا، اس لیے انتظامی معاملات کو اس نے بہتر اصول پر چلانے کی کوشش کی تاکہ کسی طبقے میں خواہ مخواہ بددلی پیدا نہ ہو، لیکن اس کی صحت دو مہینے میں جواب دے گئی اور اسے رخصت لینی پڑی۔ اس کی جگہ صوبہ غرب و شمال کا ایک سویلین مقرر ہوا۔ جس کا نام جیکسن تھا۔ وہ گرد و پیش کی مصلحتوں سے یک قلم ناآشنا تھا۔ اس کے ماتحت افسر من مانی کارروائیاں کرنے لگے اور تبدیل نظام حکومت کو ایسی شکل دے دی کہ سارا ملک بے اطمینانی اور تشویش کا شکار ہو گیا۔ گورنر جنرل کو ان حالات کا علم ہوا تو سر ہنری لارنس کو چیف کمشنر مقرر کیا، جو پنجاب میں نازک حالات کے اندر بہترین خدمات انجام دے چکا تھا۔

---

[1] OUTRAM

ہنری لارنس

مارچ ۱۸۵۷ء میں ہنری لارنس نے اودھ میں چیف کمشنر کا چارج لیا تو اُسے اندازہ ہو گیا کہ حالات خاصے بگڑے ہوئے ہیں اور شکایت صرف ایک طبقے تک محدود نہیں بلکہ تمام طبقات حد درجہ غیر مطمئن ہو چکے تھے۔ اُس نے آہستہ آہستہ ایک طبقے کی تسلی کے لیے کام شروع کر دیا۔ ہزاروں آدمی تھے جنھیں ملازمتوں سے الگ ہونا پڑا تھا اور بہت سے لوگ معاش سے محروم ہو چکے تھے۔ ان کے لیے متبادل ملازمت یا مشغولیت کا انتظام ہر مصلحت پر مقدم تھا۔ لیکن جیکسن کے زمانے میں جو انگریز کارکن برسرِکار رہے تھے ان کی کیفیت یہ تھی کہ ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے اور چور اُچکے یا اٹھائی گیرے کی حیثیت میں اس سے سلوک کرتے۔ سال بھر کی پیدا کی ہوئی مصیبتوں کو ہنری لارنس چند روز میں کیوں کر زائل کر سکتا تھا۔

یہ صورتِ حال تھی، جب میرٹھ میں سپاہ کی سرکشی کا واقعہ منظرِ عام پر آیا۔ گویا ایک چنگاری اُڑی اور ہر اُس خطے کے لیے شدید ترین خطرہ پیدا ہو گیا تھا، جس کی فضا اضطراب کی بارود سے معمور تھی۔

ڈاکٹر کی بے خیالی

جب حالات بگڑنے شروع ہوتے ہیں تو معمولی واقعات بھی خوفناک وساوس و اوہام کا باعث بن جاتے ہیں۔ مثلاً چربی والے کارتوسوں نے مختلف گروہوں کے دل میں خطرہ پیدا کر دیا تھا کہ انگریز اُن کا مذہب بگاڑنے کے درپے ہیں۔ خصوصاً ہندوؤں کو ذات پات کی حفاظت کا بے حد خیال تھا۔ غالباً مارچ ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ کی ایک رجمنٹ کے انگریز ڈاکٹر نے سپاہیوں کی موجودگی میں یہ غلطی کی کہ ہسپتال میں پہنچا، دوا کی ایک بوتل اٹھائی اور گلاس میں ڈالے بغیر بوتل منہ سے لگا کر دوا پی گیا۔ انگریزوں کو ایسے واقعات کا احساس تک نہیں ہوتا، لیکن ہندو سپاہیوں کو یقین ہو گیا کہ جس بوتل کو منہ سے لگا کر ڈاکٹر دوا پی گیا ہے، اسی سے اب دوسرے مریضوں کو دوا دی جائے گی بلکہ انھیں یہ خیال بھی ہو گیا کہ شاید انگریز ڈاکٹر عموماً اسی طرح دوائیں پیتے ہیں اور ہسپتال کی تمام بوتلیں گندی ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر کو غلطی کا احساس ہوا تو وہ

بوتل اٹھا کر اسی وقت تڑوا دی، مگر اس سے جو مضرتیں پیدا ہو سکتی تھیں، وہ پیدا ہو گئیں اور ایک ایسی خطرناک بے احتیاطی کے بعد احتیاط کوشی ڈاکٹر کے لیے تو شاید تسلی کا سامان ہو سکتی تھی مگر سپاہیوں کے لیے اس میں اطمینان کا کون سا پہلو تھا؟

۳۰۔اپریل

اب سلسلہ پھیلنے لگا۔ کارتوسوں کے قصے نے اودھ میں بھی وہی صورتِ حال پیدا کر دی جو دوسرے مقامات پر موجود تھی اور انگریز اسے زور، قوت اور دباؤ سے ختم کرنا چاہتے تھے، حالانکہ یہ طریقہ شبہات کو تقویت پہنچا رہا تھا۔ ۳۰۔اپریل کو ۷ رجمنٹ نے، جو موسیٰ باغ میں مقیم تھی، نئے کارتوس قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سمجھانے بجھانے پر وہ لوگ ایک حد تک راضی ہو گئے۔ دوسرے دن صبح انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کارتوس نہیں کاٹیں گے۔ پھر وہ آپس میں مشورہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک انگریز افسروں کو ختم نہ کیا جائے گا، اس مصیبت سے نجات نہیں ہوگی۔ یہ اطلاع ہنری لارنس کو ملی، تو اس نے فوراً انگریزی فوج تیار کی اور موسیٰ باغ جا کر ۷ سے ہتھیار رکھوا لیے۔ دوسرے دن صبح کو ان کے لیڈروں کی گرفتاری عمل میں آئی اور معلوم ہو گیا کہ عام سرکشی کے لیے بات چیت ہو رہی تھی۔ بہرحال اس فوج کو توڑ دینے کا فیصلہ ہو گیا، البتہ یہ کہہ دیا گیا کہ جو لوگ بے جرم ثابت ہوں گے انھیں دوبارہ نئی فوج میں بھرتی کر لیا جائے گا۔

۱۲۔مئی

۷ کا معاملہ طے کرنے میں خاصا وقت لگا۔ ۱۲۔مئی کو ہنری لارنس نے ایک دربارِ عام منعقد کیا، جس میں اس بات پر خاص زور دیا کہ انگریزی حکومت اسلام اور ہندوییت دونوں مذہبوں سے برابر رواداری کا برتاؤ کرتی رہی۔ اس کے مقابلے میں اس نے بالکل غلط اور غیر مناسب طریق پر بعض مسلمان اور غیر مسلم بادشاہوں کی نارواداری کا ذکر بھی کیا۔ اس موقعے پر فوج کے ان افسروں کو تمغے اور انعام بھی دیے گئے، جن کی "وفاداری" میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

سوال یہ نہ تھا کہ انگریزی حکومت کی عام رواداری کا کیا حال رہا، سوال یہ تھا کہ جو طریقہ

کارتوسوں کے متعلق اختیار کیا گیا، کیا اس کے لیے کوئی اچھا اور خوش گوار پہلو پیش کیا جا سکتا تھا؟ معلوم ہو چکا تھا کہ ان کارتوسوں میں چربی لگائی جاتی ہے اور چربی کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ سور کی یا گائے کی یا بھیڑ بکری کی ہے۔ سپاہی ان کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹنا یا ہاتھ سے توڑنا خلافِ مذہب سمجھتے تھے۔ اس طرف کسی کی توجہ نہ تھی اور بے تعلق باتوں کو بار بار پیش کیا جاتا تھا جن سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ غرض دربار سے کوئی اچھا اثر پیدا ہوتا یا نہ ہوتا لیکن دوسرے دن میرٹھ سے سپاہ کی سرکشی کی اطلاع مل گئی اور جس ساعت کا خطرہ مدت سے لگا ہوا تھا، وہ سر پر آ گئی۔

انتظاماتِ حفاظت

اب ایک طرف تو ہنری لارنس سپاہ اور عوام کو مطمئن رکھنے کے درپے تھا، دوسری طرف اس نے انگریزوں کی حفاظت کے انتظامات شروع کر دیے تھے۔ اس وقت تین لشکر گاہیں تھیں، ریزیڈنسی، مچھی بھون اور منڈھیاؤں۔ لارنس نے مچھی بھون اور ریزیڈنسی کو ملا کر ایک حلقۂ حفاظت بنایا اور اس پورے حلقے کے اردگرد استحکامات شروع کر دیے، جن کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ مقصود یہ تھا کہ ہنگامہ شروع ہو جائے تو تمام انگریزوں کو اس محفوظ و مستحکم حصے میں ٹھہرا لیا جائے اور وہاں بیٹھ کر "باغیوں" کا مقابلہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں سید کمال الدین حیدر کے بیانات خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

۱- غربائے شہر کے جتنے مکانات مچھی بھون کے پاس تھے سب کو مسمار کر دیا تھا اور جا بجا توپیں لگائی تھیں۔ دو بہت بڑی توپیں زیر قلعہ گومتی کے پل پر نصب تھیں۔

۲- حسن باغ محلو کر محسن الدولہ کو لے کر ہموار کر دیا گیا تھا۔

۳- اُمرائے شہر کو حکم دیا تھا کہ بقدرِ ضرورت سپاہی اپنی حفاظت کے لیے رکھ لو۔

۴- ہر قسم کا غلہ اور سامان جنگ لاکھوں روپے کا قلعہ مچھی بھون میں جمع ہو کر غار اور رکھتے کھود کر رکھا گیا تھا اور زمین میں نقب و سرنگ کھود کر جا بجا پیپے بارود کے رکھوا دیے تھے۔ اس خیال سے کہ بروقت غلبۂ دشمن ان میں آگ دے دیں گے۔

۵۔ خریدِ غلّہ کے سبب سے گرانی بڑھ گئی تھی اور لوگوں کو سخت تکلیف ہوئی۔

۶۔ مچھی بھون کی نہر میں پانی بھر دیا گیا، لیکن قرب دریا اور رطوبت زمین سے انبار غلہ و اجناس و بارود ت خراب ہو گیا اور ہزار ہا کا نقصان ہوا۔

۷۔ پینتیس لاکھ روپے پہلے مچھی بھون میں رکھے گئے تھے، پھر انھیں مچھی بھون سے ریذیڈنسی میں لے گئے۔

۸۔ ریذیڈنسی کے گرد جتنی کوٹھیاں تھیں ان کے ساتھ ساتھ دھس باندھ کر مثل قلعہ مستحکم کیا اور توپیں نصب کیں۔ جتنے مکانات سامنے تھے دُور تک مسمار کرا دیے اور درخت کٹوا دیے[1]

۳۰ مئی

اضلاع میں جگہ جگہ شورے اور ساز باز شروع ہو گئے تھے۔ آہستہ آہستہ معاملات معین صورت اختیار کرتے گئے۔ پہلے سے اطلاع مل گئی تھی کہ ۳۰۔ مئی کو رات کے نو بجے سرکشی کا آغاز ہوگا۔ انگریزی بیان مظہر ہے کہ ہنری لارنس کھانے پر بیٹھا اور نو بجے تو اُس نے پاس کے کسی آدمی سے مخاطب ہو کر کہا: "دیکھو بھئی تمھارے دست وقت کے پابند نہیں"۔ ادھر یہ کلمات اس کی زبان سے نکلے اُدھر سے بندوقوں کی آواز آنے لگی اور بنگلوں کو آگ لگنی شروع ہوئی۔

دیسی بیانات سے مترشح ہوتا ہے کہ ۳۰۔ مئی کی اطلاع پا کر گورا فوج اور پنجابیوں کو حکم ملا تھا کہ دفعتہً آلات و اسلحہ کے کوٹھوں پر ہلّہ بول دیا جائے تاکہ سپاہ بے دست و پا ہو جائے، لیکن تلنگے بر وقت خبردار ہو گئے۔ گویا یہ تدبیر ناکام رہی۔ اسی کشمکش میں اتفاقیہ گولی لگنے سے برگیڈیر ہینڈس کو مّ مارا گیا۔ پھر چھاؤنی میں ہر طرف پھیلے ہوئے بنگلوں کو آگ لگنی شروع ہوئی، ساتھ ہی عام ہنگامے شروع ہو گئے۔

معرکہ چنہٹ

لکھنؤ میں ہنگامے کا آغاز ہوتے ہی جگہ جگہ سے سرکشی کی خبریں آنے لگیں۔ مثلاً کان پور، فرخ آباد، روہیل کھنڈ، گورکھ پور، سیتا پور، بہرائچ، سلطان پور، فیض آباد

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۹۴ ؂ [2] HANDSCOMB

محمدی، ملیح آباد، کاکوری، غرض کوئی مقام ایسا نہ رہا جہاں کسی نہ کسی شکل میں نظم و نسق تہ و بالا نہ ہوا ہو۔ زیادہ اجتماع فیض آباد میں تھا۔ اب سرکش سپاہ میں یہ مشورہ ہونے لگا کہ کیا کرنا چاہیے۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ منتشر ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جانا چاہیے، لیکن زیادہ تر لوگوں خصوصاً افسروں کی رائے یہ تھی کہ:

کمر ہمت باندھ، بادشاہ ہندوستان کے ظل حمایت میں چل کر رہو
کہ مرگ انبوہ موجب عافیت و نیک نامی اور رانی حکومت و اختیار بھی باقی
رہے گا۔ پس اکثروں کی صلاح ٹھہری کہ دلی چلو۔[1]

دہلی جانے کا فیصلہ ہوا تو ساتھ ہی یہ طے ہو گیا کہ لکھنؤ ہوتے ہوئے جانا چاہیے اور اودھ کے تمام رئیسوں، راجاؤں وغیرہ کو اپنے ساتھ شریک کر لینا چاہیے۔

اس طرح یہ لوگ لکھنؤ کی جانب روانہ ہوئے تو ہنری لارنس کے مخبروں نے پہلے ہی اطلاع دے دی یہ سب اکٹھے نہیں آئے تھے بلکہ مختلف جماعتوں اور گروہوں میں آ رہے تھے۔ ہنری لارنس نے مناسب سمجھا کہ جو ابتدائی گروہ قریب پہنچ گیا ہے، اُسے شکست دے دینے سے دوسروں پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ چنانچہ اس نے ۳۰۔ جون کو دھاوا بولا۔ چنہٹ میں تلنگے بڑی مردانگی سے لڑے۔ انگریزوں کے لیے پسپائی کے سوا چارہ نہ رہا اور وہ کچھ توپیں بھی چھوڑ آئے۔ بس اس وقت سے بیلی گارد یا ریزیڈنسی کا محاصرہ شروع ہو گیا۔

محاصرے کی کیفیت محاصرے کی کیفیت یہ تھی کہ باہر سے حملے ہوتے، اندر سے شدید مقابلہ کیا جاتا۔ اکثر یہ ہوتا کہ تلنگے سرنگیں لگا کر استحکامات کے نیچے تک پہنچتے اور ان میں بارود بھر کر آگ لگاتے۔ بس اسی کشمکش میں مدت مدید گزر گئی۔ نہ تلنگے ریزیڈنسی کو خالی کراتے میں کامیاب ہو سکے اور نہ انگریز محاصرہ کو ختم کرا سکے۔ ریزیڈنسی

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۱۱

سے خبریں باہر بھی جا سکتی تھیں، اس لیے کہ جاسوس موجود تھے اور باہر سے خبریں آ بھی جاتی تھیں لیکن معاملہ اس سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ اس لیے کہ صورتِ حال میں تبدیلی باہر سے زبردست کمک آنے پر موقوف تھی اور فوری کمک کے آنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔

ہنری لارنس کام کی زیادتی اور محنت و مشقت کے تواتر کی وجہ سے بیمار ہو گیا تو اُس نے اپنے کام کاج کی دیکھ بھال کے لیے ایک کونسل بنا دی۔ دو تین روز کے بعد پھر کام خود سنبھال لیا۔

ہنری لارنس کی وفات

لارنس نے دفتری کام کے لیے ریزیڈنسی کی بالائی منزل میں ایک حصّہ مخصوص کر لیا تھا۔ وہاں پے در پے گولے آنے لگے تو اس کو مشورہ دیا گیا کہ زیادہ محفوظ مقام پر منتقل ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے یہ مشورہ قبول بھی کر لیا۔ ۲۔ جولائی کی صبح کو دفتر وہاں سے ہٹا لینے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ لارنس معمول کے مطابق صبح اٹھا اور چکر لگا کر واپس ہُوا تو بہت تھک گیا تھا۔ اس نے کہا کہ دو گھنٹے آرام کر لوں تو نئی جگہ منتقل ہوں گے۔ چنانچہ وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کے علاوہ تین آدمی کمرے میں موجود تھے، ایک اس کا بھتیجا جارج لارنس، دوسرا کپتان ولسن جو ایک رپورٹ سُنا رہا تھا، تیسرا پنکھاقلی۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے کا عمل ہو گا جب ایک گولہ سیدھا اس کمرے میں آ کر گرا۔ پھٹا تو ہر طرف دھواں پھیل گیا ولسن زمین پر گر پڑا اور چند لمحوں کے لیے ہوش و حواس بھی کھو بیٹھا۔ جب اُٹھا تو کمرے میں بدستور تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بلند آواز سے بولا "سر ہنری، آپ کو گزند تو نہیں پہنچا؟ دو مرتبہ کوئی جواب نہ ملا۔ تیسری مرتبہ ولسن پکارا تو ہنری لارنس نے کہا کہ "میں مارا گیا" دیکھا تو وہ مہلک طور پر زخمی ہو چکا تھا۔ اور جانبر ہونے کی بظاہر امید نہ تھی۔ اسے خواب آور دوائیں دیتے رہے تاکہ نیند آ جائے اور تکلیف کم ہو جائے۔ ۴۔ جولائی کی صبح کو وفات پائی۔

برجیس قدر کی مسند نشینی

تلنگوں نے آغازِ محاصرہ سے چند روز بعد سوچا کہ کسی کو حاکم تجویز کر لینا چاہیے۔ واجد علی شاہ کے صاحبزادوں میں سے رمضان علی

برجیس قدر کے حق میں فیصلہ ہوا اور ۵۔ جولائی کو اس کی مسند نشینی عمل میں آئی۔ برجیس قدر کی عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی لہٰذا اس کی والدہ حضرت محل کو نگران اور سرپرست بنایا گیا، علی محمد خاں عرف ممو خاں داروغہ حضرت محل مختار بن گیا۔ مولانا احمد اللہ شاہ ولاور جنگ فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے تھے۔ مجاہدین میں ممتاز ترین شخصیت انہی کی تھی۔ مقامی امراء میں سے راجا جے لال سنگھ نصرت جنگ نے بڑی ولاوری سے مجاہدینِ آزادی کا ساتھ دیا۔

اضلاع کی حالت | اب اضلاع کی حالت بھی اختصاراً سن لیں:

۱۔ سیتاپور: یہ مقام اودھ کے شمالی و مغربی ڈویژن کا مرکز تھا اور یہاں خاصی فوج رہتی تھی۔ ۲۷۔ مئی سے بنگلوں کو آگ لگانے کا سلسلہ جاری ہوا۔ یہ سرکشی کا کھلا ہوا نشان تھا۔ ۲۔ جون کو فوج نے آٹا لینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اس میں مذہب کو بگاڑنے والی چیزوں کی آمیزش ہے۔ بایں ہمہ اس وقت تک فوج کی حالت اچھی تھی۔ ۳۔ کی صبح کو وہ یکایک بگڑ گئی اور اپنے کرنیل کو قتل کر دیا اور انگریز بھی مارے گئے۔ کچھ بچ نکلے، کچھ چھپتے رہے بعد ازاں انھوں نے محفوظ مقامات پر پناہ لی۔

۲۔ فیض آباد: یہاں جاگیریں بہت زیادہ تعداد میں منبط کی گئی تھیں۔ اعظم گڑھ سے سرکش فوجیں آئیں تو حالات بہت بگڑ گئے۔ ۸۔ جون کو ہنگامہ بپا ہوا۔ افسروں کو کشتیوں میں بٹھا کر روانہ کر دیا گیا لیکن ان پر راستے میں حملے ہوئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ ہنگامے کے وقت یہیں قید تھے۔ سرکشی کے بعد قیدیوں کی رہائی عمل میں آئی تو مولانا نے لکھنؤ کا رخ کیا۔

۳۔ سلطانپور: ۹۔ جون کو ہنگامہ بپا ہوا۔ سید برکات احمد رسالدار کو پہلے سے حالات کا اندازہ تھا۔ اس نے ہر چند کرنیل فشر[1] سے کہا کہ آپ جہاں کہیں بہ حفاظت پہنچا دیا۔

---

[1] FISHER

جائے، سپاہ کی سرکشی کے بعد ہم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ فنشراس بات پر راضی نہ ہُوا اور مارا گیا۔ سپاہ لکھنؤ چلی گئی۔

۴۔ بہرائچ اور گونڈہ: ۹ جون کو سکرورہ میں سرکشی ہوئی۔ ۱۰ جون کو گونڈہ میں۔ اسی دن بہرائچ میں ہنگامہ بپا ہُوا۔ انگریزوں نے بلرام پور اور نانپارہ میں پناہ لی۔

اسی طرح دوسرے اضلاع میں ہنگامے شروع ہوے۔ جہاں پلٹنیں تھیں، آغاز اُن سے ہُوا۔ جہاں پلٹنیں نہیں تھیں، عوام نے انگریزوں کے لیے ٹھہرنے کی کوئی صورت نہ چھوڑی۔

باب ۹

انگریزوں کی تگ و دو

انگریزوں کے طور طریقے

اگرچہ حالات بڑے خلاف اور ناساز گار تھے لیکن انگریزوں کے طور طریقے بالکل نہ بدلے۔ وہ عوام کی دلداری، حق و انصاف کی پابندی اور جرم و بے جرمی میں امتیاز کے بجائے اس طرح کام کر رہے تھے گویا اس ملک میں جو لوگ بستے ہیں، وہ انسان نہیں۔ مثلاً لکھنؤ کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔

کرم خاں نادری بٹالین میں ایک صوبیدار تھا۔ ایک روز میر عباس تعلقدار اور ایک حوالدار نے کرم خاں سے کہا کہ تمھیں سرکشی میں کیوں تامل ہے؟ وہ بولا کہ ہمارا کوئی سرپرست نہیں۔ مبادا ملازمت جاتی رہے اور بدنامی حاصل ہو۔

اتفاق سے دو سپاہی بھی وہاں موجود تھے۔ کرم خاں کو خیال ہوا کہ ممکن ہے سپاہی یہ راز افسر سے کہہ دیں۔ اس نے پورا واقعہ ایک دوست کو سنا کر اس کی صلاح پوچھی، دوست نے مشورہ دیا کہ خود افسر کے پاس جا کر سب کچھ بتا دو۔ افسر نے کہا کہ کل صبح ہمارے جاسوس کو لے کر ان کے مکان پر چلے جانا۔

دوسرے دن کرم خاں انگریز افسر کے مقرر کیے ہوئے جاسوس کے ساتھ میر عباس کے مکان پر پہنچا۔ وہاں حوالدار کے علاوہ منشی رسول بخش کاکوروی اور ان کا بیٹا بھی بیٹھے تھے۔ اتفاق سے ہمسایے میں ایک ہندو کے مکان پر برات اتری ہوئی تھی اور وہاں اجتماع تھا۔ عین اسی وقت میر خلیل احمد میر باقر سوداگر سے ملنے کے لیے نکلے تاکہ اپنے بیٹے کا، جو کلکتہ میں تھا، حال پوچھ لیں۔ منشی رسول بخش کو بیٹھے دیکھا تو سستانے کی غرض سے ان کے پاس ٹھہر گئے۔

اس وقت انگریز افسر برقندازوں کو لے کر پہنچ گیا اور کل بائیس آدمی گرفتار کر کے ریزیڈنسی لے گیا۔ ان میں سے بعض کو پھانسی کی سزا ہوئی، باقی لوگوں کے پھانسی پا جانے میں کوئی شبہ نہ تھا، لیکن کرم خاں نے گواہی دی کہ یہ سب بے گناہ ہیں اور بڑی مشکل سے وہ رہا ہوئے میر خلیل احمد کو شہر سے نکل جانے کا حکم ہو گیا۔ وہ کربلائے معلےٰ چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ پھانسی پانے والوں میں منشی رسول بخش اور ان کا بیٹا بھی تھے[1]

ایک اور روایت منشی رسول بخش کے متعلق تذکرہ مشاہیر کاکوری کی روایت قیصر التواریخ سے مختلف ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ وہ منشی فیض بخش کے فرزند تھے اور منشی بے بدل مانے جاتے تھے۔ شاہ اودھ کے پاس ملازم رہے۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد انھوں نے برجیس قدر کی مسند نشینی کے لیے بہتر سے بہتر حکمت عملیاں کیں۔ تمام راجگان اودھ کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ یہ بھی فیصلہ ہو چکا تھا کہ لکھنؤ کے بجائے کاکوری مرکز حکومت ہو اور خود منشی صاحب وزیر اعظم بنیں۔ ریزیڈنٹ کو اطلاع ملی تو اُس نے بتاریخ ۲۴ شوال المکرم ۱۲۷۳ھ بروز چہار شنبہ (۱۷ جون ۱۸۵۷ء) منشی صاحب اور اُن کے فرزند حافظ عبد الصمد کو حضرت شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر سزائے موت دے دی اور وہیں انھیں دفن کرا دیا۔ بعد ازاں منشی رسول بخش کے دوسرے فرزند منشی عبد الحی عرشی نے ان کی میّت ٹیلے پر سے نکال کر کوٹھی تلہ کی مسجد کے روبرو دفن کی۔ نواب تفضل حسن خاں شیدا کاکوروی نے تاریخ وفات کہی:

عبد الصمد جناب و قبلہ رسول بخش تو ام ز حادثات قضا دند ہر دو رخت
تاریخ بست و چارم شوال وقت صبح روز چہار شنبہ بہم شد بلائے سخت
آمد دو بار سال ز شیدا بہ مصرعے
گفتہ ز بیں قضا و قدر، دو جگر دو لخت

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۰۶ - ۲۰۷ ؎

اس بیان کو درست ماننے میں تامل اس لیے ہے کہ مسلمہ طور پر برجیس قدر کی مسند نشینی ۵- جولائی ۱۸۵۷ء کو عمل میں آئی تھی- اور منشی رسول بخش اس سے اٹھارہ روز پیشتر پھانسی پا چکے تھے- صحیح یہ ہے کہ آخری وقت تک برجیس قدر کی فرمانروائی کا کسی کو خیال بھی نہ تھا- جب شاہی خاندان کا اور کوئی فرد نہ مل سکا تو برجیس قدر کا نام سامنے آیا- یقیناً قیصر التواریخ ہی کا بیان درست ہے، البتہ ان کے فرزند کا نام حافظ عبدالصمد کے بجائے غلطی سے میر عباس لکھ دیا۔

انگریزوں کی تگ و دو

اب ہمیں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ انگریزوں نے لکھنؤ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے کیا کیا تگ و دو کی۔

ہیوے لاک نے ۱۷- جولائی کو کان پور پر قبضہ کیا تھا اور ۱۹- جولائی کو بٹھور میں باجی راؤ ثانی کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجائی- تجویز یہ تھی کہ کان پور ہی کو مرکز بنا کر لکھنؤ کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ چنانچہ اس نے ۲۱- جولائی کو دریائے گنگا عبور کیا اور منگل وار پہنچا- ۲۹ جولائی کو وہاں سے چلا اور تین میل کا فاصلہ طے کر چکا تو معلوم ہوا کہ سامنے مجاہدین نے جا بجا چوکیاں قائم کر رکھی ہیں اور اناؤ پر وہ قابض ہیں۔ وہاں سخت لڑائی ہوئی- اناؤ سے آگے بڑھ کر بصیرت گنج پہنچا تو پھر مقابلہ پیش آیا۔

اب اسے یقین ہو گیا کہ آگے قدم قدم پر لڑنا ہو گا- وہ زخمیوں اور بیماروں کو ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا- پیچھے چھوڑتا تو ان کی حفاظت کے لیے فوج کے ایک حصے کو متعین کرنا پڑتا اور اتنی فوج اس کے پاس نہیں تھی کہ کان پور تک وسائل حمل و نقل کی حفاظت کے لیے جا بجا چھوڑتا جاتا- اس اثناء میں نانا نے رسالہ ہیوے لاک کے عقب میں بھیج دیا کہ وہ آگے بڑھے تو پیچھے سے اس کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے- غرض غور و فکر کے بعد ہیوے لاک کو اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ پیش قدمی کو ملتوی کر دے- چنانچہ ۳۰- جولائی کو وہ اناؤ واپس ہو گیا۔

۴- اگست کو اس نے دوبارہ پیش قدمی کی، لیکن بصیرت گنج پہنچ گیا تو اس کی فوج میں ہیضہ پھوٹ پڑا اور مستند اطلاعات کے مطابق لکھنؤ تک اس کے مقابلے میں تیس ہزار فوج تھی- گرد و پیش کے زمیندار بھی مخالفت پر تُلے بیٹھے تھے لٰہذا وہ پھر واپسی پر مجبور ہو گیا اور کان پور جا پہنچا۔

برگیڈیر نیل ۴ ۲- جولائی کو کان پور پہنچ گیا تھا - اس نے ہیوے لاک کی مراجعت کو شدید فوجی غلطی قرار دیا اور دونوں کے درمیان سخت کلامی ہوئی۔

ہمیں یہاں اس بحث میں نہ پڑنا چاہیے کہ دونوں میں سے سچا کون تھا اور صحیح رائے کس کی تھی۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ہیوے لاک نے واقعی نازک حالات میں مراجعت کی تھی، تاہم اس مراجعت کا عام اثر یہ ہُوا کہ وہ پیش نظر کام یعنی تسخیر لکھنؤ کو پورا کرنے کا اہل نہیں اور کسی دوسرے شخص کو یہ کام سونپنا چاہیے۔ چنانچہ اس کی جگہ میجر جنرل اَوٹ رم کو سپہ سالار بنا کر بھیج دیا گیا۔

آوٹ رم اور ہیوے لاک

آوٹ رم کان پور پہنچا تو اس نے ہیوے لاک کے بارے میں حکومت کے اس غیر مناسب حکم کی تلافی کر دی، جو اس بہت بوڑھے جرنیل کے خلاف اک گونہ ناپسندیدگی کا اظہار تھا۔ اس نے جو پہلا اعلان شائع کیا، اس میں ہیوے لاک اور اس کی فوج کی بے حد تعریف کی، ساتھ ہی کہہ دیا کہ ہیوے لاک بدستور لکھنؤ کی طرف پیش قدمی کرنے والی فوج کا کماندار رہے گا اور میں چیف کمشنر کی حیثیت میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔

چنانچہ عبور دریا کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پھر پیش قدمی شروع ہوئی۔ منگل وارہ، اناؤ اور بصیرت گنج میں لڑتے ہوئے ہیوے لاک اور آوٹ رم ۲۳- ستمبر کو عالم باغ پہنچ گئے، جو لکھنؤ سے صرف چار میل کے فاصلے پر تھا۔

۲۵- ستمبر کو عالم باغ سے پیش قدمی کا آغاز ہُوا۔ قدم قدم پر لڑائی جاری رہی۔ نیل بھی اس وقت ساتھ تھا۔ اس نے اپنی فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اس کے کئے پچیس آدمی پہلی ہی بار میں مارے گئے۔ بایں ہمہ اسی روز آوٹ رم اور ہیوے لاک ریزیڈنسی میں پہنچ گئے۔ بازاروں اور گلیوں میں مقابلہ بدستور جاری رہا۔ اسی کشمکش میں نیل مارا گیا، جس نے خدا جانے کتنے ہزار آدمیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا۔ آوٹ رم ریزیڈنسی پہنچ گیا۔ تاہم اس طرح

اصل صورت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، اس لیے کہ وہ نہ لکھنؤ کو فتح کر سکا اور نہ محصورین کو ریذیڈنسی سے نکال کر باہر بھیج سکا، بلکہ خود ان کے ساتھ ریذیڈنسی میں بند ہو گیا۔

کالن کیمبل

اب سپہ سالارِ اعظم کالن کیمبل نے لکھنؤ کی تسخیر کا فیصلہ کیا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ لکھنؤ کی طرف پیش قدمی سے پیشتر روہیل کھنڈ کو مسخر کر لینا چاہیے۔ اس کے برعکس گورنر جنرل چاہتا تھا کہ جلد سے جلد لکھنؤ فتح ہو۔ چنانچہ کیمبل ۹ نومبر کو کان پور سے نکلا اور ۱۲ نومبر کو عالم باغ پہنچ گیا۔ پھر لڑتا بھڑتا ۱۷ نومبر کو ریذیڈنسی میں داخل ہو گیا۔ وہ کان پور میں بہت تھوڑی فوج چھوڑ کر گیا تھا اور اندیشہ تھا کہ اس پر حملہ ہو جائے گا تو وہ مرکز ہاتھ سے نکل جائے گا جس پر نہ صرف لکھنؤ بلکہ روہیل کھنڈ، آگرہ اور وسط ہند کی حفاظت موقوف تھی، لہٰذا اس نے لکھنؤ کی تسخیر مکمل کرنے کا خیال ترک کیا اور مراجعت کا فیصلہ کر لیا۔ سواریوں کا مناسب انتظام کیا، سب محصورین کو ریذیڈنسی سے نکالا۔ آوٹ رم اور ہیوے لاک کو عالم باغ میں بٹھایا۔ عورتوں، بچوں اور زخمیوں کو لے کر وہ کان پور واپس ہو گیا۔

یوں لکھنؤ کو پھر اپنی تنظیمات مکمل کر لینے کی مہلت مل گئی۔ افسوس کہ اس مہلت سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھایا گیا۔

یہی زمانہ ہے جس میں تانتیا ٹوپے نے جمنا کو عبور کر کے کان پور پر شدید حملہ کیا تھا۔ اور انگریز سالار ونڈھم کے لیے بڑی پریشانیاں پیدا ہوئی تھیں۔ گیارہ روز تک لڑائی جاری رہی۔ اگر کالن کیمبل جلد لکھنؤ سے لوٹ نہ آتا تو کان پور یقیناً انگریزوں سے چھن جاتا۔

آخری یورش

ہر طرف سے مطمئن ہو کر فروری ۱۸۵۸ء میں پھر کالن کیمبل نے لکھنؤ پر پیش قدمی کی۔ اب انگریزوں کی یورش بہت بہتر تھی۔ اکثر مقامات مسخر ہو چکے تھے۔ زیادہ سے زیادہ فوج فارغ ہو چکی تھی۔ بایں ہمہ لکھنؤ میں بڑی سخت لڑائیاں ہوئیں۔ مولانا احمد اللہ شاہ وہاں موجود تھے۔ جنرل بخت خاں دہلی سے نکل کر لکھنؤ پہنچ گیا تھا۔ شہزادہ فیروز شاہ اور نانا صاحب بھی رہیں تھے۔ لکھنؤ کے ایک ایک مقام پر انگریزی فوج آہستہ آہستہ قابض ہوتی

رہی۔ ۱۱ مارچ کو ہوڈسن مارا گیا، جس نے دہلی میں شہزادوں کو انتہائی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ مسلسل مقابلے کے بعد بالآخر ۲۱۔ مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ مسخر ہو گیا۔

بعض حیرت انگیز واقعات شہر کے بعض طبقے اور فوجی کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکے، لیکن بعض طبقوں اور لیڈروں نے ایسی جوانمردی دکھائی جو ہمیشہ تحسین سے یاد کی جائے گی، مثلاً مولانا احمد اللہ شاہ کی جانبازی یا حبشی عورتوں کی قربانیاں، یہ عورتیں بیگمات کی نوکرانیاں تھیں، جب نازک وقت آیا تو ہتھیار سنبھال کر کھڑی ہو گئیں۔ اور ایک ایک نے لڑتے لڑتے جان دی۔ یہ واقعہ سکندر باغ میں پیش آیا۔ گارڈن الیگزانڈر نے لکھا ہے کہ وہ شیرنیوں کی طرح لڑیں اور جب تک مر نہ گئیں، یہ خیال بھی نہ تھا کہ وہ عورتیں ہیں۔

ایک بڑھیا نے جس کے جسم پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں لوہے کے پل کے پاس پھٹی پرانی چندیاں جمع کر لی تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مر گئی ہے۔ اس کے پاس ہی روئی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا جسے اس نے بتی کی شکل میں بٹ لیا تھا اور اس کا کچھ حصہ جل چکا تھا۔ پاس ہی چھپا ہوا بانس ملا، جس میں وہ توڑا لگا ہوا تھا جسے بارود بھری سرنگیں اڑانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور سرنگ بھی قریب ہی تھی۔ گویا وہ بڑھیا توڑے کو آگ دے کر سرنگ اڑانا چاہتی تھی، لیکن اپنا کام پورا کرنے سے پیشتر ہی خود جاں بحق ہو گئی۔

لکھنؤ نے اگر نزاکت اور راحت طلبی میں انتہائی درجہ حاصل کیا تو اس کے ایثار و قربانی کی مثالیں بھی ہر جگہ نہیں مل سکتیں۔

بعد کی لڑائیاں حضرت محل برجیس قدر کو لے کر آخری وقت میں لکھنؤ سے نکلیں، شہزادہ فیروز شاہ، نانا صاحب اور جنرل بخت خاں کو بھی نکل ہی جانا پڑا۔ مولانا احمد اللہ شاہ سب سے آخر میں نکلے۔ ان مجاہدینِ آزادی نے بعد میں بھی مسلسل جنگ جاری رکھی۔ مولانا احمد اللہ شاہ، شاہ جہاں پور پر حملہ آور ہوئے اور انگریزوں کے لیے شدید تشویش پیدا کر دی۔ وہاں سے پسپا ہونا پڑا تو محمدی میں جا بیٹھے۔ راجا پوائیں کو پیغام بھیجا کہ ساتھ ہو جاؤ۔ اس نے بات چیت کے

لیے مولانا کو پوائیں بلایا اور دھوکے سے شہید کر ڈالا نانا صاحب، حضرت محل اور بخت خاں جا بجا لڑتے رہے۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں وہ نیپال چلے گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ نے وسط ہند کا رُخ کیا۔ ملک کے بعض دوسرے حصّوں کی طرح اودھ میں بھی انگریزی حکومت بحال ہو گئی۔

گیر و دار

انگریزوں نے معمول کے مطابق اودھ میں بھی گیر و دار کا لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا۔ بہت سے لوگوں کو کالے پانی بھیجا گیا۔ ان میں مولانا سرفراز علی جون پوری اور مولانا لیاقت علی الہ آبادی بھی تھے جو نیپال کی طرف سے گرفتار ہو کر آئے تھے۔ نواب ممو خاں کو بھی کالے پانی کی سزا ملی اور وہ وہاں سے سرانک جا کر جاں بحق ہوا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی دہلی کی تسخیر کے بعد اودھ چلے گئے تھے کچھ مدت روپوش رہے۔ جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلان عفوِ عام ہوا تو وہ اپنے وطن خیر آباد میں پہنچ گئے۔ وہاں سے انھیں پکڑ کر لکھنؤ لے گئے، مقدمہ چلایا اور حبس دوام بر عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ انھوں نے انڈمان ہی میں وفات پائی۔

راجا بینی مادھو بخش میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ راجا جے لال سنگھ نصرت جنگ کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ موصوف کو قید میں اتنی تکلیفیں پہنچی تھیں کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گئے تھے۔ یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پھانسی کے لیے لائے، تو انھوں نے اپنے ہاتھ سے رسا گلے میں ڈال لیا۔ موت کے بعد صرف ڈیڑھ روپے کا کفن دے کر انھیں پھانسی ہی کی جگہ سپرد خاک کر دیا گیا۔

ان کے علاوہ ہزاروں آدمیوں کو موت، کالے پانی اور ضبطی جائداد کی سزائیں دی گئیں

بنگال، بہار اور اڑیسہ

باب ۱

نقشہ انتظامات

نظامت

انگریزوں کے تصرف و تسلط سے پیشتر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی ایک نظامت تھی جس کا مرکز مرشد آباد تھا۔ علی وردی خاں کے بعد اس کا نواسا سراج الدولہ مسند نظامت پر بیٹھا۔ میر جعفر نے انگریزوں سے ساز باز کر کے اپنی نظامت کا راستہ ہموار کیا اور غریب سراج الدولہ میر جعفر کے بیٹے میرن کے ہاتھ سے مارا گیا۔ میر جعفر کو بھی انگریزی اغراض کا بازیچہ بن کر بڑی ذلتیں اٹھانی پڑیں اور نظامت جس اعزاز و اکرام کا وثیقہ تھی، وہ اسے کبھی نصیب نہ ہوا۔ یہی تین صوبے تھے، جن کی دیوانی کی سند کلائو نے شاہ عالم ثانی سے حاصل کی تھی اور بادشاہ کی خدمت میں چھبیس لاکھ روپے سالانہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ بالآخر انگریزوں نے آہستہ آہستہ قدم جما کر میر جعفر کے خاندان کو بھی ہر اختیار سے محروم کر دیا۔ بادشاہ دہلی کی سیادت و برتری بھی ختم کی۔ بیس لاکھ روپے سالانہ کی رقم بھی ہضم کر گئے اور خود ان صوبوں کے مالک و مختار بن گئے جن کی زرخیزی ایک بڑی سلطنت کے مصارف جاہ و جلال کی متحمل ہو سکتی تھی۔

انتظامی تقسیم

انگریزوں نے انتظامی لحاظ سے ان صوبوں کو گیارہ ڈویژنوں یا کمشنریوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ جن کے نام مع تفصیل اضلاع ذیل میں درج ہیں۔

نمبر شمار	کمشنری یا ڈویژن	اضلاع
۱۔	اُڑیسہ	کٹک، پوری اور بالیشور۔
۲۔	بردوان یا مغربی بنگال	بردوان، بانکوڑہ، بیربھوم، ہوگلی، ہوڑہ اور میدناپور۔
۳۔	پریذیڈنسی یا کلکتہ	کلکتہ، چوبیس پرگنہ، ندیا، کھلنا اور جیسور
۴۔	راج شاہی	راج شاہی، رنگ پور، بوگرا، پنبا، مالدہ، دیناج پور اور مرشد آباد۔
۵۔	ڈھاکہ	ڈھاکہ، فرید پور، باقر گنج، میمن سنگھ، سلہٹ اور کچھار۔
۶۔	چاٹگام	چاٹگام، نواکھالی، پٹرہ اور پہاڑی علاقے۔
۷۔	دارجیلنگ	دارجیلنگ، جلپاگوڑی، اور کوچ بہار۔
۸۔	آسام	گوالپاڑہ، کامروپ (گوہٹی)، دورنگ، نوگاؤں سب ساگر، لکھیم پور اور پہاڑی علاقے (کھاسیا، گارو، جینتا اور ناگا)
۹۔	مشرقی بہار	مونگیر، بھاگل پور، پورنیا اور سنتھال پرگنہ۔
۱۰۔	مغربی بہار	پٹنہ، گیا، شاہ آباد، سارن، چمپارن اور ترہٹ (مظفر پور۔)
۱۱۔	چھوٹا ناگ پور	لوہارڈاگہ، ہزاری باغ، سنگھ بھوم، مان بھوم اور متفرق علاقے۔

ردوبدل یہ گیارہ کمشنریاں، ایک حاکم کے ماتحت تھیں، جسے لفٹنٹ گورنر کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں اس انتظام میں کئی ردوبدل ہوئے۔ مثلاً کرزن نے دو صوبے بنائے جنھیں مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کہا جاتا تھا۔ ایک کا دارالحکومت ڈھاکہ مقرر کیا اور دوسرے کا کلکتہ رہا۔ یہ تقسیم بنگالیوں کے دہشت انگیزی کے دباؤ سے ۱۹۱۱ء میں

منسوخ ہوئی اور بہار و اڑیسہ نیز آسام کو الگ کیا گیا جس میں سلہٹ اور کچھار بھی شامل کر دیے گئے۔ ۱۹۳۵ء میں بہار اور اڑیسہ الگ الگ ہوتے۔ ۱۹۴۷ء میں پھر تقسیم کا عمل جاری ہوا اور مشرقی بنگال میں سلہٹ کو شامل کیا گیا اور اس صوبے کا نام مشرقی پاکستان قرار پایا۔ آسام، بہار اور اڑیسہ بدستور الگ الگ صوبے رہے۔ اب ان تمام صوبوں کے حاکموں کو گورنر کہتے ہیں۔

ہم اس وقت ۱۸۵۷ء کے حالات بیان کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اسی زمانے کی انتظامی تقسیم کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ حالات کے سمجھنے میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔ یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ اڑیسہ ۱۸۵۷ء میں کاملاً پرسکون رہا۔ لہٰذا اس کا ذکر نہیں آئے گا۔

باب ۲

کلکتہ کے لیل و نہار

ابتدائی دور

میرٹھ کے ہنگامے کی اطلاع کلکتہ پہنچی تو عام لوگوں، خصوصاً یورپی گروہوں میں بڑی تشویش پھیلی۔ تاہم ذمہ دارانِ نظم و نسق اس ہنگامے کو محض ایک مقامی معاملہ سمجھتے تھے اور انھیں یہ خیال نہ تھا کہ آگ کے شعلے جگہ جگہ بھڑک اٹھیں گے۔ دہلی مجاہدینِ آزادی کا مرکز بن گیا تو اس وقت بھی یہی رائے تھی کہ تھوڑے دنوں میں وہاں انگریزی اقتدار بحال ہو جائے گا۔ یہ تصور اس امر کا نتیجہ تھا کہ اہلِ ملک کی ناراضی کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا گیا تھا۔

کلکتہ کی فرنگی جماعتوں اور افراد نے اپنی خدمات حکومت کے سامنے پیش کیں تو محکمہ داخلہ کے سیکرٹری سیسل بیڈن[1] نے سب کو تسلی دی کہ کلکتہ سے باہر چھ سو میل تک کامل امن و سکون ہے۔ جو فتنہ ایک بے بنیاد ہراس کا باعث بنا تھا، اسے دبا دیا گیا ہے اور امید ہے کہ چند روز میں پوری ریزیڈنسی کے اندر امن بحال ہو جائے گا۔

ہنگامے کی توسیع

جب صوبہ غرب و شمال اور مختلف شہروں نیز بعض دوسرے مقامات سے بھی ہنگامے کی خبریں پہنچیں تو اس وقت بھی یہی خیال تھا کہ دہلی جلد فتح ہو جائے گا اور وہاں سے فوجیں فارغ ہوں گی تو تھوڑے ہی دنوں میں عام امن پیدا کر دیں گی، لیکن جب معلوم ہوا کہ دہلی جلد پہنچنا اور اسے مسخر کر لینا اتنا سہل نہیں جتنا کہ ابتدا میں سمجھا گیا تھا، نیز لکھنؤ، کانپور، آگرہ جیسے اہم مقامات میں خطرناک صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا تو البتہ تشویش بڑھی اور گورنر جنرل کو احساس ہوا کہ حفاظت

---

[1] CECIL BEADEN [2] میلی سن جلد سوم صفحہ ۱۔

لے لیے مؤثر تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔ چنانچہ اس نے رضا کاروں کی فوج بھرتی کر لینے کی اجازت دے دی تاکہ ضرورت پیش آنے پر وہ دارالحکومت خصوصاً اس کی فرنگی آبادی کے تحفظ کا فرض انجام دے سکیں۔

تشویش کے بنیادی اسباب تشویش کے بنیادی اسباب متعدد تھے، جن میں سے ہم یہاں صرف چند کا ذکر کریں گے۔ مثلاً

۱۔ بارک پور میں دیسی فوج موجود تھی اور وہ کسی وقت بھی اطاعت کا جوا پھینک کر کلکتہ کے لیے انتہائی خطرہ پیدا کر سکتی تھی۔

۲۔ کہا جاتا تھا کہ شاہ اودھ کے ساتھ مسلح آدمیوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ وہ بھی ہر ہنگامے کا ساتھ دینے کے لیے ہمہ تن تیار ہو سکتے تھے۔

۳۔ بعض معزول امیران سندھ ڈم ڈم میں رہتے تھے، ان کے ساتھ بھی مسلح آدمیوں کی ایک جماعت موجود تھی

۴۔ تشویش کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ کلکتہ کی چھ لاکھ آبادی میں سے اس وقت کم و بیش نصف آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی اور مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کو شدید بے اعتمادی تھی۔

۱۴۔ جون فرنگیوں کی حالت عجیب تھی۔ ایک طرف تو ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ آگے بڑھ بڑھ کر رضا کارانہ طریق پر خدمات پیش کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ خطرے کی روک تھام کے لیے ان سے کام لیا جائے۔ دوسری طرف وہ اوہام و وساوس کی بنا پر یکسر ہراس تھے۔

۱۴۔ جون کو اتوار تھا۔ فرنگی لوگ معمول کے مطابق دعا کے لیے گرجوں میں گئے۔ فورٹ ولیم کے قریب جو گرجا تھا اس میں بیٹھے ہوئے فرنگیوں نے ایسی آوازیں سنیں جیسے بھاری سامان باہر نکالا جا رہا ہو۔ ایک شخص نے حکومت کے سیکرٹری سے تفصیل پوچھی،

لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ چار بجے خبر ملی کہ بارک پور کی سپاہ نے سرکشی اختیار کرلی ہے اور وہ کلکتہ کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔

ہمہ گیر اضطراب و ہراس بس یہ سنتے ہی کلکتہ کے فرنگیوں میں ہمہ گیر اضطراب و ہراس چھا گیا۔ ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ بارک پور کی فوج کلکتہ پہنچنے والی ہے۔ اور شاہ اودھ کی مسلح فوج نے لوٹ مار شروع کر دی ہے حکومت کے سیکرٹری دوڑے دوڑے کونسل کے ممبروں کے پاس پہنچے۔ پھر پستول بھرے اور گھروں کے دروازے خوب بند کر لیے۔ کونسل کے ممبروں نے اپنے بال بچوں کو ساتھ لیا، گھر چھوڑے اور جہازوں پر سوار ہو گئے۔ ان سے کمتر درجے کے آدمیوں نے یہ حالت دیکھی تو اپنی قیمتی اشیاء سمیٹیں اور قلعے کی طرف بھاگے کہ وہاں توپوں کی حفاظت میں اطمینان کا سانس لیں۔

> گھوڑے، گاڑیاں، پالکیاں اور ہر قسم کی سواریاں منگوالی گئیں تاکہ ہراس زدہ بھگوڑوں کو خیالی قاتلوں کی دست برد سے باہر پہنچادیں۔ مضافات میں عیسائیوں کا ہر مکان خالی ہو گیا۔ اس وقت نصف درجن مذہبی دیوانے بھی موجود ہوتے تو کلکتہ کے تین چوتھائی مکانوں کو آگ لگا دیتے۔ لنڈن کے بیس چور بھی موقع پر پہنچ جاتے تو چورنگی کے آس پاس گھروں کو لوٹ کر عمر بھر کی روٹیاں فراہم کر لیتے جو بالکل خالی ہو چکے تھے[1]

ہتھیار لے لیے گئے یہ حالات دیکھ کر چنسرا سے گماگھرا پلٹن منگوائی گئی۔ بس اس کے پہنچتے ہی بارک پور کی دیسی سپاہ کو شام کے چار بجے

---

[1] میلی سن جلد سوم صفحہ ۱۶ - ۱۷

پریڈ کا حکم دے دیا گیا۔ ان کے ہر طرف گورے بندوقیں سنبھالے اور توپیں لگائے کھڑے تھے تاکہ اشارہ ہوتے ہی آگ کا مینہ برسا دیں۔ پھر حکم دیا گیا کہ تمام دیسی سپاہی ہتھیار رکھ دیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ سرکشی کا واقعی فیصلہ کر چکے تھے۔ لیکن مناسب موقع کے انتظار میں رُکے ہوئے تھے۔ اس پر واضح ہو گیا کہ وہ ہتھیار رکھنے میں تامل کریں گے تو یقینی طور پر موت کے گھاٹ اتار دیے جائیں گے۔ اس کے بعد حکم مان لینے کے سوا چارہ نہ تھا اور انھوں نے چپ چاپ ہتھیار ڈال دیے۔

شاہ اودھ کی نظر بندی

اب شاہ اودھ کی طرف توجہ منعطف ہوئی جس کے پاس عام افواہ کے مطابق خاصی بڑی اسلحہ بند جماعت موجود تھی غور و فکر کے بعد مناسب سمجھا گیا کہ بادشاہ کو نظر بند کر لیا جائے۔ اس طرح اسلحہ بند سپاہی اپنے محبوب لیڈر کی قیادت سے محروم ہو جائیں گے اور کچھ نہیں کر سکیں گے۔

چنانچہ ۱۵۔ جون کو محکمہ خارجہ کا سیکرٹری ایڈمنسٹن[1] گوروں کے ایک جیش کے ساتھ شاہ اودھ کے پاس پہنچا۔ سیاسی مجبوریوں کا ذکر کیا۔ یہ بھی بتایا کہ مختلف سازشی اس کا نام نامناسب اغراض کے لیے استعمال کر رہے ہیں، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ شاہ عارضی طور پر قلعے میں گورنر جنرل کے ساتھ قیام کرے۔

شاہ نے اس پر سخت احتجاج کیا اور بزور کہا کہ میں نے قولاً یا عملاً آج تک کسی سرکش کی حوصلہ افزائی نہیں کی، بایں ہمہ میں گورنر جنرل کی خواہش کے مطابق ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہوں۔ وزیر علی نقی خاں اور چند امراء کو شاہ کی مصاحبت کے لیے منتخب کر لیا گیا۔

دیسی اور انگریزی اخبارات

اب اس سلسلے کی صرف ایک چیز رہ گئی اور وہ دیسی اور انگریزی اخبارات کی روش تھی، جس کی بنا پر انھیں پابند

---

[1] ADMONSTONE

کر دینا ضروری سمجھا گیا۔

ظاہر ہے کہ دونوں طبقوں کے اخباروں کی روش اور معاملات پر غور و فکر یا بحث و نظر کی حیثیت ایک نہیں ہو سکتی تھی۔ انگریز اخبار نویسوں کی ذہنیت یہ تھی کہ ملک انگریزوں کا مقبوضہ ہے اور اس میں حکومت کے خلاف ذرا سی بھی کوئی حرکت ہو تو شور مچانا چاہیے کہ عوام کو خوب دباؤ، خوب سختیاں کرو تاکہ کسی کو پھر ایسی حرکت کا حوصلہ نہ ہو۔ دیسی اخبار نویس اس ذہنیت کے ہو ہی نہ سکتے تھے۔ وہ ہر قسم کی خبریں درج کرتے تھے لیکن ان پر تبصرے کا وہ انداز نہیں کر سکتے تھے جو انگریزوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ جب ہنگامہ جا بجا پھیل گیا تو دیسی اخبار نویس تبصروں میں اور زیادہ محتاط ہو گئے۔ آخر انھیں کیا ضرورت پڑی تھی کہ اہل وطن کو انگریزی اقتدار کی قربانگاہ پر ذبح کرانے میں ویسی ہی سرگرمی کا اظہار کریں جیسی انگریز دکھا رہے تھے۔ بلکہ بعض بیانات سے مترشح ہوتا ہے کہ دیسی اخباروں کا رویہ خاصا اشتعال انگیز ہو گیا تھا۔

پابندیاں

۱۲ جون کو گورنر جنرل خود لیجسلیٹو کونسل میں گیا اور دیسی اخباروں کے خلاف اس نے سخت تقریر کرتے ہوتے پابندیوں کا ضابطہ منظور کرا لیا، جس کے متعلق میلی سن کا بیان ہے کہ نپولین سوم نے اپنے عہدِ حکومت کے تاریک ترین دور میں فرانسیسی جرائد پر جو پابندیاں عائد کی تھیں، وہ بھی زیرِ غور ضابطے کے مقابلے میں ہلکی اور سہل تھیں[1]۔

یہ پابندیاں صرف دیسی اخباروں تک محدود نہ رہیں، بلکہ انگریزی جرائد پر بھی یکساں عائد کی گئیں۔ اس پر فرنگیوں میں شدید غم و غصہ پیدا ہوا۔ گورنر جنرل نے جواب دیا کہ میں نے دیسی اخباروں کے بارے میں اپنی رائے صاف صاف ظاہر کر دی اور انگریزی اخباروں کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ ان کی وفاداری اور دانشمندی پر بھی مجھے اعتبار ہے۔ تاہم میرے لئے کوئی حدِ فاصل تجویز کرنا ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انگریزی اخباروں کی تحریرات انگریز قارئین کے لیے بالکل بے ضرر ہوں، مگر اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ دیسی اخبار انھیں

---

[1] میلی سن جلد سوم صفحہ ۳۔

بالکل دوسری شکل میں پیش نہ کریں گے جس سے دلیسیوں میں غلط تاثرات پیدا ہوں۔

خوش فہمیاں

انگریزوں کی خوش فہمیوں کا یہ عالم تھا کہ معمولی سی خبر بھی پہنچتی تھی تو اسے مبالغہ آمیز تصورات کے ذریعے سے کچھ کا کچھ بنا لیتے تھے۔ مثلاً اطلاع ملی کہ ۸ جون کو دہلی میں باغیوں نے شکست کھائی۔ بس یہ سنتے سمجھ لیا گیا کہ دہلی فتح ہو چکا ہوگا۔ گورنر جنرل نے ۱۰ جون کو سپہ سالار دہلی کے نام ہدایت نامہ بھیج دیا کہ جتنی انگریزی فوج کو آگرہ، کان پور وغیرہ کی طرف بھیج سکو، بے تامل بھیج دو۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ انگریزی فوج نے دہلی پر نہیں بلکہ صرف چھاؤنی پر قبضہ کیا تھا۔ وہاں بیٹھ جانے کے بعد محاصرے کا آغاز ہونے والا تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ محاصرے میں کتنا وقت لگے گا۔ لہٰذا جو فوج سپہ سالار کے پاس تھی، اس کے کسی حصے کو باہر بھیجنے کا تو سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس خود اسے کمک کی ضرورت تھی۔

جلپا گوڑی

اب اضلاع کی کیفیت بھی اجمالاً سن لینی چاہیے۔ ایک حبش جلپا گوڑی میں مقیم تھا کرنیل شیرر[1] اس کا کماندار تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ فوج میں بخت وپز ہو رہی ہے تو خفیہ اطلاعات کی بناء پر رجمنٹ میں سے چار آدمی چن لیے، جنھیں پوری تحریک کے لیڈر قرار دیا گیا اور واقعی انھیں فوج میں سب سے زیادہ اثر و رسوخ حاصل تھا۔ کچھ معلوم نہیں کہ تحقیقات کس بنا پر ہوئی اور ان کا قصور کس حد تک ثابت ہوا۔ شیرر نے انھیں موت کی سزا کا مستوجب ٹھہرایا اور منظوری حاصل کرنے کے لیے پریذیڈنسی ڈویژن کے میجر جنرل کو لکھا۔ وہاں سمجھا گیا کہ سزا سخت ہے اور حکم بھیجا گیا کہ ان آدمیوں کو ملازمت سے موقوف کر دیا جائے۔ جانتے ہو شیرر نے کیا کیا؟ چاروں کو توپوں کے منہ سے باندھ کر اڑوا دیا اور اوپر لکھ بھیجا کہ چاروں مجرموں کو چار بھری ہوئی توپوں کے ذریعے سے "موقوف" کر دیا گیا ہے۔[2]

---

[1] SHERER

[2] میلی سن جلد سوم صفحہ ۹۲۔

چاٹگام ۱۸۔ نومبر کو چاٹگام[1] میں ہنگامہ برپا ہوا۔ فوج نے خزانہ لوٹا۔ جیل خانہ توڑا۔ قیدی چھڑا لیے۔ بارکوں کو آگ لگائی۔ میگزین جلایا اور وہاں سے روانہ ہو گئی۔ تین ہاتھی بھی ساتھ لے گئی، جو سرکاری مال تھے لیکن کسی انگریز کو ضرر نہ پہنچایا۔ البتہ جیل خانے کے ایک دیسی کارکن نے انھیں روکنا چاہا تھا، اُسے قتل کر دیا۔ پھر وہ لوگ ٹپرہ کی طرف چلے گئے۔ سیتا کنڈ پہنچ کر شاہراہ چھوڑی اور پہاڑیوں میں جا بیٹھے[2]۔

ڈھاکہ ڈھاکہ میں، جو فوج تھی، ۲۲۔ نومبر کو اس سے ہتھیار لینے کا فیصلہ ہوا۔ ایک ٹولی سے ہتھیار لے لیے لیکن باقی فوج توپیں سنبھال کر کھڑی ہو گئی اور لڑائی ہوئی۔ ان میں سے اکتالیس موقع پر مقتول ہوئے، آٹھ سخت زخمی ہوئے اور راستے سے اٹھا کر لائے گئے۔ تین دریا میں ڈوب لیے یا وہاں گولی سے مارے گئے۔ انگریزی فوج کو بھی خاصا نقصان پہنچا۔ باقی جلپاگوڑی کی طرف چلے پھر راستے میں روکا گیا، تو وہ بھوٹان میں داخل ہو گئے[3]۔

رنگ پور کے کلکٹر کو جب معلوم ہوا کہ خزانے پر حملے کا امکان ہے تو اس نے سارا روپیہ ہاتھیوں پر لاد کر جنگل میں پہنچا دیا اور وہاں ایسی جگہ دفن کرایا کہ کسی کو خبر نہ لگ سکے باقی اضلاع بنگال میں امن رہا۔

کلکتہ کی اہمیت کلکتہ اس زمانے میں بڑا اہم مقام تھا۔ فورٹ ولیم میں ہر قسم کا سامان جنگ بہ کثرت موجود تھا۔ چند میل پر کاشی پور میں توپیں ڈھالنے کا کارخانہ تھا۔ مزید تھوڑے فاصلے پر بارود سازی کا مرکز تھا۔ ڈم ڈم میں توپیں چلانا سکھایا جاتا تھا۔ چورنگی سے ذرا آگے علی پور جیل تھی۔ قریب ہی کپڑے اور وردیاں

---

[1] اس کے متعدد نام اور مختلف املا ہیں۔ مثلاً چاٹگام۔ چٹ گاؤں، چترا گاؤں، اسلام آباد، چٹاگانگ۔
[2] میلی سن جلد چہارم صفحہ: ۲۹۲ [3] ایضاً صفحہ: ۲۹۳۔

کے سٹور تھے۔ پھر کہیں ٹکسال تھی، کہیں خزانہ تھا۔ بے شمار بنک تھے۔ اعلیٰ درجے کی تجارتی دکانیں تھیں۔ بڑے بڑے سیٹھ تھے۔ غرض اس ایک شہر پر قبضہ کر لینے کے بعد زبردست جنگ لے لیے ہر قسم کا سامان بکثرت ہاتھ آسکتا تھا۔

انگریزوں کے نقطہ نگاہ سے بنگال کی اہمیت کے اور پہلو بھی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں ان کے داخلے کا اصل دروازہ بنگال تھا اور کلکتہ بنگال کا دروازہ تھا۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ اگر دہلی چھن جاتا، اودھ میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھتی، مشرقی اور مغربی بہار یا جلپاگوڑی اور بارک پور شعلوں کی نذر ہو جاتے تو پرواہ نہ تھی۔ جب کلکتہ باقی تھا آخری کامیابی کی امید باقی تھی اور یہ امید یقین کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔

یہی مرکز تھا جہاں سے برابر فوجیں اور سازوسامان جابجا بھیجا جاتا رہا۔

باب ۴

مشرقی اور مغربی بہار

سنتھال پرگنہ بہار میں سب سے پہلا شعلہ سنتھال پرگنے میں بھڑکا جو بنگال کے اضلاع میں سے بردوان، بیر بھوم مرشد آباد اور مالدہ کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہاں ایک چھاؤنی روہنی میں تھی۔ میجر میکڈانلڈ وہاں کا کمانڈر تھا۔ وہ ۱۲۔ جون کو شام کے وقت اپنے بنگلے کے سامنے دو دوستوں کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ ایک دوست اٹھ کر بنگلے میں جانے لگا تو دیکھا کہ تین آدمی دبے پاؤں چلے آرہے ہیں۔ پھر اچانک انھوں نے تلواریں کھینچیں اور انگریزوں پر جا پڑے۔ ایک مارا گیا، دو سخت زخمی ہوئے۔ پھر وہ لوگ بھاگ گئے۔ کسی کو پتہ نہ لگ سکا کہ کون تھے۔

چند روز بعد ایک سوار نے بتایا کہ تینوں فوجی تھے۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا تجویز ہوئی۔ لیکن جانتے ہو انھیں کس طریقے پر سزا دی گئی؟ وہی طریقہ جسے الٰہ آباد کے سلسلے میں انگریزوں نے "لطیف فنی طریقہ" قرار دیا تھا۔ یعنی درخت کے ساتھ رسّا باندھنا، مجرم کو ہاتھی پر بٹھا کر رسّا گلے میں ڈالنا اور ہاتھی کو چلا دینا۔

دانا پور اور سگولی مغربی بہار میں فوج کے مرکز دو تھے۔ ایک دانا پور جو پٹنہ سے دس میل پر تھا، دوسرا سگولی جو ضلع چمپارن میں موتی ہاری سے بھی آگے سرحد کے قریب تھا۔ دانا پور میں فوج کا ڈویژن رہتا تھا اور اس کا کمانڈر میجر جنرل لائڈ تھا۔ اس کا حلقۂ عمل بہت وسیع تھا۔ سگولی میں صرف ایک جیش رہتا تھا جس کا افسر میجر ہومز تھا۔

ولیم ٹیلر

ولیم ٹیلر پٹنہ کا کمشنر تھا۔ وہ انتقامی اور کینہ ور طبیعت کا آدمی تھا۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ کسی بھی دیسی آدمی کو سزا دینے کا موقع ملے گا تو حتی الامکان کسر نہ اٹھا رکھے گا۔ ۷ جون کو اطلاع ملی کہ دانا پور کی دیسی فوج میں شاید بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ ٹیلر نے اپنے مکان میں تمام انگریزوں کے لیے قیام کا بندوبست کیا اور خود جاکر یا آدمی بھیج بھیج کر سب کو بلا لیا۔ سکھوں کا ایک جیش بھرتی کیا گیا تھا اور وہ پٹنہ سے چالیس میل پر تھا۔ ٹیلر نے ۵ جون کو تاکیدی پیغام بھیج دیا تھا کہ وہ جیش جلد سے جلد پٹنہ پہنچ جائے۔ ۷ کو وہ لوگ بھی پہنچ گئے، اس طرح سمجھ لیا گیا کہ پٹنہ بالکل محفوظ ہوگیا۔

لائڈ، ٹیلر اور حکومت

میجر جنرل لائیڈ سے کہا گیا کہ وہ دیسی سپاہ سے ہتھیار رکھوا لے۔ اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے اپنی سپاہ پر پورا اعتماد ہے۔ حکومت میجر لائڈ کے طرزِ عمل کو بالکل درست سمجھتی تھی اور اسی کی حمایت کرتی تھی ٹیلر کی ہراس زدگی کے بارے میں کسی کی بھی رائے اچھی نہ تھی۔

یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ سکھوں کے جیش پر ہر طرف سے طعنوں کے تیر برستے تھے۔ وہ لوگ جہاں جہاں سے گزرے عوام نے انھیں مذہب سے مرتد بنایا۔ پٹنہ میں سکھوں کا ایک بہت بڑا گوردوارہ تھا۔ جب ان سپاہیوں نے گوردوارہ میں داخل ہونا چاہا تو مہنت نے انھیں داخلے کی اجازت نہ دی۔[1]

گرفتاریاں اور نظر بندیاں

ٹیلر چین سے بیٹھنے والا آدمی نہ تھا۔ ۱۹ جون کو اسے یقین ہو گیا کہ شہر میں جو بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے اس کے ذمہ دار تین آدمی ہیں، ایک مولانا احمد اللہ صادق پوری، دوسرے مولانا شاہ محمد حسین محلہ تمنو میہا اور تیسرے مولوی واعظ الحق۔ ٹیلر نے تینوں کو مشورہ کرنے کے بہانے بلا یا اور ان کے لیے نظر بندی کا حکم دے دیا۔ ساتھ ہی کہا کہ موجودہ نازک حالات میں انھیں

---

[1] میلی سن جلد سوم ص ۳۱۔

کھلے بندوں نہیں چھوڑا جا سکتا، بلکہ نگرانی میں رکھا جائے گا۔

پھر گرفتاریاں شروع کر دیں۔ اول مولوی مہدی مجسٹریٹ کو پکڑا گیا، جس پر شبہ تھا کہ "باغیوں" کی سرگرمیوں کو نظر انداز کر رہا ہے۔ ۲۴ جون کو مظفر پور میں وارث علی نام پولیس کا ایک افسر گرفتار ہوا، جس کے پاس سے بہت سے کاغذات نکلے اور ان سے "سازشیوں کے نام معلوم ہوئے۔ ان میں سب سے بڑا علی کریم تھا لیکن اسے گرفتاری سے پیشتر اطلاع مل گئی اور وہ بچ نکلا۔

ہنگامہ

۳ جولائی کو پٹنہ میں ہنگامے کا آغاز ہوا۔ پیر علی خاں لکھنوی اس ہنگامے کا لیڈر تھا اور دو سو آدمی اس کے ساتھ تھے۔ سبز جھنڈا اس گروہ کے ساتھ تھا، نقارہ بجا کر اعلان کیا جا رہا تھا کہ مسلمانو! اللہ کے دین کی خاطر شامل ہو جاؤ۔

سکھ جیش کو اس مجمع کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ اس اثنا میں محکمہ افیون کا اسسٹنٹ ایجنٹ جس کا نام ڈاکٹر لائل تھا، مجمع کو روکنے اور منتشر کرنے کی غرض سے گھوڑے پر سوار ہو کر آیا، وہ مارا گیا اور کچھ معلوم نہیں کیا حالات پیش آئے۔ سکھوں نے شدید آتش باری سے مجمع منتشر کر دیا۔ ۴ جولائی کو اکتیس آدمی گرفتار کیے گئے، ان میں پیر علی خاں کے علاوہ شیخ گھسیٹا بھی تھا، جو پٹنہ کے مشہور دولت مند سیٹھ لطف علی خاں کا گماشتہ تھا۔

ان میں سے پندرہ آدمیوں کو فوراً پھانسی کی سزا دی گئی، جن میں وارث علی بھی شامل تھا اور اسے مظفر پور سے پکڑا گیا تھا۔ پیر علی خاں اور شیخ گھسیٹا کو دوسرے یا تیسرے دن پھانسی دی گئی۔ لطف علی خاں پر بھی مقدمہ چلایا گیا، لیکن اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا۔

دانا پور اور سگولی

دانا پور کی فوج نے ۲۵ جولائی کو سرکشی کا علم بلند کیا۔ وہ لوگ اٹھے اپنی وردیاں اتار پھینکیں اور آرہ کا رخ کر لیا، جو ضلع شاہ آباد کا مرکزی مقام تھا۔ عین اسی وقت سگولی میں بھی سرکشی کا علم بلند ہوا۔ یقین ہے کہ دونوں مقامات کی فوجوں

نے باہم نامہ وپیام کے ذریعے سے دن اور وقت طے کرلیا ہوگا۔

کنور سنگھ اب ایک نیا کارکن منظرِ عام پر آتا ہے یعنی کنور سنگھ جو جگدیش پور میں محض ایک جاگیردار تھا، لیکن اس نے جہادِ آزادی میں ایسے شاندار کارنامے انجام دیئے کہ چند بڑے بڑے کارکنوں کے سوا ویسے کارنامے کوئی انجام نہ دے سکا۔

یہ ایک قدیم رئیس گھرانے کا فرد تھا اور اپنے علاقے میں راجہ سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی نظام مالگزاری کے ماتحت اسے سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ اس کے خلاف مقدمے قائم کیے گئے۔ ایک موقع پر اس غریب نے اقرار کر لیا کہ میں بیس لاکھ روپے فراہم کردوں گا اور میری جاگیر نیلام نہ کی جائے۔ وہ روپیہ فراہم کر کے سرکاری خزانے میں پہنچا رہا تھا لیکن محکمہ مال کے فرعونوں نے حکم دیا کہ پورا روپیہ ایک مہینے میں داخل کرو، ورنہ نیلامی کا حکم جاری ہو جائے گا۔ ٹیلر نے کنور سنگھ کی حمایت میں بہت کچھ لکھا مگر حکومت نے کوئی سفارش نہ مانی، یعنی ٹیلر کو اتنا بُرا اور ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا کہ جس کی وہ حمایت کرتا، اسے اچھا نہ سمجھا جاتا اور جس کی مخالفت کرتا اُسے خیر خواہ قرار دیا جاتا۔

آرہ پر یورش داناپور کی سرکش سپاہ کے پاس دریائے سونؔ[1] کو عبور کرنے کا کوئی سامان نہ تھا اور اسے عبور کیے بغیر وہ آرہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کنور سنگھ حکومت سے مایوس ہو کر ایسے ہی موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جگہ جگہ سے کشتیاں فراہم کیں اور پوری فوج کو دریا سے گزار کر دوسرے کنارے پر لے گیا اور آرہ پر حملے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

---

[1] یہ وہی دریا ہے جس کی ستائش میرزا غالب نے بھی سفر کلکتہ کے ضمن میں کی ہے۔

"ساقی بزم آگہی" سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

گفتمش چوں بود عظیم آباد ۔ گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش ہم سبیل خوش باشد ۔ گفت خوشتر نہ باشد از سومن

انگریزوں کی پہلی کوشش وہاں کے انگریزوں نے ایک مکان کو پہلے سے مستحکم کر رکھا تھا۔ سب اس میں جا بیٹھے اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ ۲۷۔ جولائی سے ۲۹۔ جولائی تک محاصرہ جاری رہا اس اثنا میں کپتان ڈنبر[۱] فوج لے کر آرہ آ گیا۔ رات کے وقت وہ آرہ کے قریب پہنچا۔ کنور سنگھ نے اس کے لیے ایک خاص منصوبہ پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ راستے کے دونوں طرف اس نے آموں کے جھنڈ میں بندوقچی بٹھا رکھے تھے۔ ایک دم آتش بازی شروع ہوئی۔ ڈنبر اور دوسرے افسر پہلی ہی باڑ میں مارے گئے۔ انگریزی فوج کے آدمی مر مر کر گرنے لگے۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں کو ایک نشیب ملا جس میں یہ گولیوں سے محفوظ ہوئے۔ وہیں مشورہ کیا اور مراجعت ناگزیر سمجھی گئی۔ چنانچہ بچی کھچی فوج داناپور پہنچ گئی۔

دوسری کوشش محاصرہ پھر شدومد سے شروع ہو گیا۔ اور ۲۔ اگست تک جاری رہا۔ اب محصورین کے پاس سازوسامان بہت کم رہ گیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ بندوقیں اور پستول لے کر رات کے وقت ایک دم نکلیں اور محاصرے کا حلقہ توڑ کر نکل جائیں۔

اس اثناء میں انگریزوں نے میجر آئر[۲] کو فوج دے کر آرہ بھیج دیا۔ وہ ۲۔ اگست کو موقع پر پہنچا۔ مجاہدین آزادی نے اس کا مقابلہ بھی آگے بڑھ کر کیا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی لیکن آئر کو معلوم ہو چکا تھا کہ ڈنبر نے کس وجہ سے شکست کھائی۔ لہٰذا وہ بڑی احتیاط سے آگے بڑھتا رہا اور اس کے پاس سازوسامان بھی زیادہ تھا۔ چنانچہ وہ ۳۔ اگست کو آرہ میں داخل ہو گیا اور کنور سنگھ تمام ساتھیوں کو لے کر جگدیش پور چلا گیا۔

---

[۱] DUMER [۲] EYRE

بعد کے حالات بعد کے حالات زیادہ تفصیل کے محتاج نہیں کنور سنگھ جگدیش پور پہنچ چکا تھا۔ ابتدا میں اسے خیال تھا کہ انگریزی فوج تیزی سے تعاقب کرے گی۔ لیکن یہ خیال صحیح ثابت نہ ہوا اس لئے کہ آئر کو کمک کے انتظار میں آٹھ روز توقف کرنا پڑا۔ اس اثناء میں کنور سنگھ نے بھی اپنے ساتھیوں کو سہارا دے کر ازسرِ نو منظم کر لیا اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ آئر ۱۱۔ اگست کو جگدیش پور کے قریب پہنچا۔ ۱۲۔ اگست کو اسے معلوم ہوا کہ کنور سنگھ ٹولہ نرائن پور میں موجود ہے۔ آگے جنگل میں سخت لڑائی ہوئی۔ پھر کنور سنگھ سہسرام کی طرف چلا گیا۔ اب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اودھ چلا جائے۔ چنانچہ وہ الٰہ آباد اور بنارس کے ڈویژن سے گزرتا ہوا اعظم گڑھ پہنچا۔ وہاں کچھ دیر مقابلہ جاری رکھا۔ جب حالات ناساز گار پائے تو پھر نکلا، غازی پور کو پامال کرتے ہوئے انگریزوں کو دھوکا دے کر گنگا سے گزرا اور دوبارہ جگدیش پور کے جنگلوں میں پہنچ گیا۔ گنگا سے گزرتے وقت کنور سنگھ کے بازو پر گولی لگی تھی، زخمی بازو خود تلوار سے کاٹ کر دریا میں پھینک دیا۔ پھر ایک لڑائی بھی کی جس میں انگریزی جرنیل کو شکست دی۔ ۲۶ اپریل ۱۸۵۸ء کو بازو کے زخم کے باعث اس نے وفات پائی۔ کنور سنگھ کے بعد اس کے بھائی امر سنگھ نے جنگ جاری رکھی۔ پھر روپوش ہو گیا۔ قیاس یہ ہے کہ وہ نیپال چلا گیا۔

باقی اضلاع باقی اضلاع میں سے چمپارن، سارن (چھپرہ) اور گیا میں شدید خطرات پیدا ہوئے۔ شمال مشرق میں پورنیا کے لیے بھی تشویش ہوئی۔ بہار کے علاوہ چھوٹا ناگ پور میں بھی ہنگامے بپا ہوئے ان کے متعلق زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔

بعض اضلاع میں صرف اس لیے ہنگاموں کا سامان ہو گیا کہ جو مجاہدین آزادی اودھ یا بعض ملحقہ اضلاع میں انگریزوں سے لڑتے رہے تھے، وہ لڑتے ہوئے پیچھے ہٹے

تو بہار پہنچ گئے اور ان کی وجہ سے آبادیوں میں جوش پیدا ہونا طبعی تھا۔ لیکن جب بڑے بڑے معرکوں میں آخری کامیابی کی کوئی صورت نہ نکل سکی تو متفرق کشمکشوں میں کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے کا کیا امکان تھا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جواں ہمت لوگوں نے ناسازگاری احوال کی پرواہ بالکل نہ کی اور آخری دم تک جس طرح بھی ممکن تھا، مقابلہ جاری رکھا۔

وسط ہند اور راجپوتانہ

باب ۱

جھانسی اور دوسرے مقامات

جھانسی ریاست جھانسی کے الحاق کی تفصیلات کتاب کے ابتدائی ابواب میں پیش کی جا چکی ہیں اور انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ریاست کا انتظام انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ رانی لکشمی بائی کے لیے پانچ ہزار روپے ماہانہ (ساٹھ ہزار سالانہ) کا وظیفہ مقرر ہو گیا تھا اور اس کے متوفی شوہر نے جو قرضے چھوڑے تھے ان کا بوجھ رانی ہی پر ڈال دیا گیا تھا! اسے نظم و نسق سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اپنے متبنّٰی کے ساتھ الگ تھلگ ایک محل میں رہتی تھی۔ تھوڑے سے ملازم اس کے پاس تھے۔ پانچ ہزار روپلے میں ملازموں کی بڑی تعداد رکھنا ممکن بھی نہ تھا۔

ہنگامہ میرٹھ کے ہنگامے اور دہلی میں بادشاہی کے اعلان کی خبریں سنتے ہی ہر حصہ ملک میں جو جوش پیدا ہو گیا تھا، اس سے جھانسی کی آبادی کیوں کر غیر متاثر رہ سکتی تھی، جس میں بڑے غیور اور کاردان آدمی موجود تھے اور جنھیں سابقہ راج سے گہری محبت و عقیدت بھی تھی۔

۵۔ جون کو سپاہی اٹھے۔ انگریز حفاظت کی غرض سے قلعے میں جا بیٹھے، جہاں انھوں نے خوب استحکامات کر لیے تھے۔ سپاہیوں کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ قلعے کا محاصرہ کر لیتے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ۶۔ جون کو رانی جلوس کی شکل میں محل سے نکلی اور چھاؤنی کی طرف گئی۔ ایک مولوی صاحب نے مسلمانوں سے کہا کہ خدا کی بارگاہ میں رانی کے لیے دعا

کریں۔ بس اس کے ساتھ ہی رسالے اور پیادہ فوج نے بغاوت کر دی۔

جس حد تک مستند اطلاعات کا تعلق ہے، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رانی کو سرکشی کی انگیخت سے کوئی بھی تعلق تھا۔ البتہ یہ درست ہے کہ بعد میں اس نے فوج کی قیادت سنبھال لی، اس لیے بھی کہ نظم قائم رکھنا ضروری تھا، اس لیے بھی کہ ایک روایت کے مطابق ایک ذمہ دار انگریز یہی کہہ رہا تھا اور اس لیے بھی کہ سرکش فوج کا مطالبہ یہی تھا۔ یہ مطالبہ نہ مانا جاتا تو وہ کسی دوسرے کو راج گدی پر بٹھا دیتے۔

انگریز قاصد انگریزی بیانات منظہر ہیں کہ ، جون کو تین انگریز یہ فیصلہ کر کے قلعے سے نکلے کہ رانی سے بات چیت کر کے جھانسی چھوڑ دینے کا بندوبست کریں۔ قلعے سے نکلتے ہی محاصرین نے انھیں گرفتار کر لیا اور رانی کے پاس محل میں لے گئے۔ اس نے کہا: مجھے انگریز خنزیروں سے کوئی سروکار نہیں، انھیں رسالدار کے پاس لے جاؤ۔ وہ جو چاہے سزا دے[1]۔

یہ بیان صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ رانی نے اپنی فوج کا ایک دستہ قلعے میں انگریزوں کی حفاظت کے لیے بھیج دیا تھا لیکن انگریزوں نے اس دستے کو واپس کر دیا۔ غالباً اس خیال سے کہ ان لوگوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا تھا اور جو انگریز رانی سے بات چیت کے لیے گئے تھے، وہ محل تک پہنچ ہی نہ سکے، بلکہ راستے ہی میں قتل ہو گئے۔ رانی اس وقت تک انتظامات ریاست کی مالک و مختار ہی نہ بنی تھی اور اپنی پہلی پوزیشن میں الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ البتہ ان لوگوں کے قتل پر یقیناً افسوس ہے، اس لیے کہ یہ نہایت برا فعل تھا۔

قلعہ نشین محصورین نے اس کے بعد دو یورپینوں کو تبدیل لباس باہر بھیجا کہ گوالیار یا کسی دوسرے مقام تک خبر پہنچا دیں لیکن وہ بھی راستے ہی میں مارے گئے۔

---

[1] میلی سن، جلد سوم صفحہ ۱۲۲

حوالگی

جب رسد ختم ہونے لگی تو محصورین نے یہی مناسب سمجھا کہ بات چیت کے ذریعے سے شرائط حوالگی طے کر لیں۔ باہر سے امداد کا کوئی امکان نہ تھا۔ قرار یہ پایا کہ اگر محصورین ہتھیار رکھ دیں اور قلعہ خالی کر دیں تو انھیں کسی دوسرے محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے گا۔

انگریزی بیانات مظہر ہیں کہ یہ شرطیں خود رانی نے پیش کی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک رانی نے کسی کام میں حصہ نہیں لیا تھا۔ محاصرین کی آرزو یہ تھی کہ قلعہ کا معاملہ جلد سے جلد یکسو ہو جائے تاکہ وہ جھانسی سے دہلی چلے جائیں اور وہاں پہنچ کر جہاد آزادی میں حصہ لیں۔ غالباً انھیں یہ خیال بھی ہو گا کہ جھانسی میں بیٹھے رہے تو ممکن ہے کوئی انگریزی جیش آکر ان کے تمام منصوبوں کو درہم برہم کر ڈالے اور دہلی کی فوج میں شامل ہو کر انھیں بہتر طریق پر پیش نظر کام انجام دینے کی امید تھی۔

واقعہ قتل

مستند یہی ہے کہ محاصرین نے یہ شرطیں منظور کیں اور قلعے کی حوالگی کا فیصلہ ہو گیا۔ قلعے کا دروازہ کھلا تو محاصرین انگریزوں کو جوکن باغ میں لے گئے۔ وہاں انھیں انتہائی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان میں مرد بھی تھے، بچے بھی اور عورتیں بھی۔ شرائط حوالگی طے ہو جانے کے بعد کسی مرد کو بھی آزار پہنچانا سراسر خلافِ عہد تھا۔ لیکن عورتوں اور بچوں کا تو کوئی بھی گناہ نہیں تھا۔ جھانسی کا یہ واقعہ بھی ۱۸۵۷ء کے ان واقعات المیہ میں سے ہے، جن پر ہر حق شناس کو ہمیشہ رنج و قلق رہے گا۔

روپے کا مطالبہ

اب سرکش سپاہ رانی کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے پیغام بھیجا کہ تین لاکھ روپے دو تاکہ ہم دہلی چلے جائیں۔ رانی نے جواب دیا کہ میرے پاس روپے کہاں۔ ریاست انگریز لے چکے۔ مجھے گزارے کے لیے جو رقم ملتی رہی، وہ اتنی نہیں کہ کچھ بچا سکتی۔

یہ تھا بھی درست۔ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۷ء تک چار سال میں ساٹھ ہزار سالانہ کی رقم صرف دو لاکھ چالیس ہزار بنتی تھی۔ پھر رانی تین لاکھ کہاں سے دیتی۔ سپاہیوں نے دھمکی دے دی کہ رقم نہ دو گی تو محل کو آگ لگا دیں گے اور سدا شیو راؤ کو مسندِ حکومت پر بٹھا دیں گے، جسے رانی کے متوفی شوہر گنگا دھر راؤ کے بھتیجے رام چندر راؤ نے متبنیٰ بنایا تھا اور اسے رد کر کے انگریزوں نے گنگا دھر راؤ کے بھائی رگھوناتھ راؤ کو راجا تسلیم کیا تھا، اس کی وفات پر گنگا دھر راؤ راجا ہوا تھا۔

رانی کی تشویش

یہ دھمکی رانی کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر سدا شیو راؤ کو مسندِ ریاست مل گئی تو گنگا دھر راؤ کے متبنیٰ دامودر راؤ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

گویا رانی کے لیے معاملے کی صورت یہ نہ تھی کہ سرکش سپاہ سے تعاون کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے۔ صورت یہ تھی کہ جس گدی کو وہ اپنے متوفی شوہر کی امانت سمجھتی تھی اور اسے متوفی کے متبنیٰ دامودر کو دلانا چاہتی تھی، آیا اسے چپ چاپ غیر کے قبضے میں جانے دے اور شوہر کی وصیت کو پورا کرانے پر امید کا دروازہ بند کر دے؟ اس کی راہ میں ایک مشکل انگریزوں نے پیدا کر دی تھی اور وہ یہ کہ ریاست پر قبضہ کر لیا تھا۔ رانی غالباً ۱۸۵۷ء تک سمجھ رہی تھی کہ انگریز اس غلطی کی تلافی کر دیں گے۔ اب مسند کا ایک ایسا امیدوار بروئے کار آ رہا تھا جو ایک مرتبہ کامیاب ہو جاتا تو پھر اسے ہٹانا غیر ممکن تھا۔

فیصلہ

پھر اس دھمکی کی ایک اور بھی شق تھی، اور وہ یہ کہ روپیہ ادا نہ کرنے کی صورت میں سپاہی محل کو آگ لگا دیتے، گویا ریاست کے باقیات میں سے رانی کے پاس جو کچھ تھا وہ نذرِ آتش ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے وہی فیصلہ کیا جو حالات کے تقاضے کی بنا پر ناگزیر تھا۔ یعنی اس نے ایک لاکھ کے جواہرات سپاہ کو دے دیے اور کہا کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتی۔ سپاہ نے رانی کی حکمرانی کا اعلان کر دیا،

اور لوٹ مار کرتی ہوئی دہلی روانہ ہو گئی۔[1]

اب رانی کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ حکمرانی کی ذمہ داریوں کو سنبھالے اور ریاست کا نظم و نسق درست کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے متوفی شوہر کے کارکنوں کو جمع کیا، انھیں مختلف عہدے بانٹے، سپاہ بھرتی کی اور حکومت کا شیرازہ از سر نو استوار کر دیا۔ لیکن وہ اپنے نقطۂ نگاہ سے جھانسی کی رانی نہ تھی بلکہ دامودر راؤ کی نگران و سرپرست کی حیثیت سے سب کچھ کر رہی تھی۔

نظم و نسق اور رزم و پیکار رانی کو حکمرانی کی جتنی بھی مہلت ملی، اسے اپنی رعایا کی خدمت، بہبود اور خوشحالی میں صرف کیا۔ ریاست کے بیشتر حصوں کا دورہ کیا اور تمام معاملات و مقدمات کا فیصلہ موقع پر کرتی رہی۔ واقف کار اصحاب نے لکھا ہے، انتظام اتنا اچھا تھا اور رعایا اس قدر خوش تھی کہ رانی کو یقین تھا، ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد جھانسی کی ریاست واپس مل جائے گی۔

اس اثنا میں معرکے بھی پیش آئے مثلاً:

۱۔ سداشیو راؤ نے جب دیکھا کہ رانی حکمران بن گئی ہے تو ایک قلعے پر قبضہ کر کے اپنی راجائی کا اعلان کر دیا۔ رانی خود فوج لے کر مقابلے پر گئی، قلعہ فتح کیا اور سداشیو راؤ کو گرفتار کر کے جھانسی میں نظر بند کر دیا۔

۲۔ پھر اوڑچھا کے بندھیلا راجا نے جھانسی پر حملہ کر دیا۔ اس کا یہ حملہ خاص مصلحتوں پر مبنی تھا۔ وہ اوّل جھانسی کو اپنی ریاست میں شامل کرنے کا آرزو مند تھا اور اسے خیال تھا کہ رانی عورت ذات ہے، اسے شکست دینا مشکل نہ ہوگا۔ دوسرے وہ انگریزوں پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ حملہ خیر خواہ کی حیثیت میں کر رہا ہے اور رانی کو وہ انگریزوں کی مخالف ثابت کرتا

---

[1] یہ تمام تفصیلات رانی لکشمی بائی کے حالات کے متعلق کن کیڈ کے ایک مقالے سے ماخوذ ہیں۔

چاہتا تھا۔ رانی نے بندھیہ راجہ کو بھی شکست فاش دی۔

اس کے بعد انگریزی فوج سر ہیو روز کی سرکردگی میں حملہ آور ہوئی۔ ان لڑائیوں کے حالات ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

گوالیار گوالیار کے حالات ابتدا ہی میں خاصے تشویشناک ہو گئے تھے۔ وہاں میجر میکفرسن پولیٹکل ایجنٹ تھا۔ اس نے مہاراجا سندھیا کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ اپنی خاص معتمد علیہ فوج صوبہ غرب و شمال کے لفٹنٹ گورنر کے حوالے کر دے۔ سندھیا کا وزیر ڈنکر راؤ بھی اس پالیسی کا حامی تھا، اگرچہ وہ انگریزی اقتدار کو پسند نہیں کرتا تھا۔

انگریز گوالیار کی چھاؤنی میں رہتے تھے، جب معلوم ہوا کہ سپاہ کے تیور بگڑ رہے ہیں تو سندھیا نے تجویز پیش کی کہ بچوں اور عورتوں کو ریزیڈنسی میں بھیج دینا چاہیئے، جو شہر سے پانچ میل باہر تھی، چنانچہ اس پر عمل بھی ہوا۔ سندھیا نے اپنی محافظ فوج ان کی حفاظت کے لیے متعین کر دی، لیکن فوج کے انگریز بریگیڈیر کو یہ بہت برا معلوم ہوا کہ اس کے ہوتے ہوئے انگریز عورتیں اور بچے غیروں کی حفاظت میں دیے جائیں۔ اس نے حکم دیا کہ ان سب کو دوبارہ چھاؤنی میں لایا جائے۔ اس بے تدبیری کے باعث تشویش بھی بڑھی، بے اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا اور یہ بھی سمجھا گیا کہ انگریز حد درجہ مضطرب ہیں اور اس بات کی روشن دلیل یہ ہے کہ کمزوری نے ان پر سراسیمگی طاری کر رکھی ہے۔

۱۴۔جون تجویز پیش ہوئی کہ انگریز عورتوں اور بچوں کو آگرہ بھیج دیا جائے۔ وہاں لفٹنٹ گورنر کا حکم آگیا کہ جب تک بغاوت پھوٹ نہ پڑے، ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔

لفٹنٹ گورنر کی رائے غلط یا بے بنیاد نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ عورتوں اور بچوں کو باہر بھیجا تو سمجھا جائے گا کہ انگریز ہراس زدہ ہیں، اس طرح سرکشی کی آگ

تیز ہو گی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک موہوم مصلحت کی بناء پر عورتوں اور بچوں کو خطرے میں ڈالنا دور اندیشی کا ثبوت نہ تھا۔

بہرحال ۱۴ جون کو بنگلوں کی آتش زنی سے ہنگامہ شروع ہوا۔ کچھ عورتیں اور مرد مارے گئے، جو باقی بچے وہ انتہائی پریشانی کی حالت میں آگرہ پہنچے۔ اب سندھیا اور ڈنکر راؤ کے لیے صرف یہ یقین دلانے کی گنجائش رہ گئی تھی کہ سرکشی کو پھیلنے نہ دیا جائے گا بعد میں جو حالات پیش آئے وہ موقع پر بیان ہوں گے۔

نوگاؤں، نصیر آباد اور نیمچ | اب بندھیل کھنڈ، راجپوتانہ اور وسطِ ہند کے بعض مقامات کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ **نوگاؤں**:۔ یہ بندھیل کھنڈ کی چھاؤنی تھی۔ وہاں پہلے کچھ تشویش پیدا ہوئی۔ پھر حالات روبراہ ہو گئے۔ جھانسی میں سرکشی کی اطلاع ملی تو دوبارہ تشویش ہوئی۔ ۹ جون کو سپاہ سرکش ہو گئی۔ انگریز افسر بھاگ کر چھترپور پہنچے۔ آخر وہ باندہ میں وارد ہوتے تو نواب نے ان کی مہمانداری اور حفاظت نہایت اچھے پیمانے پر کی تاہم یہ خدمت نواب کو ریاست کی ضبطی اور جلاوطنی سے نہ بچا سکی۔

۲۔ **نصیر آباد**:۔ اجمیر میں راجپوتانہ کی بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ وہاں ۱۸ مئی کو ہنگامہ بپا ہوا۔ انگریز زن و مرد بیاوڑ چلے گئے۔ اور فوج نے دہلی کا رخ کر لیا۔ پھر دیسہ سے انگریزی فوج نصیر آباد پہنچی، لیکن ۱۰۔ اگست کو دوبارہ بغاوت ہو گئی

۳۔ **نیمچ**:۔ ۳۔ جون تک امن رہا۔ جب نصیر آباد میں سرکشی کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو حالات بگڑ گئے۔ اس رات دس بجے سے ہنگامہ شروع ہوا۔ انگریز بچ کر اودے پور چلے گئے۔

اندور

اندور میں کرنیل ڈیورنیڈ، گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔ حالات وہاں بھی اچھے نہ تھے اور مئو میں بھی خاصی تشویش تھی جو اندور سے تیرہ میل پر تھا۔ کچھ مدت کسی ہنگامے کے بغیر گزر گئی۔ البتہ ڈیورنیڈ اس اثنا میں حفاظت کی تدبیریں سوچتا رہا اور وہ خطرات سے غافل نہ تھا۔ اس نے بھیلوں کا ایک جیش بھرتی کر رکھا تھا اور بھوپال سے کچھ فوج منگوالی تھی۔

یکم جولائی کو سعادت خاں کی سرکردگی میں ریزیڈنسی پر حملہ ہوا۔ اگرچہ ڈیورنیڈ نے مئو سے توپ خانہ بلوا لیا تھا۔ لیکن وہ بروقت نہ پہنچ سکا اور ڈیورنیڈ کو ریزیڈنسی خالی کرنی پڑی۔

وہ ہوشنگ آباد پہنچا تو معلوم ہوا کہ مئو میں بھی بغاوت ہو گئی۔ بمبئی کے گورنر نے ایک کالم تیار کیا تھا کہ وہ چکر لگاتے۔ اس کی آمد پر بہت کچھ موقوف تھا، لیکن جب معلوم ہوا کہ اورنگ آباد میں بھی ہنگامہ برپا ہو گیا تو کالم کو بھیج دیا گیا۔ اورنگ آباد دولت آصفیہ کا ایک مشہور مقام تھا اور وہاں کے ہنگامے کو جلد از جلد فرو کرنا اس لیے لازم تھا کہ اسی پر پوری ریاست کا امن موقوف تھا۔

ان مقامات کے علاوہ بھی متفرق ہنگامے برپا ہوئے، جن کی تفصیل چنداں ضروری نہیں۔

باب ۲

انگریزوں کے اقدامات

رانی کا عزم

انگریزوں کو وسطِ ہند میں جو لڑائیاں پیش آئیں، ان میں سے ابتدائی لڑائیاں بڑی اہم تھیں۔ جن میں مجاہدین آزادی کی بہترین فوجی قوت تباہ ہوئی ان تمام لڑائیوں میں ہیوروز انگریزی فوج کا سپہ سالار تھا۔

ہیوروز کی مہم کا آغاز ساگر سے ہوا۔ پھر وہ منزل بہ منزل جھانسی کی طرف بڑھا۔ رانی اس وقت تک انگریزوں کی مخالفت پر آمادہ نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ بات چیت کر کے جھانسی کو واپس لے لے اور آرام سے بیٹھی رہے، لیکن دہلی اور بعض دوسرے مقامات کی تسخیر کے بعد انگریزوں کے خوفناک ظلم سب پر آشکارا ہو چکے تھے لہٰذا مشیروں نے یہی رائے دی کہ گفتگو سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اب جم کر لڑنا چاہیئے۔ یا عزت کی موت مریں گے یا عزت سے زندگی بسر کرنے کی گنجائش پیدا کر لیں گے۔

مقابلے کی تیاریاں

یہ فیصلہ ہوتے ہی رانی نے جھانسی کے گرد و پیش کا علاقہ دور دور تک تباہ کر دیا تاکہ انگریزی فوج کو ضرورت کی کوئی چیز نہ مل سکے۔ جھانسی تک جتنے راستے تھے ان سب میں مناسب مقامات پر استحکامات کر کے چوکیاں بٹھا دیں اور قلعے کو بھی خوب مستحکم کر لیا۔

اب رانی کے سامنے اس کے سوا کوئی مقصد اور کوئی نصب العین نہ تھا کہ جھانسی کے لیے خوفناک جنگ کرے، پھر وطن کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر دے۔ زندگی کے آخری سانس تک وہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے وقف

رہی اور اسی کی راہ میں اس نے بہادری سے لڑتے ہوئے جان دے دی۔

محاصرہ ہیوروز ۲۱۔ مارچ ۱۸۵۸ء کو جھانسی پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا فریقین کے درمیان توپوں کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اس اثنا میں رانی نے امداد کے لیے پیغامات بھیج دیے تھے۔ تانتیے ٹوپے چرکھاری کو ختم کر چکا تھا اور اسے حکم بھی مل چکا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو رانی کی امداد کے لیے جھانسی پہنچ جائے۔

ہیوروز کے لیے شہر فتح کرنے کی کوئی صورت نہ نکل سکی اس اثنا میں تانتیا ٹوپے نمودار ہوا، اس کے ساتھ بائیس ہزار فوج اور اٹھائیس توپیں تھیں۔ یہ بہت بڑی فوج تھی۔ اگر صحیح تدبیر سے کام لیا جاتا تو ہیوروز کے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہتا۔ ایک طرف تانتیا اور دوسری طرف رانی کی فوج کے درمیان انگریزی فوج پس جاتی۔ تدبیر نہ سہی محض جواں مردی سے بھی لڑا جاتا تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ افسوس کہ یہ بھی نہ ہوا۔

لڑائی ہیوروز کو خطرے کا پورا احساس تھا۔ لیکن اسے یہ بھی یقین تھا کہ تباہی کا اندیشہ دونوں صورتوں میں موجود ہے۔ محاصرہ چھوڑوں تو پھر بھی تانتیا اور رانی کی فوجوں سے پیچھا نہ چھوٹے گا اور لڑوں تو اس صورت میں بھی نجات کا راستہ یہی ہے کہ محصور فوج کو شہر سے باہر نکلنے کا موقع نہ دیا جائے اور تانتیا کو شکست دی جائے۔ چنانچہ اس نے توپچیوں سے کہہ دیا کہ شہر اور قلعے پر گولہ باری کا سلسلہ زور شور سے جاری رکھا جائے۔ اس اثنا میں اپنی فوج کے منتخب دستے لے کر وہ تانتیا کے مقابلے پر چلا گیا! اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ بڑی مردانگی کا کام تھا۔ جھانسی سے ایک میل پر لڑائی ہوئی۔ تانتیا کی فوج کچھ نہ کر سکی اور تھوڑی ہی دیر میں منتشر ہونے لگی۔ یہ حالت دیکھی تو تانتیا پاس کے جنگل میں گھس گیا اور اس نے اپنے اور انگریزی فوج کے درمیانی جنگل کو آگ لگا دی۔ اس طرح خود بچ نکلا لیکن جھانسی کی تقدیر پر بدنصیبی کی مہر

لگا گیا۔

جھانسی کی تسخیر
اب ہیوروز کو یہ اضطراب تھا کہ جلد سے جلد جھانسی کو فتح کر لے اس لیے کہ اسے اندیشہ تھا مبادا نئی کمک آجائے۔ اس کے برعکس رانی کو کسی کمک کے بروقت پہنچنے کی امید نہیں رہی تھی۔

۲۔اپریل کو صبح کے تین بجے انگریزی فوج جھانسی میں داخل ہوئی۔ رانی اور اس کے فوجی جس مردانگی سے لڑے، ۱۸۵۷ء کے مجاہدات میں اس کی بہت ہی کم مثالیں ملیں گی۔ قدم قدم پر انگریزوں سے پر زور مقابلہ ہوا۔ قلعے میں داخلے کے بعد محل کے ایک ایک کمرے کے لیے خونریز کشمکش کرنی پڑی۔ بالآخر جھانسی پر انگریز قابض ہو گئے۔

رانی کالپی میں
رانی ۴۔اپریل کی رات کو قلعے سے نکلی اور تین سو سواروں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر کالپی روانہ ہو گئی۔ اس کا متبنیٰ دامودر راؤ ہمراہ تھا۔ انگریزوں نے تعاقب کیا، تعاقب کنندہ فوج کا افسر بری طرح زخمی ہوا اور اسے ناکام واپس ہونا پڑا۔ یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ فتح کے بعد جن لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں ان میں رانی کا باپ مورو پنت تامبے بھی تھا، جسے دتیا کے راجا نے انگریزوں کے حوالے کیا تھا۔ کالپی پہنچتے ہی رانی نانا کے بھتیجے راؤ صاحب سے ملی اور صرف ایک درخواست کی کہ مجھے فوج دیجیے تاکہ انگریزوں سے لڑوں۔ اس وقت تک تانتیا بھی کالپی پہنچ گیا تھا۔ راؤ صاحب نے پھر ایک فوج تیار کی اور تانتیا سے کہا کہ رانی کے ساتھ جائے اور جہاں مناسب ہو انگریزوں سے لڑے۔

کونچ اور کالپی
ہیوروز جھانسی کے انتظامات سے فارغ ہو کر ۲۵۔اپریل کو کالپی کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں ایک مقام کونچ آتا تھا

جہاں رانی اور تانتیا ٹوپے فوج لیے موجود تھے۔ یکم مئی کو کونچ میں جنگ ہوئی۔ ہیوروز پھر کامیاب ہوا۔ اس کے بعد رانی واپس ہوگئی، اور تانتیا اپنے والدین سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ ساورکر نے لکھا ہے، وہ دراصل گوالیار گیا تھا تاکہ وہاں کے لوگوں کو جہادِ آزادی کے لیے تیار کردے۔ پھر ہیوروز کالپی پر بڑھا تو وہاں بھی رانی نے انگریزی فوج کا پرزور مقابلہ کیا، انگریز وہاں بھی کامیاب ہوتے۔ آخر رانی، راؤ صاحب، تانتیا اور نواب علی بہادر خاں والی باندہ گوالیار پہنچ گئے۔

سندھیا کی بے حمیتی

سندھیا نے مجاہدین آزادی کا مقابلہ کیا۔ لیکن پہلے ہی ہلّے میں اس کی فوج مجاہدین سے جا ملی۔ صرف محافظ فوج کے چھ سو آدمی رہ گئے، جن میں بعض مارے گئے۔ جو باقی بچے سندھیا ان کی حفاظت میں بھاگ کر آگرہ چلا گیا۔ گویا اب گوالیار مجاہدین کے قبضے میں تھا، جہاں وہ خوب لڑ سکتے تھے اور ان کے قبضے میں روپیہ بھی آگیا، نیز وہاں سے ٹہنا پڑے تو وہ آسانی سے دکن کی جانب جا سکتے تھے جہاں مہاراشٹر اور دولت آصفیہ میں ان کا خیر مقدم بڑی حوصلہ افزا صورت میں ہوتا۔

رانی کی وفات

ہیوروز سمجھتا تھا کہ کالپی کے بعد آرام سے بیٹھے گا۔ جب سنا کہ آزادی کے علمدار گوالیار پر قابض ہو چکے ہیں تو پھر اس نے انتہائی تیزی سے گوالیار کا رخ کرلیا۔ ایک لڑائی مرار میں اور دوسری کوٹہ کی سرائے میں ہوئی یہ دونوں مقامات گوالیار کے حوالی میں ہیں۔ کوٹہ کی سرائے میں اتفاقیہ رانی اپنی فوج سے منقطع ہوکر انگریز سواروں میں گھر گئی۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ رانی ہے، اس لیے کہ اس نے مردانہ لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی خواصوں میں سے ایک کے گولی لگی۔ اس نے رانی کو آواز دی تو وہ پلٹی اور جس گورے نے گولی ماری تھی، اسے قتل کیا، پھر مڑی تو اس کا گھوڑا اچھلا نگ لگا کر نالے کو عبور کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اسی حالت میں تلواریں اور گولیاں کھا کر گری۔ گورے آگے بڑھ گئے تو ایک واقف حال رانی کو اٹھا کر جھونپڑی میں لے گیا۔ غالباً وہ آخری دموں

پر تھی۔ صرف اتنی وصیت کی کہ میری ارتھی فوراً جلا دینا تاکہ دشمنوں کے ہاتھ نہ پڑوں۔
چنانچہ اس شخص نے وصیت پوری کر دی۔ ہیوروز مختلف میدانوں میں رانی سے لڑ
چکا تھا، اس نے اعتراف کیا کہ باغیوں میں، اس سے زیادہ بہادر کسی کو نہ پایا۔ یہ
۱۷۔ جون ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے۔

تانتیا اور اس کے ساتھی

گوالیار میں شکست کے بعد تانتیا ٹوپے، راؤ صاحب اور نواب باندہ نے جے پور کا رخ کیا۔ اب ہیوروز نے
رابرٹ پنیئر کو ان کے تعاقب کے لیے مقرر کر دیا۔ پہلی جنگ جوڑا علی پور میں ہوئی پھر تانتیا
تقریباً دس مہینے مالوہ، گجرات، راجپوتانہ اور وسطِ ہند کے جنگلوں اور صحراؤں میں چکر
لگاتا رہا۔ کبھی راؤ صاحب اور نواب باندہ اس سے الگ ہو جاتے، کبھی پھر ساتھ مل جاتے۔
شہزادہ فیروز شاہ کے حالات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس نے جب دیکھا کہ
اودھ یا روھیل کھنڈ میں قیام مشکل ہو گیا ہے تو وہ گنگا اور جمنا کو عبور کرتا ہوا ریاست گوالیار
میں پہنچا۔ وہاں انگریزوں سے لڑائیاں ہوئیں۔ آخر تانتیا ٹوپے سے جا ملا، لیکن راؤ صاحب
کی طرح شہزادہ کو بھی تانتیا سے الگ ہونا پڑا۔

انجام

آخر تانتیا کو اس کے ایک عزیز اور جگری دوست مان سنگھ نے (جو گوالیار کا ایک جاگیر دار تھا) اپریل ۱۸۵۹ء میں دھوکے سے گرفتار کرایا۔ گرفتاری کے
بعد اسے سیپری لے گئے، جہاں فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا اور سیپری ہی میں پھانسی دے
دی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، راؤ صاحب ۱۸۶۲ء میں گرفتار ہوا اور کان پور
میں پھانسی کی سزا پائی۔ نواب علی بہادر خاں والیِ باندہ نے اپنے آپ کو انگریزوں کے
حوالے کر دیا۔ اگرچہ اس نے ہر مقام پر انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں اور ان کی حفاظت
یا خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی تاہم اس کی ریاست چھین لی گئی اور تین سو روپے
ماہوار پنشن دے کر اندور میں بٹھا دیا، وہیں ۱۸۷۳ء میں وفات پائی۔

شہزادہ فیروز شاہ ہندوستان سے نکلا اور سرحد آزاد میں بھی رہا۔ وہ سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عبد اللہ سے بھی ایک مرتبہ ملا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مکہ معظمہ چلا گیا تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ ۱۸۶۹ء تک کربلائے معلیٰ میں تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ ترکستان جا پہنچا تھا۔ مستند یہی ہے کہ مکہ معظمہ میں وفات پائی۔

ضروری گذارش میں نے ایک ایک مقام میں انگریزوں کے پہنچنے اور اقتدار و تسلط بحال کرنے کے حالات نہیں لکھے، ان میں نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ وہ چنداں ضروری معلوم ہوتے۔ البتہ جن لوگوں نے تحریک آزادی کو کامیاب بنانے کے لیے سرگرمی سے کام لیا اور ان کے مجاہدات کو زیادہ سے زیادہ اہم حیثیت حاصل ہے ان کا ذکر ایسے انداز میں کر دیا کہ کوئی ضروری معاملہ نظر انداز نہ ہونے پائے۔

پنجاب و سرحد

باب ۱:

انبالہ اور جالندھر ڈویژن

ضروری تصریحات اب ہم اپنے سفر کی آخری منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ پنجاب کی سرسری جغرافیائی کیفیت پہلے بیان کی جاچکی ہے۔ تاہم یہ بتا دینا چاہیئے کہ ستلج اور جمنا کے جن درمیانی اضلاع کو دہلی ڈویژن میں شامل کیا گیا تھا، وہ ۱۸۵۷ء میں یا اس سے کچھ دیر پہلے انبالہ ڈویژن میں شامل کر دیئے گئے تھے۔ البتہ دہلی مستثنیٰ تھا۔ لہٰذا ہم نے ان اضلاع کے حالات دہلی کے ذکر میں تفصیلاً پیش نہیں کیے تھے۔ یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ مختلف ڈویژنوں یا کمشنریوں اور سب اضلاع کے حدود یا نام وہ نہ تھے جن سے ہم لوگ بعد کے دور میں متعارف ہوئے۔ اب یہاں ڈویژنوں اور اضلاع کے وہ نام بتا دینے چاہئیں، جو ۱۸۵۷ء میں رائج تھے۔

نمبر شمار	ڈویژن	اضلاع
۱۔	انبالہ ڈویژن یا ستلج کے جنوب کا ڈویژن	انبالہ، تھانیسر، فیروزپور، شملہ، ہانسی، حصار، رہتک، لدھیانہ، سرسہ۔
۲۔	جالندھر ڈویژن	جالندھر، ہوشیارپور، کانگڑہ۔
۳۔	لاہور ڈویژن	لاہور، امرتسر۔ گورداسپور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ
۴۔	جہلم ڈویژن	جہلم، راولپنڈی، گجرات، شاہ پور۔
۵۔	ملتان ڈویژن	ملتان، جھنگ، گوگیرہ۔

نمبر شمار	ڈویژن	اضلاع
۶-	لیہ ڈویژن	لیہ، خان گڑھ، ڈیرہ غازی خاں، ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔
۷-	پشاور ڈویژن	پشاور، کوہاٹ، ہزارہ۔

ردو بدل بعد ازاں ڈویژنوں کے حدود میں بھی ردو بدل ہوا، اضلاع کے حدود میں بھی ترمیم ہوئی۔ بعض نئے ضلعے بنے۔ بعض کے نام بدلے گئے مثلاً ضلع تھانیسر کا صدر مقام پہلے پانی پت بعد میں کرنال قرار پایا۔ سرسہ اڑ گیا، ہانسی کا نام حذف ہو گیا اور صرف حصار رہ گیا۔ ایک ضلع گوڑگانوہ میں قائم ہوا۔ فیروزپور اور لدھیانہ جالندھر ڈویژن میں شامل ہو گئے۔ شیخوپورہ میں نیا ضلع بنا۔ ڈیرہ اسماعیل خاں سرحد میں شامل ہو گیا۔ بنوں اور مردان کے نئے ضلعے بن گئے۔ نہروں کے نکلنے سے وسطی پنجاب کی بنجر زمینیں آباد ہو گئیں تو نئے بڑے بڑے شہر اور تجارتی مرکز ظہور میں آئے۔ مثلاً لائل پور اور منٹگمری۔ گوگیرہ کی جگہ انھوں نے لے لی جہلم کی جگہ راولپنڈی ڈویژن کا صدر مقام مقرر ہوا۔ خان گڑھ کی جگہ مظفر گڑھ اور لیہ کی جگہ میانوالی مرکز قرار پائے۔ ہم جو حالات بیان کریں گے، ان کے سلسلے میں ۱۸۵۷ء کی انتظامی تقسیم پیش نظر رکھیں۔

انبالہ انبالہ میں چربی والے کارتوسوں کی اطلاع پہنچتے ہی تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ ۱۹- اپریل یعنی میرٹھ میں ہنگامے سے کم و بیش تین ہفتے پیشتر بے چینی کا اظہار بنگلوں کو آگ لگنے سے ہوا۔ انبالہ کے کوتوال جوالا ناتھ نے ایک سکھ سپاہی کو جس کا نام شام سنگھ تھا اس امر پر آمادہ کیا کہ فوجیوں کے درمیان جو پخت و پز ہو رہی تھی، اس کا راز افشا کر دے۔ شام سنگھ نے بتایا کہ ہندو اور مسلمان مذہب کے بچاؤ کے لیے متحد ہو چکے ہیں اور ایک گروہ کے ذریعے سے فوجوں کے درمیان

نامہ و پیام جاری ہے۔ ۷۔ اور ۸۔ مئی کو یہ راز آشکار ہوا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر دہلی یا انبالہ میں کشت و خون ہوگا۔ ۱۰۔ مئی کو حالات خاصے نازک ہو گئے۔ اس اثنا میں ہنگامہ میرٹھ کی اطلاع پہنچ گئی۔ انگریزوں نے فوراً پٹیالہ، جیند، نابھہ، مالیر کوٹلہ، فرید کوٹ کے علاوہ جاگیرداروں اور رئیسوں سے بھی امداد طلب کی۔

ہر ضلع کے افسر کی خاص توجہ چند امور پر مرتکز تھی۔ مثلاً یہ کہ شاہراہ عام کھلی رہے تاکہ جگہ جگہ سے فوجیں اور سامان دہلی بھیجنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ ہر ضلعے سے روپیہ چھ فی صد سود پر فراہم کیا جائے۔ خزانے کو بچایا جائے۔ امن قائم رکھا جائے۔ فوج کے لیے حمل و نقل کے وسائل کثرت سے مہیا رہیں تاکہ وقت پر کوئی پریشانی لاحق نہ ہو۔

روپیہ اور فوجیں

انبالہ کے خزانے میں اس وقت جتنا روپیہ تھا، وہ دیسی گارد کی نگرانی کی بجائے گورہ گارد کی نگرانی میں دے دیا گیا اور مختلف قصبات ضلع سے چھ فی صد سود پر قرضہ لیا گیا۔ کمانڈر انچیف شملہ سے آکر دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد میجر میٹ لینڈ نے مناسب سمجھا کہ نمبر ۵ دیسی پیادہ فوج کی جو کمپنیاں باقی رہ گئی ہیں، ان سے ہتھیار لے لیے جائیں۔ چنانچہ ۲۹۔ مئی کو ہتھیار رکھوا لیے گئے۔ روپڑ میں جن کمپنیوں نے بغاوت کی تھی، انھیں توڑ دیا گیا اور سپاہیوں کو تنخواہ بھی نہ دی گئی۔ جو دیسی افسر بغاوت میں شامل تھے، ان کے لیے موت کی سزا تجویز ہوئی۔

فیروز پور

پنجاب میں فیروز پور آلات و اسلحہ اور سامان جنگ کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس مقام پر دیسی فوج کے اندر مارچ ۱۸۵۷ء سے بے چینی شروع ہو گئی تھی۔ ایک سپاہی نے چربی والا کارتوس استعمال کیا تھا، اس کے ساتھ کھانا پینا سب نے بند کر دیا۔ جب میرٹھ اور دہلی سے تشویشناک خبریں آئیں تو مناسب سمجھا گیا کہ فوجوں

کی مختلف رجمنٹیں الگ الگ کر دی جائیں۔ پھر ایک رجمنٹ نے میگزین پر حملہ کر دیا۔ میگزین کو بچا لیا گیا لیکن چھاؤنی میں بہت سی عمارتیں نذرِ آتش ہوئیں۔ ان میں ایک گرجا بھی تھا۔ پھر وہ لوگ منتشر ہو گئے۔ ان میں بہت سے جا بجا گرفتار ہوئے۔ وہ یا تو مارے گئے یا قید کر دیے گئے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

شملہ شملہ میں فی الجملہ امن رہا۔ صرف دو مقامات کی کیفیت قابلِ ذکر ہے۔

۱۔ کسولی میں گورکھوں نے خزانہ لوٹا اور افراتفری پیدا کی۔

۲۔ سباتھو میں رام پرشاد بیراگی پر الزام لگایا گیا کہ اس نے خطوں کے ذریعے سے مختلف لوگوں کو ہنگامہ آرائی کا اشتعال دلایا۔ یہ خط پکڑے گئے اور کہا جاتا ہے کہ واقعی باغیانہ تھے۔ لیکن شملہ کے ڈپٹی کمشنر نے اپنی رپورٹ میں اقرار کیا کہ رام پرشاد بیراگی ان کے لکھنے کا مجرم نہ تھا۔ اس لیے کہ وہ بے چارا سادہ لوح پہاڑی تھا اور لکھنا پڑھنا جانتا ہی نہ تھا۔ نیز خطوں کے جعلی ہونے کی داخلی شہادتیں موجود تھیں۔ بایں ہمہ رام پرشاد کو انبالہ لے جا کر موت کی سزا دے دی گئی۔[1]

لدھیانہ لدھیانہ میں بھی ابتدا ہی سے تشویشناک صورت پیدا ہو گئی تھی۔ وہاں کے ڈپٹی کمشنر نے ضلع کے رؤسا سے امداد لے کر حالات پر قابو پائے رکھا۔ خزانہ محفوظ کر لیا اور پولیس کی نفری بڑھا لی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مولوی نے شہر کی آبادی کو بہت بھڑکایا تھا اور دو مرتبہ ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ ہنگامہ بپا ہو جائے۔ لدھیانہ میں کابل کے سدوزئی شہزادے بھی رہتے تھے۔ وہ مولوی صاحب کے بہت معتقد تھے اور گوجروں میں موصوف کو خاص اثر و رسوخ حاصل تھا۔ جب ادھر ادھر سے مزید فوجی سرکشی کر کے آئے تو مولوی صاحب موصوف نے اپنے معتقدوں

---

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ اول ص ۷۰-۱۷

کو ان کے ساتھ شامل ہو جانے کی ترغیب دی۔ سبز جھنڈا تیار کیا اور وہ دہلی روانہ ہو گیا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کی روش بھی معاندانہ تھی[۱]۔ غالباً ۱۱۔ جون کو ڈپٹی کمشنر نے شہر کے آدمیوں سے ہتھیار رکھوا لیے اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان ہتھیاروں سے گیارہ گاڑیاں بھر گئیں۔

جالندھر سے سرکش فوج کے آدمی پہنچے تو وہ قلعے پر قابض ہو گئے۔ انھیں خیال تھا کہ وہاں ساز و سامان مل جائے گا لیکن بارود کے سوا کچھ بھی نہ تھا اور انھیں کارتوسوں کی ضرورت تھی۔ وہ دوسرے دن چلے گئے تو ڈپٹی کمشنر نے قلعے کے اردگرد تین تین سو گز تمام مکان مسمار کرا دیے۔ ہندوستانیوں کو وہاں سے نکال دیا اور شہریوں سے جرمانہ بھی وصول کیا۔

باقی اضلاع

باقی اضلاع کے صرف چند واقعات قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ شام داس فقیر نے جو فرید کوٹ اور نابھ کے علاقے کا باشندہ تھا اور غالباً مہنت تھا۔ تین ہزار کا لشکر جمع کیا اور وہ جیتو پر حملہ آور ہوا۔ فیروز پور کا ڈپٹی کمشنر ۱۵۔ جون کو اس کے تعاقب میں گیا۔ لڑائی ہوئی جس میں شام داس گرفتار ہو گیا اور اسے اسی دن پھانسی دی گئی۔

۲۔ رانیا کے نواب نے سرسہ کو لوٹا تھا اور مغل سلطنت کی بحالی کا اعلان کیا تھا اسے فیروز پور میں پھانسی دی گئی۔

---

[۱] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ اول ص ۹۵-۹۶۔ ان مولوی صاحب کا نام کہیں مذکور نہیں۔ معلوم ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم لدھیانوی کے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء کے جہاد میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اغلب ہے انھیں میں سے کسی کی طرف اشارہ ہو۔ سدوزئی شہزادے ان کے بڑے معتقد تھے، بلکہ وہی انھیں لدھیانہ میں لانے کے ذمہ دار تھے۔

۳۔ رہتک میں راؤ طولارام نے بڑی بہادری سے جنگ کی۔ یہ شخص آخر میں ایران چلا گیا تھا۔

۴۔ تھانیسر میں رانگڑی کے قیدی جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے ہنگامہ بپا کرنے کی کوشش کی لہٰذا وہاں سے ممتاز و ذی اثر قیدیوں کو نکال کرانبالہ پہنچا دیا گیا۔

۵۔ پانی پت میں بھی خاصی دیر تک افراتفری پھیلی رہی۔

۶۔ پٹیالہ میں کچھ لوگ قید ہوئے۔ جنھوں نے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ وزیر اعظم نے انھیں رہا کر دیا۔ بعد ازاں کہا گیا کہ وہ غلطی سے رہا ہو گئے۔ انگریزوں کے بیانات سے مترشح ہوتا ہے کہ والیٔ پٹیالہ انھیں پھانسی یا قید کی سزاؤں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

جالندھر

جالندھر میں میرٹھ کے ہنگامے کی خبر ۱۱۔مئی کو ملی۔ اسی روز ایک دیسی افسر کو موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ اس سے پیشتر پھلور اور ہوشیار پور میں آتش زنی کی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ لیکن جالندھر بالکل محفوظ تھا۔ فوراً ایک جیش پھلور بھیج کر وہاں سے توپیں منگوائی گئیں تاکہ جالندھر کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جائے۔ کپور تھلہ قریب تھا وہاں کے راجا رندھیر سنگھ نے حکومت کی امداد میں حد درجہ سرگرم حصہ لیا۔ خزانے کی حفاظت کا پورا بندوبست کر لیا گیا اور گورا گارد اس کی حفاظت کے لیے مقرر ہو گئی۔ چونکہ اس واقعہ نے دیسی فوجیوں پر سخت برا اثر ڈالا اور انھیں خیال ہو گیا کہ وہ بے وجہ ناقابلِ اعتماد پائے ہیں لہٰذا خزانے کو دو حصوں میں بانٹ کر دیسیوں اور گوروں دونوں کو حفاظت کے ذمہ دار قرار دے دیا گیا۔ برقندازوں کی تعداد بڑھا لی گئی۔ سکھوں کی ایک نئی رجمنٹ بھرتی کی گئی۔ ۷۔جون کی رات کو جالندھر کی فوج بھی بگڑ گئی، لیکن اس نے کوئی غیر مناسب حرکت نہ کی اور چھاؤنی سے نکل گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ عجلت میں اس نے خالی کارتوس اٹھا لیے

اور گولی والے کارتوس چھوڑ دیے۔ تمام تحصیلداروں اور سرکاری افسروں نے حکومت کا کام بڑی سرگرمی سے انجام دیا۔ صرف ضیاءالدین تحصیلدار پھلور کی روش باقی سرکاری کارکنوں سے الگ رہی اس پر ڈپٹی کمشنر نے بے اطمینانی کا اظہار کیا اور اسے ملازمت سے برطرف کر دیا۔ جالندھر سے جو لوگ بھاگے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ نے حیرت انگیز تیزی سے منزلیں قطع کیں مثلاً وہ ۷۔ جون کو گیارہ بجے شب کے نکلے تھے۔ صبح کے پانچ بجے تک چالیس میل جا چکے تھے۔ پھر سنتوکھ گڑھ، بہرام پور، نند پور ہوتے ہوئے ۱۱۔ کو بجور پہنچے۔ گویا چونّن گھنٹے میں ایک سو تیس میل کا فاصلہ طے کر لیا[1]۔

ہوشیارپور

ہوشیارپور میں آتش زنی کی پہلی واردات ۳ مئی کو یعنی ہنگامہ میرٹھ سے کم وبیش ایک ہفتہ پیشتر ہوئی تھی۔ ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس فرد یا کس گروہ کا کام ہے۔ ۱۲۔ مئی کو دہلی اور میرٹھ کے ہنگاموں کی اطلاع پہنچی۔ ڈپٹی کمشنر نے پولیس کی تعداد بڑھالی، تحصیل کی عمارت کو حفاظت کے لیے زیادہ موزوں قرار دے کر استحکامات کر لیے اور توپیں بھی وہاں پہنچا دیں عورتوں اور بچوں کو دھرمسالہ بھیج دیا۔

سپاہیوں کے خطوط خفیہ خفیہ کھول کر پڑھے گئے تو معلوم ہوا کہ مختلف فوجوں کے درمیان نامہ وپیام سرگرمی سے جاری ہے۔

گھاٹوں اور راستوں کی حفاظت کا خاص انتظام کر لیا گیا تاکہ نہ سرکش فوجی داخل ہو سکیں اور نہ بھاگے ہوئے لوگ بچ سکیں۔

کانگڑہ

کانگڑہ کے صرف دو واقعات قابل ذکر ہیں۔

۱۔ نورپور کی دیسی فوج نے بہ طیب خاطر ہتھیار حوالے کر دیے۔

---

[1] میوٹنی رپورٹس پنجاب گورنمنٹ ریکارڈ جلد ہشتم حصہ اوّل ص ۱۸۹۔ بجور کالکا کے قریب مشہور مقام ہے۔

۱۰۔ "کلو" میں ایک ہنگامے کی صورت پیدا ہوئی جسے نظر بہ ظاہر ۱۸۵۷ء کی تحریک سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن اسے ممکن العمل بنانے کی فضا ۱۸۵۷ء ہی نے پیدا کی۔

پرانے راجائی خاندان کا ایک نمایندہ میاں گیان سنگھ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی وجہ سے افراتفری پیدا ہوئی تو انگریز کہتے ہیں کہ ایک شخص دعوے دار ریاست بن گیا۔ اس کا اصل نام معلوم نہیں کیا تھا، لیکن راجاؤں کے خاندان میں سے ایک شخص پرتاپ سنگھ تھا جس کے حقوق سکھوں نے مسترد کر دیے تھے۔ پھر وہ سواروں میں ملازم ہو گیا اور ۱۸۴۵ء کی جنگ میں بہ مقام مدکی مارا گیا۔ نیا دعوے دار کہتا تھا کہ پرتاپ سنگھ میں ہوں۔

جس پرتاپ سنگھ کے متعلق مشہور تھا کہ وہ مر چکا ہے، اس کی بیوی اور دوسرے رشتہ داروں نے بھی اعلان کر دیا کہ پرتاپ سنگھ یہی ہے۔ پھر کسی کو کیا شبہ رہ سکتا تھا۔ بہت سے لوگ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ انگریزوں نے اسے کلو میں گرفتار کیا اور کانگڑہ لے گئے۔ وہاں اسے اور اس کے مشیر بیر سنگھ کو پھانسی دے دی اور بہت سے ساتھیوں کو قید کر دیا[۱]۔ حالانکہ ان لوگوں کو ۱۸۵۷ء کے کسی واقعے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

---

[۱] میوٹنی رپورٹس پنجاب گورنمنٹ ریکارڈ جلد ہشتم حصہ اول ص ۲۱۱-۲۱۲۔

باب ۲

لاہور ڈویژن

لاہور

میرٹھ اور دہلی کے ہنگاموں کی خبر لاہور پہنچتے ہی تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ پھر جھوٹی افواہیں اڑنے لگیں۔ جن سے طبعاً سراسیمگی پیدا ہوئی۔ حفاظت کے لیے نئے جیش بھرتی کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ انارکلی کے عیسائیوں اور انگریزوں نے زور دے کر رضاکاروں کا ایک جیش تیار کرنے کی اجازت لی۔ گھاٹوں کی دیکھ بھال شروع ہو گئی۔ فقیروں، درویشوں اور بیراگیوں کی پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ حکم دے دیا گیا کہ لاہور کے قلعے میں اتنی خوراک جمع کر لی جائے، جو چار ہزار آدمیوں کو چھ ماہ کے لیے کافی ہو۔ یعنی اگر حالات بالکل ناسازگار ہو جائیں تو انگریز قلعے میں جا بیٹھیں اور وہاں سے حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہیں۔

فوج سے ہتھیار لے لیے

۱۲۔ مئی کو فیصلہ کر لیا گیا کہ میاں میر کی دیسی فوج سے ہتھیار رکھوا لینے چاہییں۔ یہ کام خاصا خطرناک تھا، لیکن ہتھیار رکھوا لینے کا منصوبہ ایسے انداز میں تیار کیا گیا کہ چند بڑے افسروں کے سوا کسی کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ اس رات کو انگریزوں نے ناچ کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ یہ تقریب بدستور قائم رہی اور رات رات گورا پلٹن کو پریڈ کے میدان میں پہنچا یا گیا۔ توپیں جا بجا نصب کر لی گئیں۔ پھر فوجوں سے کہا کہ مختلف مقامات پر دیسی سپاہ سرکشی اختیار کر چکی ہے، ہتھیار لے لینے کا مقصد یہ نہیں کہ آپ لوگوں کو ناقابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ آپ دوسری رجمنٹوں کے طرز عمل کی پیروی کرنا بھی چاہیں تو نہ کر سکیں اور خطرے سے

محفوظ رہیں۔ بہر حال وقت ایسا تھا کہ انتظامات اتنے پختہ تھے کہ سپاہیوں کو بے چون و چرا حکم ماننا پڑا

ہندوستانیوں پر آفت

ہندوستانیوں پر جو مصیبت آئی، وہ ناقابل تصور تھی انھیں ہر جگہ شک و شبہ ہی نہیں بلکہ انتہائی بے اعتمادی کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لیئے ملازمتوں کے سلسلے میں پنجاب آگئے تھے کہ انگریزوں نے پنجاب فتح کیا تو ہندوستانیوں کو ساتھ لے آئے۔ ۱۸۵۷ء میں سمجھا جاتا تھا کہ تمام طبقوں سے بڑھ کر ناقابل اعتماد ہندوستانی ہیں، پھر عام مسلمان اور سب سے آخر میں سکھ۔ چنانچہ پنجاب میں ہندوستانیوں کا داخلہ بند کر دیا گیا نیز ماہ جون کے اواخر تک ان تمام ہندوستانیوں سے ہتھیار لے لیے گئے جو پنجاب میں رہتے تھے[1]۔ ڈپٹی کمشنر لاہور کی ایک رپورٹ مظہر ہے کہ ہندوستانیوں کو ہری کے پتن سے واپس بھیجنے کا انتظام کر دیا تھا اور ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۷ء تک دو ہزار پانسو چھتیس آدمی جا چکے تھے[2]۔

۱۲۔جون کی رپورٹ

۱۲۔جون کی ایک رپورٹ میں، جو چیف کمشنر کے سیکرٹری کی طرف سے حکومت ہند کے محکمہ خارجہ کو بھیجی گئی تھی، دوسرے امور کے علاوہ مندرجہ ذیل اندراجات بھی موجود ہیں۔

> لاہور میں فوجی عدالتوں کا کام جاری ہے۔ گیارہ قیدیوں کو ملازمت چھوڑ کر بھاگ جانے کے باعث موت کی سزا دی گئی۔ جنرل گوون[3] نے اسے سزائے قید میں تبدیل کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ محض خوف کے باعث بھاگ گئے تھے۔ ۳۵ پیادہ فوج کے دو سپاہیوں کو انارکلی میں توپ دم کیا گیا، اس لیے

---

[1] میوٹنی رپورٹس (پنجاب گورنمنٹ ریکارڈس)، جلد ہشتم حصہ اوّل ص ۲۴۸۔ [2] الیضاً الیضاً ۲۶۵-۲۶۶۔ [3]

کہ وہ لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہے تھے۔ اس فوج کے دو دیسی
افسر اور ایک حوالدار اس جرم کو منظر عام میں لاتے تھے[1]۔

اگر یہ درست ہے کہ قیدی خوف کے باعث بھاگے تھے تو انھیں قید کی سزا دینا بھی کس بنا پر مناسب تھا؟ لیکن انگریزوں کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ اہل وطن کو انتہائی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار رہے تھے اور سزائیں حد درجہ وحشیانہ دی جارہی تھیں، مثلاً توپ دم کرنا۔ پھر یہ تو ایک رپورٹ ہوئی، خدا جانے اس سے پیشتر یا اس کے بعد کتنے آدمیوں کو کیا کیا سزائیں دی گئیں۔

پہلا قومی اعلان

دہلی میں بعض اعلانات بھی تیار کیے گئے تھے جو ہر جگہ بھیجے گئے تھے۔ لاہور کی رپورٹوں کے ساتھ چند ایسے اعلانات بھی شامل ہیں۔ پہلا اعلان خاصا طویل تھا، جو ان ہندؤوں اور مسلمانوں کی طرف سے شائع ہوا تھا، جنھوں نے دنیوی منافع سے بے نیاز ہو کر صرف مذہب اور دھرم کے بچاؤ کے لیے ظالموں سے جنگ کا تہیہ کیا تھا۔ اس کا مفاد یہ تھا۔

۱۔ انگریزوں نے محاصل بہت بڑھا دیے ہیں۔

۲۔ معززاور تعلیم یافتہ اصحاب کے لیے کوئی ذریعہ معاش باقی نہیں رہا۔ لاکھوں افراد ضروریات زندگی سے محروم ہیں۔

۳۔ اب حکومت ہر ایک کا مذہب بگاڑنے کے درپے ہے لہٰذا فوج نے ہتھیار اٹھائے کہ راندۂ مذہب ہو کر مرنے سے دونوں جہانوں میں رسوائی ہوگی۔

۴۔ اگر انگریز اس نازک وقت پر لوگوں کو مصالحتی اعلانات سے مطمئن کرنے کی کوشش کریں تو ہرگز نہ ماننا۔ ان کے وعدوں کا کچھ اعتبار نہیں۔

۵۔ اہل پنجاب کو بھی بیدار ہونا چاہیے۔ اٹھو، عورتوں کے جامے اتارو اور مردوں

---

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ اول ص ۱۲۶۔

کے لباس پہن کر میدانِ عمل میں آؤ۔

۶۔ حکومت کو مالیہ نہ دو۔ جو شخص اپنی حکومت قائم ہونے سے پہلے مالیہ دے گا اسے پشیمان ہونا پڑے گا اور جو شخص لوگوں یا مسافروں کو لوٹے گا اس کی جائداد ضبط کرنے کے علاوہ سخت سزا دی جائے گی[1]

دوسرا اعلان

دوسرا اعلان مختصر تھا۔ وہ دہلی کے ہندو اور مسلمان سپاہیوں کی طرف سے لاہور کے ہندو اور مسلمان سپاہیوں کے نام تھا! اس کا مفاد یہ تھا کہ انگریز ہمارے مذہبوں کے دشمن ہیں۔ ان سے نجات حاصل کرنی چاہیئے۔ کلکتہ سے پشاور تک کے تمام سپاہی دہلی میں جمع ہو رہے ہیں۔ تنخواہ کی ہرگز پرواہ نہ کرو۔ سب کے لیے بارہ بارہ روپے تنخواہ مقرر ہو چکی ہے۔ اس جنگ میں جو مسلمان مارا جائے گا وہ شہید ہوگا اور جو ہندو مارا جائے گا، بیکنٹھ باشی کہلائے گا۔ تمام سپاہیوں کو چاہیئے کہ اس اعلان کی دس دس بیس بیس، پچاس پچاس نقلیں کر کے پھیلا دیں۔

آخر میں مرقوم تھا:

> سپاہی کے ہتھیار اس کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ کسی کے زبانی حکم پر ہتھیار حوالے نہ کرنا۔ اس طرح بے دست و پا ہو جاؤ گے اور بزدلی کا داغ لگے گا۔ جب تک جسم میں جان ہے ہتھیار ہرگز نہ دینا اگر فرنگی سپاہی تمھارے مقابلے پر آجائیں تو انھیں ہرگز بچ کر نکلنے نہ دینا۔ اگر ایسا کرو گے تو تمھیں اپنے طرزِ عمل پر شرمندہ ہونا پڑے گا۔ ہم سب دہلی میں جمع ہیں۔ تم لوگ جگہ جگہ بکھرے پڑے ہو دیر کا سبب کیا ہے۔ اس اعلان کی ہدایت کے مطابق کاربند ہو جاؤ[2]

---

[1] منٹگمری رپورٹس جلد ہشتم حصہ اوّل ص ۲۵۵-۲۵۸ ۔ [2] ایضاً ص ۲۵۸-۲۵۹

اسی قسم کے دو اعلان سیالکوٹ میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا مضمون سیالکوٹ کے حالات میں پیش کیا جائے گا۔

۲۶ کی سرکشی

لاہور کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ۳۰ جولائی کو ۲۶ پیادہ فوج نے میاں میر میں سرکشی اختیار کی اور چھاؤنی چھوڑ کر چلی گئی۔ جن رجمنٹوں سے ۱۳ مئی کو ہتھیار لیے گئے تھے، ان میں سے ایک یہ رجمنٹ بھی تھی۔ یہ لوگ فی الجملہ اطمینان سے بیٹھے رہے اور کرتے بھی کیا جب کہ ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ انھوں نے خدا جانے کیا تدبیریں سوچیں کہ جب ان کا کمانڈر میجر سنسر، کوارٹر ماسٹر سارجنٹ کے ساتھ لائنوں میں گیا تو دو دیسی افسروں کے ساتھ ان دو انگریز افسروں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اور فوجی نکل گئے۔

اس وقت کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کدھر گئے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ان کا رخ گورداسپور کی طرف ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ امرتسر کے ڈپٹی کمشنر فریڈرک کوپر نے جو سلوک کیا۔ وہ ۱۸۵۷ء کے ان خونچکاں واقعات میں سے ہے جنھیں شقاوت و سنگ دلی میں اپنی مثال آپ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔ اسی وقت اندازہ ہو سکے گا کہ فریڈرک کوپر ڈپٹی کمشنری کے بجائے دراصل جلاد کے منصب کے لائق تھا اور جلاد بھی ایسا جیسے روئے زمین پر بہت ہی کم ملیں گے۔

امرتسر

امرتسر کے متعلق فریڈرک کوپر کی اپنی رپورٹ مظہر ہے کہ خزانہ قلعہ گوبند گڑھ میں پہنچا دیا گیا۔ جو لوگ بدمعاش تصور کیے جاتے تھے، ان سب کو پکڑ کر سڑکوں پر مشقت لی جانے لگی۔ چار نئی حوالاتیں قائم کر دی گئیں تاکہ جس شخص کے بارے میں ذرا بھی شبہ ہو اسے پکڑ کر بند کر دیا جائے۔ سپاہیوں کو شہر میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا۔ گوبند گڑھ کے قلعے میں تین مہینے کا راشن جمع کر لیا گیا۔ سپاہیوں کے خطوں پر کڑی نگرانی قائم کر دی گئی۔ کوپر لکھتا ہے کہ ایک

سازش کا سراغ ملا جس کا سلسلہ مسلمانوں نے شروع کر رکھا تھا، لیکن آپ کو معلوم ہے اس سازش کا ثبوت کہاں سے لیا گیا؟ ایک سکھ 'ڈولی سنگھ' کے ذریعے سے! چند دیسی عیسائیوں نے ڈولی سنگھ کے بیانات کی تصدیق کی! اس بنا پر سنگ دل کوپر نے مندرجہ ذیل مسلمانوں کو گرفتار کر لیا

۱۔ محمد شریف جو رسالدار برکت علی کا عزیز تھا۔ کوپر لکھتا ہے کہ خود برکت علی بھی میرے پہلو میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

۲۔ میر صاحب گھڑی ساز۔

۳۔ میاں صاحب، ایک درویش۔

۴۔ نور محمد خاں جو ۲۲۔ مئی کو دہلی سے نکلا تھا۔

۵۔ منشی رجب علی۔

ان سب کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ پھر کوپر کے ایک معتمد علیہ ہندو تحصیلدار ہر سکھ رائے نے بتایا کہ ایک مسلمان تھانیدار بھی ان لوگوں سے ملا تھا۔ کوپر نے اس تھانیدار کو ملازمت سے برطرف کر دیا[1] یہ ہر سکھ رائے شقاوت میں کوپر سے کم نہ تھا۔ ایک محترز سکھ رہنما بھائی مہاراج سنگھ کو بھی گرفتار کر لیا۔ پھر رادھا کرشن برہمن کو اس بناء پر پھانسی دے دی کہ وہ فوج میں بغاوت پھیلا رہا تھا۔

گوجرانوالہ اور گورداسپور گوجرانوالہ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ گورداسپور میں بھی وہاں کے ڈپٹی کمشنر نے زبردستی چند واقعات پیدا کر لیے مثلاً وہ لکھتا ہے۔

۱۔ خزانہ امرتسر بھیج دیا گیا اور جیل کی حفاظت کا خاص انتظام کرایا گیا۔

۲۔ دو آدمیوں نے باغیانہ الفاظ استعمال کیے انھیں سخت سزا دی گئی۔

---

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ اول ص ۲۷۱۔

۳۔ بعد میں چند ہندوستانیوں کے خلاف شکایات پیش ہوئیں، جو نہر باری دوآب کے محکمے میں ملازم تھے۔

۴۔ ایک ہندو سررشتہ دار اور ایک ایکسٹرا اسسٹنٹ، شام لال کے خلاف شبہ پیدا ہوا۔ شام لال کو بدل کر بٹالہ سے گورداسپور بھیج دیا گیا جہاں اس پر کڑی نگرانی قائم رہی۔ سررشتہ دار کو نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے گھر کی تلاشی لی گئی لیکن کوئی چیز نہ نکلی۔ پھر معلوم ہوا کہ رانی کٹھوچ نے اسے ایک پراسرار خط لکھا تھا، تفتیش پر اس کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

سیالکوٹ

سیالکوٹ میں فی الجملہ امن رہا۔ لیکن اچانک جولائی میں آگ بھڑکی اور سپاہیوں نے کئی انگریزوں کو قتل کر کے گورداسپور کا راستہ لیا۔ غالباً وہ دہلی جانا چاہتے تھے اور دہلی کا سیدھا راستہ وہی تھا جو انھوں نے اختیار کیا تھا۔ اسی زمانے میں نکلسن اپنے متحرک کالم کے ساتھ امرتسر پہنچا تھا۔ اسے جب یہ واقعات معلوم ہوتے اور اطلاع ملی کہ سیالکوٹ کی فوج گورداسپور کی طرف گئی ہے تو امرتسر سے گورداسپور کی طرف بڑھا۔ سیالکوٹ والوں نے ۱۲ جولائی کو گورداسپور سے نو میل اوپر راوی کو عبور کیا تھا۔ چند گھنٹے بعد ان پر نکلسن کا حملہ ہوا۔ جس پر تین سو کے قریب مقتول و مجروح ہوئے۔ جو باقی بچے وہ جسر دتہ (کشمیر و جموں) پہنچ گئے تھے۔ ۳۰ جولائی کی رپورٹ مظہر ہے کہ حکومت کشمیر و جموں نے انھیں گرفتار کر لیا اور چھ سو آدمی انگریزوں کے حوالے کر دیے۔ ان میں سے بہت سے صرف سائیس اور ملازم تھے۔ ایک سو چھبیس آدمی سپاہ میں سے تھے، ان سب کو گولی سے اڑا دیا گیا۔[۱]

قومی اعلانات

ہم لاہور کے بیان میں دو قومی اعلانوں یا اشتہاروں کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ بھی کہا تھا کہ سیالکوٹ کے سلسلے میں باقی اعلانوں یا اشتہاروں کا

---

[۱] میوٹنی رپورٹس جلد ہفتم حصہ اول ص ۱۷۲

ذکر آئے گا۔ وہاں بھی دو اعلان یا اشتہار باغ کے دروازے پر لگائے گئے تھے۔ پہلے کا مفاد یہ تھا کہ ہم مسلمان اور ہندو دس سال سے انگریزی راج کے ماتحت برباد ہوتے رہے۔ آخر ست گورو نے ہمارے لیے نجات کا راستہ پیدا کر دیا۔ انگریزوں کی عقل ماری گئی۔ انھوں نے ہمارا مذہب تبدیل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ "ست گورو" کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اشتہار لکھنے والا کوئی سکھ تھا۔ اور دس سال کی بربادی کا اشارہ بھی سکھوں کی حکومت کے زوال کی طرف ہے۔

دوسرا اشتہار انگریزوں کے نام ایک فرمان تھا جسے یہاں من وعن نقل کیا جاتا ہے۔

> تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب میں لاہور کی طرف کوچ کروں گا تو تمھارے لیے بچ نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ پنجاب کی فوج پوری کی پوری میرے ساتھ ہو جائے گی۔ یقین رکھو پنجاب کبھی تمھاری ملکیت نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس صوبے میں تمھاری ہڈیاں پیسی جائیں گی اور تم مشکلات میں پھنس جاؤ گے۔ تم اپنی بھلائی پہچانو اور فوراً یورپ چلے جاؤ۔ اس طرح تم بچ سکتے ہو۔ خدا نے تمھاری عقل پر پردے ڈال دیے ہیں۔ اب بھلائی کی بات تمھارے دلوں میں اتر ہی نہیں سکتی۔[1]

---

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہفتم حصہ اول ص ۲۵۹-۲۶۱

باب ۳

جہلم، لیّہ اور ملتان ڈویژن

جہلم ڈویژن جہلم ڈویژن میں سے گجرات اور شاہ پور میں کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ شاہ پور میں ٹوانوں نے مختلف جیش بھرتی کر کے انگریزوں کی خدمت میں پیش کر دیے اور انگریزوں کے عہدِ حکومت میں ان کے اعزازات کا آغاز یہیں سے ہوا۔ راولپنڈی اور جہلم کی فوجوں نے سرکشی اختیار کی اور بڑی کشمکش ہوئی۔ راولپنڈی کی رپورٹ مظہر ہے کہ دو رجمنٹوں کے چھبیس آدمی ہتھیار لے کر بھاگ گئے تھے۔ ان میں سے اکثر یا تو تعاقب میں مارے گئے یا گرفتار ہوئے اور انھیں موت کی سزا دی گئی۔ سات آٹھ کا ایک گروہ دس بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے پہاڑوں میں جا چھپا۔ ان کا پیچھا کیا گیا اور وہ سب سخت لڑائی کے بعد مارے گئے یا گرفتار ہو گئے[۱]۔ جہلم کی فوج نے بھی بڑی پریشانیاں اٹھائیں اور انجامِ کار تباہ ہو گئی۔

سرکاری بیان جو لوگ لڑتے ہوئے مارے گئے ان کے علاوہ سزا یافتہ لوگوں کے متعلق سرکاری بیان یہ ہے۔

فوجی عدالتوں کے سزا یافتہ	۱۰۸
دیوانی عدالتوں کے سزا یافتہ	۲۳۷
میزان	۳۴۵

یقین ہے کہ ان میں سے سب کو یا بیشتر کو موت کی سزائیں ملیں ان کے علاوہ

---

[۱] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ اول ص ۳۷۱

سات سو چھیاسی ہندوستانیوں کو ان کے وطنوں میں بھیج دیا گیا۔ یہ صرف جہلم کی کیفیت ہے[1] باقی حصوں میں جو مقتول و مجروح ہوئے یا انھیں پھانسیوں کی سزا دی گئی یا خارج کیا گیا، ان کی صحیح کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔

مری کی کیفیّت

ہزارہ سے کرال قوم کے افراد نے مری پر یورش کا ارادہ کیا تھا اور کچھ مدت تک خاصا خطرہ لگا رہا۔ مری میں انقلاب کے لیے تین آدمیوں نے زبردست کام کیا۔ وہ تینوں پٹنہ کے باشندے تھے، ایک ڈاکٹر رسول بخش، دوسرا ڈاکٹر سید امیر علی، تیسرا سید کرم علی۔ دونوں ڈاکٹر تو باقاعدہ سرکاری ملازم تھے۔ لیکن سید کرم علی قلعی گر کی حیثیت میں چکر لگاتا رہتا تھا اور اس نے اپنے خلوص، نیکی اور جوشِ حمیّت سے خاصا بڑا حلقہ پیدا کر لیا تھا۔

گرفتاریاں اور سزائیں

ہمارے پاس ان جوانمردوں کے کام کا کوئی مستند مرقع موجود نہیں۔ انگریزی بیانات مظہر ہیں کہ سید کرم علی کے متعلق مخالفانہ سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو اسے بلایا گیا، لیکن وہ اسی وقت بھاگ نکلا۔ تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ بڑی مشکل سے اس کا سراغ ملا۔ گرفتاری سے پیشتر اس نے اپنے مہلک زخم لگا لیا اور چارپائی پر ڈال کر اسے لاتے۔ آتے ہی بے تکلف اقبال کر لیا کہ بے شک میں انگریزی حکومت کے خلاف کام کر رہا تھا۔ افسوس کہ پہاڑیوں کی بزدلی نے میرے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہ بتایا۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو اسے پھانسی دے دی گئی۔

ڈاکٹر رسول بخش اور ڈاکٹر سید امیر علی بعد میں گرفتار ہوتے اور انھیں ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو موت کی سزا ملی۔ رپورٹ مظہر ہے کہ ان کے علاوہ بھی بہت سے ہندوستانی باشندے مجرم ثابت ہوتے۔

وہ زیادہ تر سید تھے اور دیسی معاشرے میں انھیں عزت و احترام کا مقام حاصل تھا۔[2]

---

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ اول ص ۲۸۶ ؛ [2] ایضاً ص ۳۵۸ - ۳۵۹ -

لیہ ڈویژن لیہ ڈویژن میں کوئی بڑا اور قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ فی الجملہ امن رہا۔ ضلع کے متعلق صرف تین واقعات درج ہیں۔

۱۔ ایک شخص نے کہا کہ اب پنجاب کے دروازے بند ہو جائیں تو انگریزوں کا خاتمہ ہے۔ اسے تازیانوں کی سزا دی گئی۔

۲۔ ایک شخص نے چپراسی سے کہا کہ تمھیں انگریزوں کی ملازمت کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ اسے ایک سال قید کی سزا ملی۔

۳۔ ایک گاؤں کے لوگوں نے ایک برقنداز پر حملہ کیا تھا اس گاؤں پر ایک سو روپیہ جرمانہ کیا گیا۔

غور فرمائیے کہ آیا یہ واقعات سزا کے لائق تھے یا ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ہوش وحواس بجا نہ تھے؟

مُلتان اب ہمیں ملتان ڈویژن کے حالات بیان کرنے ہیں، جو نسبتاً تفصیل کے محتاج ہیں۔ ملتان کی دیسی فوج سے ۱۰۔جون کو ہتھیار لے لیے گئے تھے۔ تاہم ہتھیار لے لینے سے دلوں کے جذبات اور سینوں کے ولولے نہیں چھینے جا سکتے تھے۔ اس دوران میں گردوپیش ہنگامے جاری تھے۔ گوگیرہ میں جو فوج تھی اسے بھی غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ جہلم سے جو فوج بھاگی تھی، اس کا ایک صوبیدار اور آٹھ سپاہی کشتی میں بیٹھ گئے تھے۔ راستے میں پکڑے گئے اور انھیں جھنگ میں موت کی سزا دی گئی۔ اس قسم کے ظلم وجبر کی خونچکاں داستانیں روزانہ سپاہیوں کے کانوں میں پہنچ رہی تھیں اور ان کے سینوں میں جوش حمیت اس طرح متلاطم تھا جیسے سمندر میں طوفان آجاتے۔

ناہر خان جس روز ملتان میں فوج سے ہتھیار لیے گئے اس روز ۶۹ رجمنٹ کے تین چار سپاہی بھاگ گئے تھے۔ ان میں سے ایک پکڑا گیا اور اسے موت کی سزا دی گئی۔ تاہم پھانسی سے ایک رات پیشتر اس نے جاں بخشی کے وعدے

پر تمام راز افشا کر دیے، جو اسے معلوم تھے، انھیں کی بناء پر نادر خاں صوبیدار میجر اور بعض دوسرے آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن جس سپاہی سے موت کی سزا نہ دینے کا وعدہ کرنے پر راز اگلوائے گئے تھے، اس کے بیان کے سوا اور کوئی شہادت بلا واسطہ یا بالواسطہ نہیں ملتی تھی۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اسیروں کو سزا کس بناء پر دی جائے اور نہ دی جائے تو انھیں کب تک اور کس بناء پر قید رکھا جائے۔

عجیب و غریب طریقے

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستانیوں کو بڑی کوشش اور اہتمام کے ساتھ پنجاب سے ہندوستان بھیجا جاتا تھا اس لیے خیال تھا، ساری بے چینی اور تشویش انھیں کی پیدا کی ہوئی ہے اور جب تک وہ موجود ہیں، بے چینی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ معلوم تھا کہ ۶۹ رجمنٹ کے دیسی افسروں نے بعض ہندوستانیوں کو ناقابلِ اعتماد یا بدمعاش قرار دے کر فوج سے خارج کرا دیا۔ انھیں میں سے ایک نے بتا دیا کہ ہندوستانیوں پر نزلہ کیوں گر رہا ہے؟ صرف اس لیے کہ وہ سازباز میں شریک ہونے کے لیے تیار نہ تھے!

گویا انگریز افسر خود ہندوستانیوں کو بے امتیاز نکالیں تو وہ سچے، تاہم اگر فوج کے بعض افسر کہیں کہ فلاں ہندوستانی کو قابلِ اعتماد نہ سمجھنا چاہیے تو ان افسروں کو سازشی قرار دے لینا جائز۔

شہادت کیونکر فراہم ہوئی؟

اتنی شہادت بھی کافی نہ تھی۔ کسی آدمی کو باہر سے فوج میں بھیجنا سہل نہ تھا اور کہ انگریز خود یہ حکم جاری کر چکے تھے کہ نہ کوئی دیسی سپاہی لائنوں سے باہر جائے اور نہ باہر سے کوئی آدمی اندر جا کر میل جول پیدا کر سکے۔ یوں شہادت فراہم کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ اب اس سلسلے میں ملتان کے انگریز کمشنر کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتا ہے:۔

اس غرض سے مختلف طریقے کام میں لائے گئے۔ ایک

طریقہ یہ تھا کہ مٹ۱ بے قاعدہ رسالے کے آدمیوں کو فقیروں کا
لباس پہنا کر دونوں رجمنٹوں[1] میں بھیجا گیا، خصوصی طور پر مٹ۶۹
میں تاکہ وہ ان لوگوں سے بات چیت کر کے بھید حاصل کریں،
جو کچھ نہ کچھ بتا سکتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ایک دیسی افسر کا
تعاون حاصل کیا گیا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ دونوں طریقے
کامیاب ہوتے[2]

کمشنر نے خود لکھا ہے کہ فقیروں کا بھیس پہن کر جانے والوں کو کئی مرتبہ ناکام لوٹنا پڑا۔ کسی نے کچھ بتایا ہی نہیں، لیکن وہ بار بار پھرے اور استدلال کے بجائے ٹانگوں سے زیادہ کام لیا۔ جو دیسی افسر امداد کے لیے تیار ہوا۔ اس کا نام برکت علی تھا، اور وہ وردی میجر کے عہدے پر مامور تھا۔ پھر ایک اور افسر شہ داد خاں اس کام میں شریک ہو گیا۔[3]

غرض اپنوں ہی کی غداری اور نااتفاقی کے باعث نہایت قیمتی جانیں انگریزی اقتدار کی قربانگاہ پر چڑھائی گئیں۔

صوبیدار میجر نابر خاں پر ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو الگ مقدمہ چلا۔ اس کے خلاف تین الزام تھے۔

۱۔ اس نے ۷۔ جون کو فوجیوں سے کہا، سرکار جو حکم دے، اُسے ضرور مانو، لیکن اگر تمھارے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں تو جہاں جاؤ گے ملازمت حاصل کر لو گے۔

۲۔ اس نے ۱۱۔ جون کو یہ کہا کہ رجمنٹ مٹ۶۹ صبح برباد کر دی جائے گی۔

۳۔ اپریل اور مئی کے مہینے میں رجمنٹ کی بے چینی کا اسے علم ہوا۔ مگر اس نے

---

[1] دونوں رجمنٹوں سے مقصود مٹ۶۹ اور مٹ۶۲ ہے جو ملتان میں تھیں اور دونوں سے ہتھیار لے لیے گئے۔ [2] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم ص ۱۵۔ [3] ایضاً

کھانا کھایا۔ صبح سزا کے لیے پوری طرح تیار تھے۔[۱]

لمحہ فکریہ اب یہاں چند نکتے پیش نظر رکھ لیجئے، جو اس دردناک داستان سے واضح ہوتے ہیں

۱۔ جن لوگوں نے فوجوں میں انگریزوں کے خلاف منصوبے تیار کیے وہ بڑے بہادر و جوانمرد تھے۔

۲۔ ان میں ہندو اور مسلمان کی تفریق نہ تھی۔ دیکھیے رجمنٹ کا صوبیدار میجر مسلمان تھا، لیکن اس کے دس ساتھیوں میں سے نو غیر مسلم تھے اور صرف ایک مسلمان تھا۔

۳۔ ان میں ضبط اتنا تھا کہ باہر کا کوئی آدمی راز معلوم نہیں کر سکتا تھا انگریزوں نے بڑے ہی پرپیچ طریقے اختیار کر کے ضروری شہادتیں فراہم کیں۔

۴۔ اگر اپنے غداری پر آمادہ نہ ہوتے تو انھیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس داستان سے یہ بھی واضح ہوگا کہ آزادی کا جذبہ عام نہ سہی، خاصا پھیلا ہوا ضرور تھا اور بڑے بڑے افسر اس سلسلے میں سرگرم کار تھے۔ ان کے متعلق یہ وسوسہ نہیں ہو سکتا کہ مالی ضرورتوں نے مجبور کر دیا تھا یا کوئی لالچ انھیں کھینچ کر اس میدان میں لے گیا تھا۔ یہی ناہر خاں کو دیکھیے، جسے صوبیدار میجر کا عہدہ حاصل تھا۔ ایسے مایہ ناز محبان وطن کی قربانیاں صرف اس وجہ سے وقت پر کارگر نہ ہو سکیں کہ اپنوں نے تعاون نہ کیا بلکہ وہ غیروں کے آلہ ہائے کار بن گئے۔ افسوس ہے کہ ان مجاہدوں کے وطن معلوم نہ ہو سکے۔

احمد خاں کھرل احمد خاں کھرل بڑا بہادر تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ افراتفری پھیل گئی ہے تو میدان عمل میں آگیا۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ

---

[۱] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم ص ۱۷۔۱۸

کمان افسر کو اطلاع نہ دی۔

سوچیے کہ یہ الزامات واقعی درست بھی ہوتے تو ان میں کون سی ایسی چیز تھی جو نابر خاں کو خوفناک مجرم بنا دیتی؟ بایں ہمہ اسے مجرم قرار دے کر ۲۴ جولائی کو پھانسی دے دی گئی۔

دس فوجی

نابر خاں کے سوا ۶۶ کے جن آدمیوں پر مقدمہ چلا۔ ان کے نام یہ تھے۔

نام	عہدہ
لچھمن تیواڑی	نائک
شیو سہارنے سنگھ	سپاہی
رام دولہ سنگھ	"
سیتارام سنگھ	"
مہی زام دوبے	"
ٹھاکر پانڈے	"
پرانگ سنگھ	"
اجودھیا انوستے	"
میر سبحان علی	"
لچھمن سنگھ	"

انھیں بھی بے تکلف موت ہی کی سزا سنائی گئی۔ رپورٹ مظہر ہے کہ پھانسی سے ایک رات پہلے نائک نے بار بار کہا، افسوس وقت پر کام نہ کیا۔ جو منصوبہ طے کر لیا گیا، اس کے مطابق عمل نہ ہو سکا۔ ان میں سے ایک نوجوان کی عمر بیس سال کی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، تو نائک بولا: افسوس ہتھکڑیوں اور بیڑیوں نے مجبور کر رکھا ہے ورنہ ابھی تمھارا گلا گھونٹ کر رکھ دیتا۔ رات کو انھوں نے خوب مزے سے

ہوئی کہ گوگیرہ کا جیل خانہ توڑنے کی کوشش کی گئی۔ یہ ۲۶ جولائی کا واقعہ ہے۔ کشمکش میں چالیس قیدی مارے گئے یا زخمی ہو گئے اور بیس بھاگ کر جنگل میں چلے گئے۔ اغلب ہے کہ احمدؒ خاں کے منصوبے کا یہ ابتدائی قدم ہو۔ ۱۷ ستمبر سے گوگیرہ میں ہنگامہ شروع ہوا اور سرکاری ڈاک روک دی گئی۔ گویا لاہور اور ملتان کے درمیان سلسلہ مخابرت کا رشتہ منقطع ہو گیا۔

اس ضمن میں دوسرے قبیلوں یا مختلف سرکردہ آدمیوں سے مدد لی گئی۔ احمدؒ خاں کے رفیقوں نے بار بار لڑائیاں کیں اور انگریزوں کے لیے ایسی مصیبت پیدا کر دی کہ وہ توپیں لیے جنگلوں میں دوڑے پھرتے تھے۔ کچھ مجاہد مارے گئے، کچھ ایسے بھی تھے جنھیں مختلف ذریعوں سے حوالگی پر آمادہ کر لیا گیا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ کسی نیم خودمختار یا من چلے سردار کی ویسی ہی حرکت تھی جیسی عام طور پر سرزد ہوتی رہتی ہے۔ احمدؒ خاں نے باقاعدہ اعلان کیا تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے مقصود شاہنشاہ دہلی کی حمایت ہے۔

احمدؒ خاں کی وفات

شدید کشمکشوں کے بعد ۱۲ جنوری ۱۸۵۸ء کو جنگل میں اس کا تعاقب کیا گیا۔ خاصی بڑی فوج اعلیٰ سازوسامان کے ساتھ اس کام کے لیے بھیجی گئی۔ احمدؒ خاں پہلے سے مقابلے کے لیے تیار تھا۔ انگریزی فوج قریب پہنچی تو احمدؒ خاں اور اس کے ساتھیوں نے آتش باری شروع کر دی۔ ان کی پہلی باڑ نے انگریزی فوج کے رسالدار کو ختم کر دیا اور اس کے بہت سے ساتھی بھی گولیاں کھا کر گھوڑوں سے گر گئے۔ اس طرح افراتفری پھیل گئی۔ انھیں پھر نالے پر جمع کیا گیا۔ اور لڑائی دوبارہ ہوئی۔ اس لڑائی میں احمدؒ خاں، اس کا بھتیجا مراد اور سارنگ مارے گئے۔ آخر الذکر بھی کھرلوں کے ایک قبیلے کا سردار تھا، لیکن احمدؒ خاں کے ساتھیوں نے مقابلہ نہ چھوڑا۔ وہ دریائے راوی کے کنارے لمبی گھاس کے اندر گھات میں بیٹھ گئے۔ بار کلے

فوج لے کر تعاقب میں پہنچا تو وہ مارا گیا۔ اس کے ساتھیوں میں پچاس کھیت رہے۔

پھر ان جواں مردوں نے ہڑپا کو لوٹا اور چیچا وطنی میں میجر چیمبرلین کا محاصرہ کر لیا۔ آخر کار بڑی مشکل سے یہ ہنگامہ فرو ہوا۔[1]

---

[1] میونٹی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم ص ۲۰۔۵۱

باب ۴

پشاور ڈویژن

تمہید پشاور ڈویژن کے مختلف اضلاع کی کیفیت کیا بیان کی جائے۔ یہ وہ حصہ تھا جہاں سے جہادِ آزادی میں امداد کی سب سے زیادہ امید ہوسکتی تھی جس کے باشندے بڑے غیور، بہادر اور آزادی کے حد درجہ شیدائی تھے، لیکن اس ڈویژن میں کوئی بھی حرکت نہ ہوئی جیسی کہ مثلاً ضلع سیالکوٹ میں ہوئی تھی اور جن رجمنٹوں نے آزادی کی راہ میں قدم رکھا وہ پشاور ڈویژن کی نہیں بلکہ ہندوستان کی تھیں اور ان کے بچے کھچے پناہ گیروں کے ساتھ سرحد کے بزرگوں، رئیسوں اور عوام نے جو سلوک مناسب سمجھا اس کے بارے میں یہاں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خونچکاں داستان آگے بیان ہوگی۔

یہاں صرف اتنا بیان کر دینا چاہیے کہ کوہاٹ اور پشاور میں دیسی فوجوں سے ہتھیار لے لیے گئے تھے۔ نیز یہی علاقہ تھا جہاں سے دہلی کے لیے متحرک کالم سب سے پہلے تیار کیا گیا اور اس نے جنرل نکلسن کی سرکردگی میں جو کچھ کیا وہ اگلے باب میں پیش کیا جائے گا۔ متحرک کالم کیوں تیار ہوا؟ اس لیے کہ انگریزوں کو مقامی رئیسوں، مختلف قبیلوں یا دوسرے ذی اثر لوگوں کی طرف سے کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا تھا۔

متفرق واقعات اس زمانے میں پشاور سے ایک اخبار نکلتا تھا۔ اس میں ایک خبر ایسی چھپ گئی تھی، جو انگریزوں کے نزدیک صحیح نہ تھی، اس بنا پر ایڈیٹر کو قید کر دیا گیا[1]۔ انگریزوں کی ہراس زدگی کا یہ عالم تھا کہ معمولی آدمیوں کو

---

[1] میورسٹی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم ص ۱۴۰

شبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے اور معمولی خطوط میں بغاوت کی رمزیں تلاش کرتے تھے مثلاً پشاور کے انگریز اسسٹنٹ کمشنر نے ایک فقیر کو گرفتار کیا اور خوب اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک خط نکلا جس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے[۱]۔

میرے محب ملا صاحب۔ السلام علیکم۔ بعد سلام ودعا گزارش یہ ہے کہ آپ اس خط کے پہنچنے پر فوراً عید کے دوسرے دن یہاں آئیں ضرور آئیں۔ اور اگر تکلیف نہ ہو تو چند سیر میوہ بھی لیتے آئیں۔ اب وقت ہے، دل میں خطرے کو جگہ نہ دیں۔ ایسا موقع پھر نہ آئے گا تاکید ہے کہ ضرور آئیں۔

فقیر ملا نعیم

ظاہر ہے کہ اس میں کوئی بات نہ تھی تاہم فقیر کو گرفتار کر لیا گیا اور کہا گیا کہ اس خط میں خاص رمزوں کے ذریعے مکتوب الیہ کو بغاوت پر آمادہ کیا گیا۔ پھر کہا گیا کہ رجمنٹ ۵۱ اور رجمنٹ ۶۴ کے درمیان باغیانہ خط وکتابت ہو رہی تھی۔ ایک خط بھی درج کیا گیا، جس کا مفاد یہ تھا کہ ۲۲ مئی کو کارتوس کاٹنے کے لیے پیش کیے جائیں گے۔ ہندو اور مسلمانوں کا مذہب ایک ہے۔ سب بھائیوں کو جان لینا چاہیئے، جو مناسب سمجھو کرو۔ یہاں تو سب میں بےاطمینانی پھیلی ہوئی ہے[۲]۔ کارتوسوں کے بارے میں جو تشویش ہندوؤں اور مسلمانوں کو تھی، وہ کسی تصریح وتشریح کی محتاج نہ تھی، اس میں بغاوت کا کون سا پہلو تھا اور انگریزوں کو کیوں اصرار تھا کہ جو کارتوس وہ بنا چکے ہیں انھیں ضرور بالجبر استعمال کرایا جائے۔

رجمنٹ ۵۵

اس رجمنٹ کے افراد نے آزادی کی راہ میں جو قربانیاں کیں وہ یگانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ اب ہمیں اس کے حالات بیان کرنے چاہییں۔

۱۔ میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم ص ۱۴۳۔ ۲۔ ایضاً ص ۴۳۔

اس کا مرکز مردان میں تھا اور اس کے دو دستے اٹک اور نوشہرہ میں بھی مقیم تھے۔ فتح خاں خٹک نے تباریخ ۲۱۔مئی انگریزوں کو خبر دی کہ جو دستہ اٹک کے گھاٹ پر مامور ہے، اس میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ ۲۲۔ کی رات کو خبر آگئی کہ مردان میں بھی ۵۵ نے سرکشی اختیار کرلی ہے۔ ۲۳۔ کو رات کے گیارہ بجے پشاور سے تین سو گورے، اڑھائی سو افراد بے قاعدہ رسالے کے، پولیس، متفرق سوار، آٹھ توپیں لے کر کرنیل چیوٹ[۱] کی سرکردگی میں مردان کی سمت روانہ ہوئے۔ نکلسن بھی ساتھ گیا، جو اس وقت پشاور میں تھا۔

اس فوج کے مردان پہنچتے ہی ۵۵ قلعہ چھوڑ کر بھاگ نکلی، صرف ایک سو بیس افراد باقی رہ گئے۔ نکلسن نے تعاقب کیا۔ رپورٹ مظہر ہے۔

> مردان سے سرحد سوات تک سارا دن دیہات میں ان کا شکار کیا گیا۔ ندیوں، نالوں میں ان سے کشمکش ہوئی۔ ٹیلوں پر سے انھیں بھگایا گیا۔ ان کی راہِ فرار میں ایک سو بیس لاشیں گنی گئیں۔ ان سے تین گنا زخمی ہوئے ہوں گے۔ ایک سو پچاس گرفتار ہوئے ...... خود نکلسن کی تلوار نے بہتیروں کو خاک میں ملایا۔[۲]

مدت کے بعد انگریزوں پر اس راز کا انکشاف ہوا کہ ۵۵ اور ۶۴ کے پاس سید احمدؒ شہید کی جماعت مجاہدین کے قاصد آتے رہتے تھے۔ وہ لوگ دو ہندوستانی مولویوں کے پاس ٹھہرتے تھے، جو علاقہ مردان میں مقیم تھے۔[۳]

سوات میں مجاہدین سے سلوک

وہ لوگ اس خیال سے سوات پہنچے تھے کہ وہاں کے مسلمانوں کو ساتھ لے کر بہتر قوت اور عمدہ تنظیم کے ساتھ انگریزوں پر حملہ آور ہوں گے اور سرحد سے انگریزوں کو خارج کر کے ملک کے جہاد آزادی میں ہاتھ بٹائیں گے، لیکن ان کے ساتھ سوات میں جو سلوک ہوا،

---

۱ CHUTE ۲ میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم ص ۵۱-۵۲۔ ۳ ایضاً ص ۱۵۲

وہ بڑا ہی دردناک نہ تھا۔

وہاں دس سال سے سید اکبر شاہ ستھانوی بادشاہ تھے، ان کا انتقال ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو، یعنی اسی روز ہوا، جس روز میرٹھ کی سپاہ دہلی پہنچی تھی۔ سید مرحوم کے بعد بادشاہی کا حق داران کا فرزند ارجمند سید مبارک شاہ تھا۔ انگریزی رپورٹ مظہر ہے کہ اہلِ سوات نے حضرت اخوند صاحب سوات[1] کے مشورے سے سید اکبر شاہ کو اس لیے بادشاہ بنایا تھا کہ اندیشہ تھا انگریز سوات پر قابض ہو جائیں گے۔ سید مرحوم کو وہ عشر دیتے تھے۔ ان کی وفات پر اہلِ سوات نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں خطرہ نہیں رہا، لہٰذا بادشاہی کی بھی ضرورت نہیں اور نہ ہم کسی کو عُشر دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے شہزادہ مبارک شاہ کی مخالفت شروع کر دی۔ شہزادے نے ۵۵ کے تمام آدمیوں کو اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ معاملہ حضرت اخوند کے پاس پہنچا۔

> اگر اس وقت اخوند صاحب دین کے مجاہد بن کر کھڑے ہو جاتے ہمارے خلاف جہاد کا اعلان کر دیتے، باہمی جھگڑے کو دبا کر دروں سے گزرتے ہوتے وادی پشاور میں اتر آتے اور ۵۵ کا رعب دوقار ان کے ساتھ ہوتا تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ موصوف ہماری رعایا میں مذہبی حمیت کی ایک ایسی روح پیدا کر دیتے جو تھوڑی دیر کے لیے دبی تو رہ سکتی ہے لیکن مادی اقبال مندی اس کی آگ کو ہمیشہ کے لیے افسردہ نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس اخوند صاحب نے ایکا ایک عام لوگوں کے نمایندوں کا ساتھ

---

[1] حضرت اخوند صاحب کا نام ملا عبد الغفور تھا۔ گزشتہ صدی کے یہ بہت بڑے بزرگ تھے ان کا مزار سوات کے دارالحکومت سیدو شریف میں ہے۔ موجودہ والیِ سوات حضرت اخوند صاحب کے پرپوتے ہیں۔

> دیا۔ ۵۵ء کے سپاہیوں کو رخصت کر دیا۔ رہبر مقرر کر دیے کہ انھیں
> املک پار چھوڑ آئیں اور نوجوان شاہ (شہزادہ مبارک شاہ) کو سوات سے
> نکال دیا۔[1]

العجب، ثم العجب

سوات کی بادشاہی اور ادائے عشر کا مسئلہ بالکل محدود حیثیت رکھتا تھا۔ اہلِ سوات کسی کو بادشاہ بناتے یا نہ بناتے، شہزادہ مبارک شاہ کو قبول کرتے یا نہ کرتے، اس معاملے کو آزادیِ پاک و ہند سے کیا تعلق تھا؟ اس سے یہ کیوں کر ثابت ہوتا ہے کہ انگریزوں کو پاک و ہند پر تسلط کا حق حاصل ہے اور انھیں ضرور اطمینان سے بیٹھے رہنا چاہیے۔

کاش اہلِ سوات یا حضرت اخوند صاحب اس معاملے کے مآل و انجام پر غور فرما لیتے۔ کاش یہ اندازہ کر لیتے کہ جو لوگ اپنے عقیدے کے مطابق وطن اور آزادی کی خاطر اچھی نوکریاں چھوڑ کر آئے ہیں اور انھوں نے دشمنوں کی گولیاں کھائی ہیں، جانیں دی ہیں، وہ بہتر سلوک کے مستحق ہیں۔ ان کی قربانیوں کو ایک خطے کے محدود شخصی مسائل سے وابستہ نہ کرنا چاہیے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ اس زمانے میں لوگوں کے دل و دماغ اور افکار و خیالات کن کن دوائر میں محدود تھے اور ان کی نظریں کس طرح چھوٹے چھوٹے حلقوں میں مقید تھیں۔ وہ وسیع معاملات پر غور و فکر کے لیے تیار ہی نہ ہوتے تھے۔ اس کی ایک اور عبرت خیز مثال وہ بھی ہے جو اوپر پیش کی جا چکی ہے۔

الٹی کی سرحد

سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عنایت علی عظیم آبادی اس وقت نارنجی (سرحد آزاد) میں تھے۔ ۵۵ء کے متعلق حالات معلوم ہوتے تو مولانا نے فوراً اپنے آدمی بھیج دیے کہ ۵۵ء کے سپاہی جہاں ملیں انھیں نارنجی لے آؤ۔ افسوس کہ تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی نہ مل سکے۔

---

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم ص ۱۶۹ – ۱۷۱

اب آئندہ منازل کی داستان آپ ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر کی زبان سے سنیے جو قصابی اور جلادی میں نکلسن یا نیل یا امرتسر کے ڈپٹی کمشنر فریڈرک کوپر سے کم نہ تھا۔ اس کا نام بیچر[1] تھا۔

کچھ معلوم نہیں کہ یہ غریب مجاہد سوات سے نکلے تو کہاں کہاں رہے۔ بیچر لکھتا ہے کہ ۲۳۔ جون کو ایبٹ آباد میں مجھے ٹیل (دادی کونش) کے ملک محمد خاں کا خط ملا جس کے ساتھ جمال خاں کا خط ملفوف تھا اور جمال خاں الئی کے جرگے کا بڑا با اثر رکن تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ چھ سو ہندوستانی جو فرنگیوں کی فوج سے بھاگے تھے، پروانۂ راہداری کے خواہاں ہیں۔ ایک اور قاصد خبر لایا کہ تعداد چھ سو نہیں بلکہ سات سو ہے۔ انھوں نے تاکوٹ سے اور پرشناسوں میں دریا عبور کیا اور جمال خاں کے گاؤں کی ندی کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں[2]۔

بیچر کی تگ و دو

اس کے بعد بیچر نے جو کچھ کیا، وہ اسی کی زبان سے سنیے[3]۔

۱۔ میرے پاس سادات کا غان، مظفر خاں رئیس نندھیاڑ کے بیٹے اور بعض دوسرے ذی اثر آدمی موجود تھے۔ میں نے انھیں روانہ کر دیا کہ اپنے آدمی جمع کرو اور پکھلی کے اوپر جتنے درے ہیں، انھیں روک لو۔

۲۔ الئی کا علاقہ آزاد تھا اور ہمارا قبضہ (انگریزوں کا قبضہ) کونش پر ختم ہو جاتا تھا۔ بیچ میں نندھیاڑ تھا۔ کونش محمد امین خاں ساکن گڑھی کی جاگیر میں تھا۔ میں نے محمد امین خاں کو حکم بھیجا کہ فوراً اپنی جاگیر میں چلا جائے اور مظفر خاں سے مشورہ کر کے ہندوستانیوں کو آگے جانے سے روکے۔

۳۔ میں خود ڈڈیال چلا گیا۔ اپنے جاسوس جگہ جگہ بھیج دیئے ان کی اطلاعات

---

[1] Becher
[2] اس گاؤں کا نام کرگ بتایا گیا۔ الئی بالائی ہزارہ کے ایک علاقے کا نام ہے
[3] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم۔

کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے پاس ہندوقیں ضرور ہیں، لیکن تن
پر کپڑا نہیں۔ نہ بیتہ اور اوس سے بچنے کا کوئی ذریعہ ہے۔ ان کے
ساتھ اخوند صاحب سوات کے قاصد ہیں۔ نیز اخوند صاحب نے تمام
مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ انھیں حفاظت سے آگے لے جائیں
اور جو ان کا مقابلہ کرے گا۔ اس کا ایمان زائل ہو جائے گا۔

حیرت انگیز سنگ دلی انسان جب کسی غیر مناسب راستے پر چلنے لگتا ہے تو انسانیت کے اکثر بنیادی تقاضوں کو بے تکلف پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ کیا کوئی آدمی عام حالات میں بہ سلامت ہوش و حواس یہ گوارا کر سکتا ہے کہ کوئی ہم جنس بلا وجہ سامنے مارا جائے؟ لیکن دیکھیے سرحد کے مختلف خوانین انگریزوں کی خوشنودی کے لیے کس درجہ سنگ دل بن گئے تھے۔ محمد امین خاں دگڑہی (حبیب اللہ خاں) اور مظفر خاں (نند حیاڑ) نے الٰئی پر حملے کی تجویز پیش کی تا کہ ہندوستانیوں سے لڑیں؛ کیا ہندوستانیوں نے ان کا کچھ بگاڑا تھا؟ ان کو کوئی نقصان پہنچایا تھا؟ وہ انگریزوں کے تسلط سے ملک کو پاک کرنا چاہتے تھے لیکن ان دو مسلمان رئیسوں کو ان کے خلاف انتہائی اقدام میں بھی کوئی تامل نہ ہوا کیوں؟ اس لیے کہ انگریز ان سے خوش ہو جائیں۔ بیچر نے اس لیے یہ تجویز مسترد کر دی کہ الٰئی پر حملہ سرحدِ آزاد میں نئی پیچیدگیاں پیدا کر دے گا اور آزاد قبائل ہندوستانیوں کے حامی بن جائیں گے۔

دردناک حالات ہندوستانی ۲۷ جون کو رائے سنگ نام ایک پہاڑ کی طرف بڑھے، جو نند حیاڑ کی سرحد پر تھا یعنی وہ پکھلی کی طرف آنا چاہتے تھے، جب انھیں معلوم ہوا کہ مظفر خاں کے آدمی تمام دروں کو روکے بیٹھے ہیں تو وہ غلام علی شاہ اور دل آرام شاہ کے گاؤں میں چلے گئے گویا پکھلی کی طرف آنے کا خیال چھوڑ دیا اور اوپر ہی اوپر کوہستان کا راستہ

اختیار کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

ان میں سے ایک جمعدار نے رائے دی کہ بھائیو! اس طرح بے مقصد پھرنے اور قدم قدم پر مزاحمت، قتل، بھوک اور برہنگی کا شکار ہونے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ مقابلہ کرنے والوں سے لڑیں اور مر جائیں۔ یہ رائے نہ مانی گئی تو وہ جمعدار اٹھا، بندوق کی نالی اپنے سینے سے لگا کر لبلبی دبا دی اور جاں بحق ہو گیا۔

حملے

بیچر پوری سرگرمی سے شمالی ہزارہ اور کاغان نیز کاغان سے ملے ہوئے کشمیری علاقے کے ذی اثر لوگوں کو تاکیدی پیغام بھیج رہا تھا کہ ایک بھی ہندوستانی کو رسد یا کپڑا یا جائے پناہ نہیں ملنی چاہیے۔ الئی، ننددھیاڑ، کونش اور کاغان کے تمام رئیس خوانین و سادات پہلے ہی سے مامور تھے۔ اب کشمیر اور کاغان کے درمیانی علاقے کے ایک رئیس شیر احمد خاں کو بھی، جو ریاست کشمیر کا باج گزار تھا، حکمنامہ پہنچ گیا، پٹیالہ کا راجا اور اس کے وزیر تو انگریزوں کے حامی ہونے کے باوجود مجاہد اسیروں کو انگریزی تعزیرات سے بچانے کی تدبیریں کرتے رہے۔ مگر سرحد کے ان امیروں اور رئیسوں کو ایسا کوئی احساس نہ تھا، بلکہ انھوں نے اب کھلم کھلا حملے شروع کر دیے۔ عورتیں اور مرد ہندوستانیوں کو "کالے" کہنے لگے تھے، اس لیے کہ ان کے رنگ ویسے سفید نہ تھے، جیسے مذکورہ بالا علاقوں کے لوگوں کے تھے۔ وہ لوگ کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے، سرحدی عورتوں کو اس بات پر بھی حیرت تھی۔ خدا جانے ان حملوں میں کتنے مرے اور ان پر کیا حالت گزری۔

آخری منزلیں

۵ جولائی ۱۸۵۸ء کو وہ "نیلی ندی" پر مقیم تھے، جو دریائے اٹک (اباسین) کی ایک معاون ہے اور ان کی جائے قیام کا نام "بیلہ سانپان" تھا۔

بیچر کی رپورٹ مظہر ہے۔

۱۔ بعد دوپہر چھ ہندوستانی رسد لینے کے لیے گاؤں میں آئے اور انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے دو کسی طرح بچ کر نکل گئے اور ساتھیوں کو متنبہ کر دیا۔

۲۔ سید اور کوہستانی ہر طرف سے ان پر ہجوم کی شکل میں بڑھے اور اونچے ٹیلوں پر سے آتش بازی شروع کر دی۔

۳۔ لڑائی اگلے دن بھی کچھ دیر تک جاری رہی۔ بہت سے ہندوستانی مقتول و مجروح ہوئے۔ آخر انھوں نے ایک ہلہ کر کے ندی کے پل پر قبضہ کر لیا اور گاؤں بھی لے لیا۔ پھر ایک ملا آگے بڑھا، جسے حضرت اخوند صاحب سوات کا پیغام مل چکا تھا اور اس نے سب کو آزار رسانی سے منع کر دیا۔

۴۔ کاغانی سیدوں نے مجھے (بیچر کو) پیغام بھیج دیا جس میں حالات بتائے اور یہ بھی کہا کہ کچھ قیدی ہم ساتھ لا رہے ہیں۔ میں نے انھیں تاکید کر دی کہ ہندوستانی آگے بڑھیں گے تو ان کی سرحد کے پاس سے گزریں گے لہٰذا مزید شکار کا موقع موجود ہے۔

۵۔ شیر احمد خاں نے بھی حکم ملتے ہی آدمی اپنی سرحد کے ساتھ ساتھ گزرگاہوں پر متعین کر دیئے۔

قتل و خون

۱۵۔ جولائی کو سادات کاغان چند ہندوستانیوں کے ساتھ بالاکوٹ پہنچے۔ ان میں سے تیرہ شنکیاری لائے گئے اور قصبے سے ذرا بلندی پر پھانسی کا کٹکر نصب کیا گیا۔ وہاں انھیں پھانسی دی گئی۔ ان کی درخواست صرف ایک تھی کہ ہمیں توپوں سے اڑایا جائے۔ جس مُلا نے ٹیلہ سانپاں میں ہندوستانیوں کو بچایا تھا وہ انھیں چیلاس کے ایک مقام کوٹے گلی میں لے گیا۔ وہ کوٹے گلی سے چلے تو بالائی کاغان کی ایک مشہور جھیل لالوسر کے پاس گوری نارہ میں پہنچے۔ یہ سنتے ہی سادات کاغان ہتھیار باندھ کر وہاں پہنچ گئے۔

بارش ہو رہی تھی، پہاڑوں پر دھند تھی۔ ہندوستانیوں نے تھوڑی سی مزاحمت کی، جس میں کچھ مارے گئے، باقی حوالگی پر آمادہ ہو گئے۔ یہ کل ایک سو چوبیس تھے، جن میں سے

دو سو بیدار تھے۔ ایک سو بندوقیں ہاتھ میں آئیں۔ ان میں سے چند ایک کے سوا جن میں سے دو سکھ تھے، سب کو ہزارہ کے مختلف مقامات پر پھانسیاں دی گئیں۔

بیس روز بعد مہاراجہ کشمیر نے پینتالیس حوالے کیے، جو اس کی ریاست کی حد میں پہنچ گئے تھے، انھیں بھی موت کی سزا ملی۔ بعد میں بھی گوجروں نے چھ آدمی پکڑے جو مسلمان ہو چکے تھے۔ ۵۵ کے باقی آدمیوں میں سے بعض مذہب تبدیل کر کے الئی کی مسجدوں میں مقیم ہو گئے، بعض چیلاس چلے گئے۔[1]

مقامی روایت

مستند مقامی روایت یہ ہے کہ جن ہندوستانیوں نے اپنے آپ کو حوالے کیا تھا، انھیں سادات کاغان نے حفاظت کا یقین دلایا تھا اور اس غرض سے قرآن پر حلف اٹھائے تھے، لیکن بدعہدی کی۔ اس بارے میں ایک مقامی گیت سید عبدالجبار شاہ مرحوم ستھانوی نے "کتاب العبرۃ" میں درج کیا ہے۔

کالے آلتھے کاغان — سیداں چا کیتے قرآن
کالے کوڑے راہ تو چھلے
سچے دین تے چلے
کالے آلتھے وچ کسیاں — انہاں سیداں جاگاں دیاں
کالے کوڑے راہ تو چھلے
سچے دین تے چلے

یعنی کالی فوج کے سپاہی کاغان میں اترے۔ سیدوں نے قرآن پر حلف اٹھا کر ان کی حفاظت کے وعدے کیے۔ کالے بے دینی کا جھوٹا راستہ ترک کر کے سچا دین

---

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم ص ۱۱۱ تا ۱۲۰۔ میں نے سرگزشت مجاہدین میں بھی ۵۵ کے کچھ حالات لکھے تھے، اس وقت تک بیچر کی رپورٹ میری نظر سے نہیں گزری تھی۔

اختیار کر چکے تھے۔ کالی فوج کے سپاہی محفوظ وادیوں میں اتر پڑے تھے۔ جہاں کسی کو ان کا سراغ نہیں مل سکتا تھا۔ کاغانی سیدوں نے ان کی جگہیں بتائیں اور راز فاش کیا۔ کالے بے دینی کا راستہ چھوڑ کر سچا دین اختیار کر چکے تھے۔

رجمنٹ ۵۱

جن فوجوں کو غیر مسلح کیا گیا تھا، ان میں سے ایک ۵۱ بھی تھی۔ اسی زمانے میں کنٹر کے ایک سید سید امیر نے خیبر میں ہنگامہ آرائی شروع کی، ساتھ ہی فوجوں میں بے چینی بڑھ گئی۔ ۲۸ اگست کو رجمنٹ ۵۱ بھاگ نکلی۔ افریدی سپاہیوں نے اس کا تعاقب کیا۔ دوسرے سپاہی بھی اس میں شامل ہو گئے۔ پشاور سے جمرود تک سلسلہ تعاقب جاری رہا۔ ۵۱ کا انجام بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جس کی نفری آٹھ سو اکہتر تھی، ان میں صرف تینتیس نہیں بھاگے تھے۔

پنجاب انفنٹری کی گولیوں سے مقتول	۱۲۵
ضلع پولیس کے ہاتھوں مقتول	۴۰
ملتانی رسالے کے ہاتھوں مقتول	۱۵
دیہاتیوں کے ہاتھوں مقتول	۳۶
سزائے موت بتاریخ ۲۸۔ اگست	۱۸۷
〃 〃 〃 ۲۹ 〃	۱۶۸
〃 〃 〃 〃 〃	۸۴
جمرود کی پولیس کے ہاتھوں مقتول	۵
اسیر	۱۱۰
میزان	۷۷۰

آٹھ سو اکہتر میں سے تینتیس نکال دئے جائیں تو بھاگنے والے آدمی آٹھ سو اڑتیس تھے۔ باقی فوجوں کی کیفیت اوپر درج ہے۔ ساٹھ بچ کر پہاڑوں میں پہنچ گئے اور باقی

آٹھ کے بارے میں کوئی صحیح رپورٹ نہ مل سکی[1]۔ گویا یہ فوج بھی بے سود تباہ ہوئی۔

انگریزی راج کی بھینٹ

ہربرٹ ایڈورڈ نے جو پشاور کا کمشنر تھا اپنی رپورٹ میں ایک نقشہ بھی دیا ہے جس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ فوجی عدالتوں نے ۱۸۵۷ء میں صرف پشاور کے اندر کتنے آدمیوں کو موت کی سزائیں دیں۔ یہ نقشہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے جو ۲۰۔ مئی سے ۱۲۔ ستمبر تک کے اعداد پر مشتمل ہے۔

طریق سزا	تعداد
پھانسی	۲۰
توپ دم	۴۴
گولی سے مارے گئے	۴۵۹
میزان[2]	۵۲۳

یہ خون اس لیے بے دریغ مہیا کیا گیا۔ کہ انگریزی راج کی بنیاد پختہ ہو جائے اور انگریز ہمیشہ کے لیے ہندوستان کے ماتھے پر ذلت کا داغ بنے رہیں۔

---

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ دوم ص ۱۷۵ ۔ [2] ایضاً ص ۱۷۹ ۔ ۱۸۰

باب ۵

خونچکاں المیہ

نمے دانم حدیث نامہ چون است
ہمے دانم کہ عنوانش بہ خون است

انبالہ ڈویژن

اب آپ کی خدمت میں انگریزوں کے کارنامہ ہائے خونریزی اختصاراً پیش کیے جاتے ہیں۔ انبالہ ڈویژن میں کوئی خاص ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ بایں ہمہ کمشنر کی رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ کم و بیش دو سو اٹھاون اشخاص کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اور ایک سو دو کو قید کی سزائیں ملیں۔ تفصیل یہ ہے۔

ضلع	مقتول	سزائے موت
انبالہ	۱۳۵	۲۹
تھانیسر	۰	۰
لدھیانہ	۵۰	۱۶
فیروزپور	۱۵	۱۳
شملہ	۰	۰
میزان	۲۰۰	۵۸ [1]

یہ صرف ان لوگوں کی فہرست ہے جو انگریزوں کے نزدیک آزادی کے طلبگار تھے۔ مزید ایک سو تیس آدمیوں کو ڈاکو قرار دے کر پھانسیاں دی گئیں۔

---

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ اول ص ۳۰

لاہور ڈویژن لاہور، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کے متعلق اعداد نہیں مل سکے، باقی اضلاع کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ امرتسر:

مقتول	۴۷۶
پھانسی	۲
قید میں موت	۲
سیشن سپرد	۱۷
قید	۱۲
زیر تفتیش	۳۳
لاہور بھیجے گئے	۵۱
میزان	۵۹۳ [۱]

۲۔ گورداسپور

پھانسی	۸۰
قید	۲۳
میزان	۱۰۳

جہلم ڈویژن بعض اضلاع کے اعداد معلوم نہ ہو سکے۔ جن کے بارے میں اطلاعات مل سکیں، ان کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

---

[۱] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ اول ص ۲۷۰ : [۲] ایضاً ص ۳۰۱

راولپنڈی: (سول اور فوجی دونوں کے ماتحت)

توپ دم	۱۹
گولی سے اڑائے گئے	۰
عمر قید	۱۲
قید (ایک سال سے چودہ سال تک)	۳۸۰
میزان	۴۱۴ [1]

جہلم:

سزائیں (فوجی عدالت)	۱۰۸
" (سول عدالت)	۲۳۷
میزان	۳۴۵ [2]

جو لڑتے ہوئے مارے گئے، وہ الگ ہیں۔

مری:

سزائے موت	۱۵
عمر قید	۹
قید (ایک سال سے چودہ سال تک)	۱۹۳
میزان	۲۱۷ [3]

ملتان ڈویژن کے متعلق بھی اعداد نہیں مل سکے۔ پشاور ڈویژن کے بارے میں بیشتر حقائق پہلے پیش کیے جا چکے ہیں۔

---

[1] میوٹنی رپورٹس جلد ہشتم حصہ اول ص ۳۷۴-۳۷۵ :۔ [2] ایضاً ص ۳۸۶ یہ اعداد پہلے بھی پیش کیے جا چکے ہیں :۔ [3] ایضاً ص ۳۶۰

۲۶ ؎

اب ہمیں ایک ایسا المیہ پیش کرنا ہے جس کی شاید کوئی بھی نظیر ۱۸۵۷ء کے واقعات میں نہیں مل سکتی، اِلّا یہ کہ ۵۵ اور ۵۱ کی تباہی کو دوسرے نقطۂ نگاہ سے نظیر بنا لیا جائے۔ یہ ۲۶ رجمنٹ کی تباہی تھی جو میانمیر میں مقیم تھی۔ اگرچہ اسے ہنگامے کے آغاز ہی میں غیر مسلح کر دیا گیا تھا، تاہم اس کے جذبات و احساسات بدستور تازہ تھے۔ ۳۰۔ جولائی کو اس رجمنٹ نے سرکشی اختیار کی۔ اپنے کمان افسر اور سارجنٹ میجر کو مارا اور بھاگ نکلی۔ اس وقت شدید آندھی آئی ہوئی تھی، کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ فوج کدھر گئی ہے۔

سرکشی کی کیفیت یوں بیان کی جاتی ہے کہ پرکاش سنگھ نام ایک سپاہی، جو اپنے آپ کو پرکاش پانڈے کہتا تھا، یکایک ایک جھونپڑی سے نکلا اور تلوار بلند کر کے پکارا فرنگیوں کو قتل کر دو۔ اسی نے سب سے پہلے میجر پر حملہ کیا پھر سکھوں کی جو پلٹن بھرتی کی گئی تھی، اس نے گولیاں چلا دیں۔ اسی وقت ۲۶ کے سپاہی بھاگ نکلے۔[1]

تلاش و تجسّس

یہ اطلاع ملتے ہی سمجھا گیا کہ وہ لوگ جنوب کی طرف جائیں گے اور ہری کے پتن سے دریا عبور کریں گے۔ چنانچہ ایک دستہ لاہور سے اور دوسرا امرتسر سے ہری کے پتن کی طرف بھیج دیا گیا۔ اس اثنا میں اطلاع ملی کہ ۲۶ کے سپاہی گورداسپور کی طرف جا رہے ہیں۔ اغلب ہے، ان کی منزل مقصود کشمیر ہو۔

۳۱۔ جولائی کو یہ لوگ دریائے راوی کے کنارے وردیاں پہنچے اور سلطان چوکیدار سے گھاٹ کا پتہ پوچھا۔ اس شخص نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ تو وہی لوگ ہیں، جن کی تلاش میں انگریز دوڑ سے پھرتے ہیں۔ چال یہ چلی کہ اپنے آپ کو بے خبر ظاہر کیا اور بتایا

---

[1] فریڈرک کوپر کی کتاب، انگریزی نام کرائسس اِن دی پنجاب (پنجاب میں نازک حالات) ہے ص ۱۵۲

کہ میں اپنے بیٹے کو آپ لوگوں کے ساتھ کر دیتا ہوں۔ اسے گھاٹ کا پورا حال معلوم ہے۔ بیٹے کو ان کے ساتھ کر کے خود آٹھ بجے صبح پیدل بھاگا اور دس بجے اجنالہ پہنچ کر وہاں کے تحصیلدار دیوان پریم ناتھ[1] کو اطلاع دے دی کہ ۲۶ کے سپاہی گھاٹ پر پہنچ گئے ہیں، جو کچھ ہو سکتا ہے کر لیجیے۔

جنگ اور اسیری

تحصیلدار فوراً پولیس کی جمعیت لے کر فوجیوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا اور تیز رفتار قاصد کو اس نے فریڈرک کوپر کے پاس بھیج دیا جو اس زمانے میں امرتسر کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ غرض تحصیلدار موقع پر پہنچا تو سخت لڑائی ہوئی جس میں ۲۶ کے ڈیڑھ سو آدمی مارے گئے اور باقی لوگ دریا کے بیچ میں ایک جزیرے کے اندر جا بیٹھے۔ یہ جزیرہ کنارے سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا، دو سو گز لمبا ہوگا اور ایک سو گز چوڑا۔

فریڈرک کوپر شام کے چار بجے امرتسر سے دریا پر پہنچا اور اس کے ساتھ اسی یا نوّے سوار تھے۔ کنارے پر دو کشتیاں تھیں۔ بڑے حسن تدبیر سے فوجیوں کو گرفتار کر کے کشتیوں میں کنارے پر لائے۔ سب گرفتار نہ ہوئے۔ بہت سے دریا میں کود پڑے اور ڈوب گئے۔ وہاں سے چھ میل اجنالہ تھا۔ یہ فاصلہ آہستہ آہستہ طے کر کے آدھی رات کے وقت سارے قیدی اجنالہ پہنچا کر پولیس کے تھانے میں بند کر دیے گئے۔ فریڈرک کوپر کا خیال تھا کہ اسی وقت انھیں موت کی سزا دے دے لیکن سخت بارش ہو رہی تھی، اس لیے سزا کا معاملہ صبح پر ملتوی کرنا پڑا۔ صبح کے وقت مزید چھیاسٹھ آدمی گرفتار ہو کر آ گئے۔

جلّاد کوپر

اب دو سو بیاسی آدمی اجنالہ کے تھانے میں جمع ہو چکے تھے جنھیں صبح کے وقت ایک برج میں بند کر دیا گیا۔ بہت سے رسّے منگوا

---

[1] میوٹنی رپورٹس میں اس کا نام پران ناتھ بتایا گیا ہے (جلد ہشتم حصہ اول ص ۲۷۴)

لیے گئے تاکہ انھیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں بہ یک وقت پھانسی دی جاسکے۔ سکھوں کا ایک دستہ بلالیا گیا، تاکہ ضرورت پڑے تو سب اسیروں کو گولی کا نشانہ بنادیا جائے پولیس کے تھانے سے ایک سوگز کے فاصلے پر ایک خشک کنواں تھا، اسے لاشیں پھینکنے کے لیے تجویز کیا گیا۔ یکم اگست کو تمام مسلمان سوار رخصت کر دیے گئے تاکہ وہ امرتسر جاکر عید منائیں۔ صرف کوپر، تحصیلدار اور سکھ فوجی یا پولیس کے سکھ جوان یا سکھ رئیس وہاں رہ گئے۔

اجنالہ کے ارد گرد پہرے کھڑے کر دیے گئے تاکہ کوئی آدمی تھانے کی طرف نہ آنے پائے۔ دس دس کے جتھوں میں قیدیوں کو باہر لایا جاتا، ان کے نام اور پتے لکھ لیے جاتے اور اس جگہ بھیج دیا جاتا، جہاں سکھ سپاہی انھیں گولیاں مارنے کے لیے متعین تھے۔ کوپر نے خود لکھا ہے کہ انھیں قتل گاہ کی طرف بھیجا جاتا تو وہ غصّے اور جوش کی حالت میں مجھ سے کہتے کہ ٹھہرو تمھارے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔ کبھی سکھوں کو طعنے دیتے۔ کبھی گنگا جی کو مدد کے لیے پکارتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ سب یا زیادہ تر ہندو تھے ڈیڑھ سو قیدی موت کے گھاٹ اتارے جاچکے تو گولیاں چلانے والے سکھوں کے دستے میں سے ایک کو غش آگیا۔ لہٰذا سزائے موت کے نفاذ کا سلسلہ تھوڑی دیر کیلئے ملتوی کرنا پڑا۔

کال کوٹھڑی

دو سو تیس مارے جاچکے تو اطلاع ملی کہ باقی لوگوں نے باہر نکلنے سے انکار کر دیا ہے۔ خیال تھا کہ دروازہ کھلتے ہی وہ ایک دم باہر نکلیں گے اور لڑائی ہوگی، لہٰذا پہرے کا خوب بندوبست کرلیا گیا تھا، لیکن:۔

> باقی باغیوں پر جو واقعی خوفناک آفت نازل ہو چکی تھی اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ وہ سزا تے موت پانے سے چند گھنٹے پیشتر کیفر کردار کو پہنچ چکے تھے۔ دروازے کھولے گئے اور دیکھا گیا تو وہ قریباً مر چکے تھے۔
>
> ہال ویل کی کال کوٹھڑی کا المیہ نادانستہ دہرایا جاچکا تھا۔ سواروں، پولیس، تحصیل کی گارد اور جوش میں آتے ہوئے دیہاتیوں کے شور و غل

اور پکار کے باعث کسی کی چیخ تک نہ سنی گئی۔ پنپا نیس جسد باہر
نکالے گئے، خوف، تکان، گرمی اور دم گھٹنے کے باعث وہ ختم ہو
ہو چکے تھے، انھیں بھی اجنالہ کے بھنگیوں کے ذریعے سے مشترکہ گڑھے
میں ڈلوا دیا گیا۔[۱]

یہ خود اس شخص کا بیان ہے جو سب کو بے دردی سے قتل کرانے کا ذمہ دار تھا، یعنی فریڈرک کوپر۔ کال کوٹھڑی کا واقعہ تو محض ایک افسانہ تھا جو دروغ باف ہال ویل نے تراشا تھا، لیکن اجنالہ میں واقعی ایک شقی القلب انگریز نے اس کا عملی نقشہ پیش کر دیا۔ اجنالہ میں اس کنوئیں پر ایک اونچی قبر بنا دی گئی جس کا نام "مفسد گھر" رکھا گیا۔[۲]

شقاوت نوازی

آپ شاید سمجھیں کہ فریڈرک کوپر پنجاب میں بلحاظ شقاوت اکیلا تھا۔ نہیں، جان لارنس چیف کمشنر اور رابرٹ منٹگمری جوڈیشل کمشنر نے اس کے نام تبریک کے خطوط بھیجے اور اس فعل کی تعریف کی۔ لارنس لکھتا ہے: میں ۲۶ کے مقابلے میں کامیابی پر مبارک باد کہتا ہوں۔ منٹگمری کہتا ہے۔

جو کام آپ نے کیا، اس کا پورا اعزاز آپ کے لیے مخصوص ہے۔ آپ
نے بہت اچھا کیا۔ تذبذب یا تاخیر یا پس روی کا موقع ہی نہ تھا۔ یہ
فعل زندگی بھر آپ کے لیے طرۂ افتخار رہے گا۔[۳]

کوپر نے خود لکھا۔

کان پور میں بھی ایک کنواں ہے لیکن ایک کنواں اجنالہ میں بھی ہے۔[۴]

کان پور کے کنوئیں کا ذکر تو ہر انگریز نے ایسے انداز میں کیا گویا اس سے زیادہ دردناک واقعہ ہوا ہی نہیں، لیکن اجنالہ کے کنوئیں پر کتنے انگریزوں نے آنسو بہائے ہیں؟ کتنے انگریزوں نے اس کا ماتم کیا ہے؟

[illegible] ص ۱۶۲-۱۶۳ [illegible] ص ۱۶۲ [illegible] ص ۱۶۷-۱۶۸ [illegible] ص ۱۶۷

ایک اور کال کوٹھڑی

اب ہم اس داستان کو طول دینا نہیں چاہتے۔ صرف تین واقعات بیان کر کے اسے ختم کر دیں گے۔

ایک فوجی افسر ولبر فورس[1] نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام تھا "غدرِ ہند کا ایک غیر مکتوب باب[2]" وہ بتاتا ہے کہ میری رجمنٹ کو متحرک کالم میں شامل ہونے کا حکم ملا تھا۔ وزیر آباد میں کالم سے ہم جا ملے۔ وہاں ہمیں بتایا گیا کہ ایک رجمنٹ کو غیر مسلح کر دیا گیا تھا، بعد ازاں وہ بھاگ گئی۔ ایک افسر پچاس سکھوں کو لے کر تعاقب میں نکلا اور ایک سو پچیس میل کے فاصلے پر اس نے مفرور رجمنٹ کو جا لیا۔ سکھوں نے کہا کہ اب ہمارے پاس آتشبازی کا سامان کم ہے۔ لہٰذا ان لوگوں پر گولیاں نہ چلائی جائیں۔ افسر تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ مفرورین کو زندہ چھوڑ دے۔ مجبوراً انھیں ایک عمارت میں بند کر دیا گیا۔ رات ہوئی تو دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان بند کر دیے گئے۔ صبح دروازے کھولے تو سب قیدی اندر مرے پڑے تھے۔

کلکتہ کی کال کوٹھڑی کا واقعہ پنجاب میں دہرایا گیا[3]۔

افسوس کہ ولبر فورس نے رجمنٹ اور مقام کا نام نہیں لکھا۔

انگریزوں کی روش

نکلسن نے متحرک کالم میں حکم دے دیا تھا کہ کوئی دیسی سوار پاس سے گزرے تو اسے سواری سے اتر کر انگریز کو سلام کرنا چاہیے۔

ولبر فورس کو ایک روز راستے میں ایک ہاتھی جس پر کچھ آدمی سوار تھے ملا۔ اس نے حکماً ہاتھی کو ٹھہرایا اور پکار کر کہا:۔

او کالو! نیچے اترو اور سلام کرو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔

---

[1] WILBERFORCE
[2] AN UNRECORDED CHAPTER OF THE MUTINY
[3] ولبر فورس کی کتاب ص ۱۹-۲۰

سواروں نے ہاتھی کو بٹھایا۔ وہ خود نیچے اترے، سلام کیا، پھر روانگی کی اجازت
ملی۔ دوسرے روز دلبر فورس کو معلوم ہوا کہ ہاتھی پر امیر دوست محمد خاں کا سفیر سوار تھا۔[1]

نکلسن

آپ نے فریڈرک کوپر کو دیکھا، اب نکلسن کے متعلق سنیے۔ وہ جہاں سے
گزرتا تھا لوگوں کو اندھا دھند موت کی سزائیں دیتا تھا۔ دلبر فورس کہتا
ہے کہ ۲۸۔ جولائی کو ہم جالندھر پہنچے تو ایک گورہ سپاہی آیا اور بولا! "جنرل صاحب یہاں
موجود ہیں"۔ میں نے پوچھا "تمھیں کیونکر معلوم ہوا؟" اس نے درختوں سے لٹکی ہوئی چھ لاشوں
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا! "وہ دیکھو جنرل صاحب کا نشان"۔

> چھ لاشیں لٹکی ہوئی تھیں اور پاس کئی چھکڑے کھڑے تھے جن میں
> قیدی بھرے ہوتے تھے۔[2]

ذرا غور کیجیے، جس شخص کی نقل و حرکت کا سب سے بڑا اور مسلم نشان یہ تھا کہ
لاشیں درختوں سے لٹکی ہوئی ہوں، اس کے ظلم و جور کا صحیح پیمانہ کون پیش کر سکتا ہے۔ یہ
انگریز تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں یہاں کے باشندوں کو اس طرح مارا کہ عام لوگ شاید
جانوروں اور پرندوں کو بھی اس طرح مارنے کے لیے تیار نہ ہوں! انھیں کو انگریزوں نے ہیرو
بنایا اور ہندوستان کے خزانے سے ان کے لیے یا ان کے خاندانوں کے لیے پنشنیں مقرر ہوئیں۔

۱؎ دلبر فورس کی کتاب ص ۲۳ ۲؎ ایضاً ص ۳۰-۲۹

حرفِ آخر

باب ۱

"تصویر کا دُوسرا رُخ"

تمہید انگریزوں کی خوفناک بربریت کے متعلق جو اقتباسات اب تک پیش کیے جا چکے ہیں، وہ انھیں کتابوں سے ماخوذ تھے، جو انگریزی حکومت کے دَور عروج میں لکھی گئیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ انگریزوں کو خود اپنے خلاف ایسا زہرہ شگاف اور دل گداز ذخیرہ فراہم کرنا کس وجہ سے گوارا ہُوا۔ یقیناً یہ واقعہ حیرت انگیز ہے۔ آپ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں بعض حق شناس ہستیاں پیدا ہوئیں، جنھیں مورخوں کی حیثیت میں کسی پہلو پر پردہ ڈالنا مناسب معلوم نہ ہُوا۔ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ انگریزوں کو دَورِ عروج میں خیال ہی نہ ہو سکتا تھا کہ ان کے فراہم کردہ ذخیرے کے لیے کبھی حق و انصاف کی میزان بھی قائم ہو گی۔ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ تحریک آزادی کو دبا دینے کے بعد وہ بربریت کے مختلف واقعات وانشگاف طریقے پر بیان کر دیا اس لیے ضروری تصوّر کرتے تھے کہ ملک کی آئندہ نسلیں انھیں پڑھیں تو دہشت زدہ رہ جائیں اور ان کے قلوب کی گہرائیوں میں جذبہ آزادی کی تربیت کے لیے فضا سازگار نہ ہو سکے۔

ٹامپسن کی کتاب ۱۹۲۵ء میں ایک انگریز مصنف ایڈورڈ ٹامپسن نے "تصویر کا دوسرا رُخ" کے نام سے ایک مختصر سی کتاب لکھی تھی، جس میں انگریزی بربریت کی پردہ کشائی بڑے اچھے انداز میں کی تھی۔ مَیں نے اس میں سے کوئی اقتباس اب تک نہ دیا۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سے بھی چند ضروری عبارتیں یہاں نقل کر دی جائیں، اس لیے کہ میری کتاب جن مبانی پر مرتب ہوئی ہے، ان کی پختگی اور

تحکیمیت ہیں حقیقت سے شک کا بھی شائبہ باقی نہ رہے۔ ان اقتباسات کے لیے
حوالے ٹامپسن ہی کی کتاب سے دوں گا، اگرچہ اصل کتابیں بھی میرے پیش نظر ہیں۔

قومی اور عوامی حیثیت

میں نے ۱۸۵۷ء کو آزادی کی جنگ قرار دیا اور کہا یہ
ایک قومی اور عوامی تحریک تھی، آپ اس کے لیے
"آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا" کا بیان ملاحظہ فرمائیں۔

> یہ سرکشی اگرچہ اصلاً فوج بنگال کی عسکری بغاوت تھی اور اس
> کے اشتعال کا فوری سبب چربی والے کارتوس تھے، مگر یہ فوجوں تک
> محدود نہ رہی۔ غیر مصافی آبادی میں بھی بے اطمینانی اور بے چینی وسیع
> پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی اور متعدد مقامات پر عوام اپنے ہاں کے
> فوجیوں کی سرکشی سے پہلے اٹھ کھڑے ہوئے[1]

رومیش چندر دت نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ وہ رقمطراز ہے،

> اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ سیاسی وجوہ سپاہیوں
> کی بغاوت کو شمالی اور وسطی ہند کے عوام کے وسیع طبقوں میں
> پھیلانے کا موجب بنے اور اسے ایک سیاسی سرکشی کی شکل دے
> دی۔ لارڈ ڈلہوزی کے وسیع اور تیز الحاقات نے یہ اثر پیدا کر دیا
> تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی چپے چپے کو مسخر کر لینا چاہتی ہے۔ وہ اپنے
> مقصد کی خاطر ملک کے قانون اور معاہدوں کو بھی پس پشت ڈال
> چکی ہے۔ لوگوں کے قلوب میں بے چینی تھی اور سرکشی کے لیڈروں
> نے ایسے اعلانات شائع کیے، جن میں اجنبی حاکموں کی بد عہدی

---

[1] ٹامپسن صفحہ ۳۱۔

اور جوع ارض پر زور دیا گیا تھا[1]

توپ سے اڑانے کی سزا ۱۸۵۷ء میں جن انگریز افسروں نے جگہ جگہ کام کیا، ان میں ایک لفٹنٹ رابرٹس تھا جو بعد میں فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس بنا۔ ۲۱۔ جون ۱۸۵۷ء کو اس نے جہلم سے اپنی والدہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

> سزائے موت کی سب سے زیادہ موثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اڑایا جائے۔ یہ بڑا ہی خوف ناک نظارہ ہوتا ہے لیکن موجودہ وقت میں ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہو سکتے۔ ہمارا مقصد ان بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے[2]

مسز کوپ لینڈ ایک پادری کی بیوہ تھی، وہ لکھتی ہے:

> چار "باغیوں" پر مقدمہ چلا اور انھیں توپ سے اڑانے کی سزا سنائی گئی، چنانچہ ایک روز ایک توپ کی نہایت خوفناک دبی ہوئی سی آواز ہمارے کانوں میں پہنچی، جو بیان میں نہیں آسکتی... ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ بڑا ہی دل آزار نظارہ تھا... ایک توپ میں بارود زیادہ بھری ہوئی تھی، لہٰذا بدبخت مجرم کے واقعی پرزے اڑ گئے۔ تماشائیوں پر خون اور گوشت کے ٹکڑے گرے۔ ایک پر سر آکر گرا اور اس کے چوٹ لگی[3]

---

[1] ٹامپسن صفحہ ۳۱ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۴۰ ۔ [3] ایضاً صفحہ ۴۶ ۔

کھال کھنچوانا اور جلانا آپ نے نکلسن کا نام اس کتاب میں بار ہا پڑھا ہو گا۔ انگریزوں کے نزدیک وہ بہادری و جوانمردی کا پیکر تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے اُس نے اپنے دوست ہربرٹ ایڈورڈس کو کیا لکھا تھا؟ یہ کہ :

> جن لوگوں نے دہلی میں عورتوں اور بچوں کو قتل کیا، ہمیں چاہیے کہ ان کے لیے کھال کھنچوانے یا میخیں ٹھونک کر ہلاک کرنے یا آگ میں جلانے کا ایک قانون منظور کرائیں۔ جب ایسے ظلموں کے مرتکبوں کو محض پھانسی دے دینے کا خیال آتا ہے تو دماغ کھولنے لگتا ہے میری آرزو ہے میں ایسی جگہ ہوتا کہ ضرورت پڑتی تو قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا[1]

پھر لکھتا ہے :

> اگر وہ لوگ میرے قابو میں ہوتے اور مجھے یقین ہوتا کہ کل مر جاؤں گا تو میرے دماغ میں اذیت رساں تعذیبات کے جو جو نقشے آتے، وہ سب ان پر صرف کرتا اور میرا ضمیر بالکل مطمئن ہوتا[2]

گویا انسان اس دنیا میں صرف انگریز تھے اور اس وسیع سرزمین کے کروڑوں باشندوں کے متعلق انسانیت کا تصور بھی نکلسن کے لیے ناقابل برداشت تھا، حالانکہ انھیں باشندوں کی سرزمین اسے روزی دینے کی ذمہ دار تھی اور اسی سرزمین کی دولت سے اس کا خاندان اس وقت تک پرورش پاتا رہا، جب تک انگریز ہندوستان میں موجود رہے۔

---

[1] ٹامپسن صفحہ ۴۴ ۔ [2] ٹامپسن صفحہ ۴۴

ایمرسن نے بالکل صحیح لکھا کہ انگلستان کا مذہب "عہد نامہ قدیم" کی تعلیم ہے۔ "عہد نامہ جدید" کا پہلا صفحہ بھی اُس نے کھول کر نہیں دیکھا۔ بہ الفاظ دیگر انتقام کے سوا اس کے پیش نظر کچھ نہیں اور عفو و درگزر کا معاملہ قطعاً خارج از بحث ہے:

ایک دِل سوز نظارہ

موبرے ٹامسن ان چند آدمیوں میں سے تھا جو کان پور سے بچ کر نکلے۔ اُس نے ایک مرتبہ کچھ قیدی پکڑے تھے۔ ان کے متعلق ہنری کاٹن کو جو کچھ سنایا، وہ اسی کی زبان سے سُنیے:

> اندھیرا ہو چکا تھا۔ ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کرنے کے بعد بولا: جناب ہم نے قیدیوں سے جو سلوک کیا ہے، میں سمجھتا ہوں، آپ اسے دیکھنا پسند کریں گے۔ مجھے گڑبڑ کا شبہ ا فوراً اٹھا اور حوالات میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بدبخت مسلمان آخری دموں پر ہیں۔ ان کی شکلیں کسی ہوئی ہیں۔ کپڑے اُترے ہوئے ہیں اور تانبے کے پیسے گرم کر کر کے ان کے جسموں کو سر سے پاؤں تک داغا جا چکا ہے۔ میں نے خود انھیں گولیوں سے ہلاک کر دیا تاکہ ان کی اذیتیں ختم ہوں۔[۱]

ہنری کاٹن نے یہ سُن کر کہا: اللہ اللہ، پھر کیا ہُوا؟ ٹامسن نے جواب دیا کچھ نہیں۔

نکلسن کی مُراد

نکلسن نے زیادہ سے زیادہ اذیتیں دے کر مارنے کی تجویز پیش کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس بارے میں قانون منظور ہو جائے۔ یہ تو نہ ہُوا تاہم اس کی مراد خدا جانے کہاں کہاں پوری کی گئی۔ ایک عینی شاہد بتاتا ہے کہ فرنگیوں اور سکھوں نے مل کر ایک زخمی قیدی کے چہرے پر سنگینوں سے مزید زخم لگائے، پھر اسے دھیمی آگ میں جلنے کے

---

[۱] ٹامپسن صفحہ ۴۸ ء

ا دیا:

شعلوں میں اس کا گوشت تڑخ تڑخ کر سیاہ ہو رہا تھا اور
اس سے نہایت مکروہ بُو نکل کر فضا کو مسموم کر رہی تھی ——— آہ
انیسویں صدی کی جس تہذیب و انسانیت پر فخر کیا جاتا ہے، اس میں
ہمارے سامنے یہ نظارہ بھی پیش ہوتا تھا کہ ایک انسان کو آگ پر
بھون کر مارا جاتا ہے۔ انگریز اور سکھ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ارد گرد
کھڑے اطمینان سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں[1]

ڈن ٹائمز کے نامہ نگار رسل نے بھی یہ واقعہ بیان کیا ہے بلکہ اس نے اس سیاہ
ہندی کی جلی ہوئی ہڈیاں بھی میدان میں پڑی دیکھیں۔

ا صاف گوئی | ٹامسن لکھتا ہے کہ ارادی بے رحمی کے واقعات سے میری قوم کا
نامہ اعمال دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے۔
م یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ کبھی کبھی بے رحم بھی بن گئے تاہم ظلم و ستم کے شیطان
بنے۔

یں نہیں کہہ سکتا کہ اس بیان کی حقیقت کیا ہے۔ تاہم ۱۸۵۷ء کے تعلق میں تو
ش نظر لایا ہی نہیں جا سکتا۔ آپ دیکھیں رسل نے کن کن اسرار کی پردہ کشائی کی ہے۔
ا ہے:

ہندوستانیوں کے لیے تعذیبات یا مسلمانوں کو پھانسی
دینے سے پہلے سؤروں کے چمڑوں میں سینا یا ان کے جسموں پر سؤر
کی چربی ملنا اور ان کے جسموں کو جلانا یا ہندوؤں کو بھرشٹ ہونے پر

---

[1] پسن صفحہ ۲۰۷

مجبور کرنا، یہ تمام حرکات سراسر منتقمانہ اور غیر مسیحی ہیں اور ہمارے
لیے باعث بے عزتی ہیں۔ انجام کار یہ ہم پر مصیبت بن کر گریں گی۔ ان
روحانی اور ذہنی تعذیبات کا ہمیں کوئی حق نہیں اور ہم ایسی تعذیبات کے
بعد یورپ والوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ سکتے[1]

لاجواب منطق

رسل نے ایک اور موقع پر حقیقی پوزیشن کس خوبی سے واضح کی، وہ کہتا ہے:

صورتیں دو ہیں: یا تو یہ بغاوت صرف فوج تک محدود تھی یا
سمجھنا چاہیے کہ فوجیوں کی سرکشی کے بعد عوام بھی کم وبیش ان کے
حامی بن گئے۔ اگر یہ خالصتہً فوجی بغاوت تھی تو دیہاتوں اور شہروں
کو جرمانے اور پھانسی کی سزائیں دینا قطعاً خلاف انصاف ہے،
جنھیں اس معاملے سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا اور انھیں اس
وجہ سے بھی ہدفِ تعذیب بنانا خلاف مصلحت ہے کہ نہتے ہونے کے باوجود
وہ کیوں مسلح آدمیوں کے مقابلے پر نہ آئے، جنھیں ہم نے قواعد کرائی۔ ہم نے
منظم کیا اور وہ اس وقت سارے ملک کے مالک بن گئے تھے۔ ہم بزدلی
کے لیے لوگوں کو سزائیں نہیں دے سکتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے خلاف
عناد کا جذبہ تیز ہو جائے گا اور لوگوں کے دل میں گہری قومی نفرت جڑ پکڑے گی۔
ہمیں چاہیے کہ سپاہیوں کو میدانِ مقابلہ میں قتل کریں۔ اپنے دشمنوں کو
جنگ میں تباہی کے گھاٹ اتاریں۔ ہمیں انھیں قاتل غداروں کی جانیں لینی
چاہئیں، جنھوں نے بے رحمی سے اپنے افسروں کو مارا، عورتوں اور بچوں کو

---

[1] ٹامپسن صفحہ ۴۸۔

بے دردی سے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ لیکن اضلاع کو اس کے لیے سزائیں دینا
خلاف انصاف بھی ہے اور خلاف دانش بھی اور وہ بھی اس لیے کہ ان
میں قتل کے واقعات پیش آئے یا دشمن کے لشکروں نے وہاں
کیمپ لگا لیے تھے یا وہ وہاں رہتے تھے۔

تھیوفلس مٹکاف

دہلی میں بہت سے بے گناہوں کو پھانسی دلوانے کا ذمہ دار تھیوفلس مٹکاف تھا جو ۱۸۵۷ء میں دہلی کا مجسٹریٹ تھا۔ اس نے ایک عالی شان بنگلہ دہلی میں بنا لیا تھا اور اپنا کتب خانہ بھی وہیں منتقل کر لیا تھا۔ یہ مٹکاف ہاؤس کے نام سے شہرت پذیر تھا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ بنگلہ تباہ ہو گیا، جس طرح سیکڑوں دوسری عمارتیں تباہ ہوئیں مٹکاف کو اس پر اتنا غصہ تھا کہ وہ چاہتا تھا ساری دنیا کو اس تباہ شدہ مکان کے شہتیروں اور کڑیوں میں پھانسی دے دے۔ منٹگمری مارٹن نے اس کے متعلق لکھا:

> مٹکاف سے گواہی کے لیے تو رجوع کرنا ٹھیک ہے، لیکن اسے جج بنانا
> ٹھیک نہیں۔ انگریزی نظریہ انصاف ہرگز اس امر کا روادار نہیں کہ ایک
> شخص کو سزا و تعزیر کے متعلق اپنے تصوّرات کے مطابق کام کرنے کا موقع
> دے دیا جائے۔ اور وہ چاہے تو اپنے تباہ شدہ مکان کے شہتیروں
> اور کڑیوں میں زیادہ سے زیادہ مظلوموں کو پھانسیاں دے دے[1]

کامیابی اور ناکامی

بے شک انگریز ۱۸۵۷ء میں کامیاب ہوئے، لیکن کاش انھیں احساس ہوتا کہ یہ کامیابی ان کے لیے کتنی بڑی ناکامی اور کتنی خوفناک نامرادی تھی۔ نفرت کا جو بیج ۱۸۵۷ء میں بویا گیا تھا وہ بڑھ کر تناور درخت بنا اور آخر انگریزی اقتدار کا حصار اس طرح پاش پاش ہوا کہ آج اس کا سُراغ لگانا بھی آسان نہیں۔

اب سوچیے کہ جس دل میں ۱۸۵۷ء کے واقعات محزنہ کی یاد تازہ ہو گی، کیا اس میں انگریزوں

---

[1] ٹامپسن صفحہ ۱۴۱ تا

کے لیے کسی بھی خوشگوار خیال کی گنجائش باقی رہے گی؟ شعلوں کو کون پھول سمجھتا ہے اور خارزار کو کون حریر و پرنیاں کا فرش قرار دیتا ہے۔ تاریخ قوموں کے اعمال کا مرقع ہے۔ انگریز جب اس میں اپنا نامۂ اعمال دیکھیں گے اور اس کے اوراق پر ۱۸۵۷ء کے خونِ ناحق کا دھارا متلاطم رہے گا تو ان کی حالت کیا ہوگی؟ وہ نیل، نکلسن، ہڈسن یا ان جیسے دوسرے لوگوں کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ اس دنیا کا ہر ذرّہ پکار پکار کر کہے گا کہ انگریزوں نے وہ حرکتیں کیں، جو انسانیت ہی نہیں بلکہ جنگلی درندوں کے لیے بھی باعثِ ننگ بنیں۔

حرفِ آخر بایں ہمہ انسانیت کی تربیت نفرت پر نہیں، صرف عفو و محبت پر ہونی چاہیے۔ ہم نے یہ داستان اس لیے نہیں لکھی کہ نفرت کے جذبات برانگیختہ کریں یا انتقام کی آگ کو ہوا دیں۔ حاشا و کلا۔ مقصد یہ ہے کہ انسانیت کے بعض نہایت مکروہ اور شرمناک عملی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر عبرت حاصل کی جائے۔ یقیناً عالمِ انسانیت کی خدمت یا بنی نوع کے امن و سکون کی تقویت کا طریقہ وہ نہیں جو ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اختیار کیا اور جس کی مثالیں بعض دوسری قوموں کے احوال و وقائع میں بھی موجبِ جراحتِ قلب و نظر بنتی ہیں۔ صحیح خدمت کا تقاضا یہ ہے کہ امن و محبت کا پیغام لے کر اٹھیں۔ جن مجاہدوں نے نیک مقاصد کے لیے جانیں دیں، ان کی مثالوں کو مشعلِ راہ بنائیں، حق و انصاف کی پامالی کے لیے ہم جنسوں کا خون بہانے کے جتنے واقعات سامنے آئیں، انھیں انسانی شرف کے دامن پہ بدنما داغ قرار دیں۔ اپنے لیے بارگاہِ الٰہی میں دعا کریں کہ وہ قادر و توانا، وہ ہادیٔ مطلق اپنی رحمت سے ہمیں راہِ راست پر چلائے، صراطِ رضا پر قائم رکھے، نازیبا باتوں سے ہمارا دامن بچائے اور ہمیں ان افعال و اعمال کا سرچشمہ بنائے، جو انسانیت کے لیے باعثِ راحت اور خود ہمارے لیے وسیلۂ شرف و عزت ہوں۔

باب ۲

انجام

جدوجہد اور نتائج

کتاب کے اختتام تک بھی یہ خیال نہ تھا کہ انجام کے بارے میں الگ کچھ لکھنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ جو باتیں ضروری تھیں، وہ جابجا عرض کی جا چکی ہیں۔ بالکل آخری وقت میں احساس ہُوا کہ چند امور کی طرف اشارے کر دینا مناسب ہوگا، تاکہ تحریک کے کسی پہلو کے متعلق غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔ میں ایک سے زیادہ مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ ہر عمل کی برتری اور اس کی جزا یا اس کا ثواب حسن نیت کے ساتھ عمل پر ہے، نہ کہ اس کے نتائج پر۔ اجنبی حکمرانی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد زندگی کی زینت اور غیرت کا عزیز ترین عملی سرمایہ ہے۔ جو فرد بھی اس میدان میں بقدر استطاعت جہاد کرے، وہ یقیناً جزاء و ثواب کا مستحق ہے۔ کامیابی یا ناکامی سے قطعاً بحث نہیں۔

تاخیر و تعویق

یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بڑے اجتماعی اعمال کے نتائج عموماً دیر سے برآمد ہُوا کرتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص اصلاح کی دعوت لے کر اٹھتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ اس کی دعوت فوراً ہر جگہ پھیل جائے۔ وہ یقین و وثوق سے سلسلہ جاری رکھے گا تو پہلے ہم نواؤں کی ایک جماعت پیدا کرے گا۔ پھر اس جماعت کے افراد جگہ جگہ پھیل جائیں گے۔ اور خاصی مدت کے بعد ایک حلقے میں اصلاح کے نتائج سامنے آئیں گے۔ بعدازاں خدا جانے دعوت کی عام اشاعت میں کتنا وقت لگے گا۔

یہ آپ کے سامنے روس کی مثال موجود ہے، جہاں اجنبی حکومت سے نہیں بلکہ ظالم و جابر ملکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مجاہدات کا سلسلہ ۱۸۲۵ء میں شروع ہوا تھا اور

ہزاروں لاکھوں قربانیوں کے بعد ۱۹۴۷ء میں تحریک منزل مقصود پر پہنچی۔

ضروری نکتہ یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ اجنبی حکومت کیوں بُری سمجھی جاتی ہے اس لیے کہ اس میں محکوموں کے ساتھ وہ ہمدردی، وہ خلوص اور وہ خیر خواہی قطعاً پیدا نہیں ہو سکتی جو حکمرانی کی روح اور جان ہے۔ انسانیت ابھی ترقی و برتری کی اس منزل پر نہیں پہنچی۔ جس میں ایک قوم دوسری قوم یا اقوام کے ساتھ وہی سلوک روا رکھنے کے لیے تیار ہو جو اپنے ہم قوموں کے ساتھ اس کا شیوہ ہے۔ وہ صرف اس لیے دوسرے ملکوں پر قابض ہوتی ہے کہ اسے کم یا زیادہ مادی فائدے نظر آتے ہیں اور جو حکومت ذاتی اغراض کی پیش بُرد پر مبنی ہو تو ناممکن ہے کہ وہ اہل ملک کے مفاد کو ہر مصلحت پر مقدم رکھ سکے۔

بالکل اسی نقطۂ نگاہ سے ان حکومتوں کو دیکھنا چاہیے جو اگرچہ صورتاً ملکی ہی ہوں مگر سیرۃً اغیار و اجانب کے مسلک پر چلیں۔ جن کے افراد اپنی اغراض، اپنی راحت و آسائش، اپنی حرص زراندوزی کو عوام کی فلاح و بہبود پر ترجیح دیں، ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہونا چاہیے جو اجنبیوں کے ساتھ لازم ہے۔ ایسے گروہ اور ایسے جتھے انسانیت کے لیے باعث ننگ ملک و قوم کے لیے موجب عار اور حکمرانی کے لیے مستوجب تذلیل ہوتے ہیں اور انھیں توڑ دینے ہی پر انسانوں کی بہتری اور مقاصد عالیہ، انسانیت کی تکمیل موقوف ہے۔

۱۸۵۷ء ۱۸۵۷ء کے جہاد میں جن مجاہدوں نے کام کیا، وہ بڑے تھے یا چھوٹے، نامور تھے یا گمنام، سالار تھے یا معمولی سپاہی، اعلیٰ درجے کے کارکن تھے یا معمولی لوگ، وہ سب دلی احترام و ستائش کے مستحق ہیں، خواہ وہ میدانِ جنگ میں مارے گئے یا پھانسیاں پا گئے یا انڈیمان وغیرہ کی اسیری میں جاں بحق ہوئے یا جلا وطنی کی حالت میں مرے۔ ان کی عظمت و برتری بہر حال مسلّم ہے۔ انھوں نے اپنا فرض پہچانا اور اسے بجا لانے کی پوری کوشش کی۔ بس اسی عزم اور اسی ارادے نے انھیں اعزاز و اکرام کی انتہائی بلندی پر پہنچا دیا۔ اگر نتیجہ ان کی زندگی میں حسب مراد نہ نکلا تو اس سے ان کے کام کی بڑائی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ یہ

ہر حال وہ اپنے پیچھے حسنِ عمل کی ایسی مشعلیں چھوڑ گئے جو بعد کی نسلوں کو صحیح راہِ عمل دکھا سکتی تھیں جسے پورا نہ کیا جائے تو انسانیت کی پیشانی داغدار ہو جاتی ہے اور اس کی عزت و مکرمت قائم نہیں رہتی۔ ان مجاہدوں کا عمل خیرِ جاریہ کی حیثیت رکھتا تھا اور بعد میں کامگاری کی۔ جس بہار نے ہمارے دامن رنگا رنگ پھولوں سے بھرے، غور سے دیکھا جائے تو وہ ان مجاہدوں نیز ان کے پیروں کے ایک مسلسل عمل، متصل جد و جہد اور لگاتار سعی و کوشش کا نتیجہ تھی۔ یہ نہ تھا کہ کوئی شخص ایک خاص وقت میں اُٹھا اور ایک ہی قدم میں کامیابی و کار برآری کی منزل پر پہنچ گیا۔

ناکامی کے اسباب

ایک امر غالباً موجبِ تشویش ہو اور وہ یہ کہ جب یہ تحریک ہمہ گیر تھی، انگریزوں کے مقابلے میں جنگی قوت زیادہ تھی اور ساز و سامان بھی کم نہ تھا تو ناکامی کیوں ہوئی؟ اس کے اسباب کی طرف بھی جا بجا اشارے کیے جا چکے ہیں یہاں ہم ان اشاروں کو یکجا کر دیتے ہیں:

۱۔ بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تحریک پوری تیاری اور تنظیم کے بغیر اچانک اور ناگہاں شروع ہو گئی اور منظم تحریکوں میں جو نظم و جمعیت ہوتی ہے وہ اس میں پیدا نہ ہو سکی۔

۲۔ اس تحریک کے کارکنوں میں مہارتِ فنونِ جنگ کا برابر قحط رہا۔ مولانا احمد اللہ شاہ دلاورِ جنگ، رانی جھانسی اور کنور سنگھ خاصی جنگی صلاحیت کے مالک تھے، انھیں پیشِ نظر مقاصد کے مطابق تنظیم قوی کا موقع نہ مل سکا، نیز گرد و پیش کی رقابتیں برابر ان کے مجاہدات میں خارج ہوتی رہیں۔ اگر یہ کارکن مل کر اور متحد ہو کر کوئی ایک محاذ سنبھال لیتے تو یقین ہے کہ بہت اچھے نتائج پیدا کرتے۔

۳۔ سب سے بڑھ کر رنج افزا حالت دہلی اور لکھنؤ میں رہی۔ دہلی میں ساز و سامان کی کمی نہ تھی اور فوج بھی خاصی بڑی فراہم ہو گئی تھی۔ پھر جنرل بخت خاں

وہاں موجود تھا جو اوّل درجے کا نہیں تو دوسرے درجے کا جرنیل ضرور تھا۔ وہاں شہزادوں اور مغلیہ خاندان کے بعض دوسرے افراد یا درباریوں کی غلط روش نے معاملات درست نہ ہونے دیے۔

۴۔ لکھنؤ کو تنظیم کے بہترین لمحات فرصت مل گئے اور فوج کی بھی ہرگز کمی نہ تھی۔ آخری وقت تک حضرت محل کے پاس ہزاروں جنگجو موجود تھے وہاں بھی افراد کی رقابتوں کے باعث کچھ نہ ہو سکا۔

۵۔ بعض ملکی عناصر نے بھی موقع پر ساتھ نہ دیا، بلکہ وہ قومی تحریک کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت کے لیے سرگرم کار ہو گئے۔ مثلاً پنجاب و سرحد کے باشندوں کی بڑی جماعتیں ستلج اور جمنا کی درمیانی سکھ ریاستیں، دولت آصفیہ یا بعض دوسرے خطّے، ریاستیں اور آبادیاں۔ ان کی وجہ سے بھی انگریزوں کو خاصی تقویت حاصل ہوئی اور تحریک کو نقصان پہنچا۔

علماء کا موقف

میری معلومات کے مطابق اس وسیع ملک کی آزادی کے لیے یہ دوسری عوامی تحریک تھی، جو بہترین امیدوں اور آرزؤں کے باوجود کامیاب نہ ہو سکی۔ پہلی تحریک سیّد احمد شہید کی تھی۔ سیّد صاحب نے ۱۸۲۶ء میں جہاد شروع کیا تھا اور وہ ۱۸۳۱ء میں شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت سے پچیس چھبیس سال بعد یہ تحریک جاری ہوئی۔ سیّد صاحب نے ایک مناسب مقام پر مرکز جہاد بنا کر کام شروع کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ملک کے اندر جگہ جگہ آزادی کی جدوجہد کی گئی۔ اگرچہ دہلی یا دوسرے مقامات کے بعض بزرگوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک کو درست ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم ان میں سے بعض نہایت بلند پایہ افراد اس میں شریک رہے۔ مثلاً بزرگان دیوبند، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا سرفراز علی جون پوری، مولانا رحمت اللہ کیرانوی۔ سیّد صاحب کے خلیفہ اور ان کی جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عنایت علی صادق پوری بھی اس تحریک کے ساتھ تھے بلکہ انگریزوں کا خیال ہے

کو مردان میں رجمنٹ ۵۵ کی بغاوت مولانا عنایت علی ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اور خود انھوں نے تاریخی رعلاقہ سرحد ا میں محاذ قائم کر کے جنگ شروع کر دی تھی۔

بہ ہر حال یہ اجتہادی مسئلہ تھا۔ ایک گروہ نے اس پر ایک نقطۂ نگاہ سے غور کیا، دوسرے نے دوسرا نقطۂ نگاہ پیش نظر رکھا۔ ایک کی رائے یہ تھی کہ آزادی حاصل کرنے کے جو ممکنات پیدا ہو گئے ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور جس حد تک ملکی قوتوں کو منظم کیا جا سکتا ہے، کر دینا چاہیے۔ دوسرے گروہ کی نظر اس پہلو پر گئی کہ ملکی قوتوں میں تنظیم نہیں اور تحریک نے فی الجملہ ہنگامۂ عام کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جسے عرفاً بلوا کہتے ہیں اور شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں پہلے گروہ کی رائے صائب تھی اور دوسرے کو اگرچہ ملزم نہیں گردانا جا سکتا، تاہم اس کی رائے صائب نہ تھی۔ اس نے ذرائع کے باب میں حد درجہ مبالغہ آمیز تصور مناسب سمجھا۔ جس میں مقصد نظر سے اوجھل ہو گیا۔

بے تنظیمی

بلا شبہ تحریک کی بے تنظیمی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، یہاں تک کہ اگر کہا جائے ناکامی کا سب سے بڑا سبب بے تنظیمی ہی تھی تو یہ غلط نہ ہوگا۔ بے تنظیمی ہی کے باعث بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن کے لیے اخلاقاً یا قانوناً یا شرعاً کوئی وجہ جواز پیش نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً دہلی یا جھانسی یا کانپور یا بعض ایسے ہی دوسرے مقامات پر انگریزوں کا قتل یا بعد حوالگی و متارکہ ان پر قاتلانہ حملے۔ ذمہ دار آدمی نہ خود ایسے افعال کے مرتکب ہو سکتے تھے اور نہ کسی دوسرے کو ارتکاب کا موقع دینے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔

بے تنظیمی ہی کے باعث رجمنٹ ۵۵ اور رجمنٹ ۵۱ بے سود ضائع ہوئیں۔ اسی طرح بعض اور جنگی جمعیتوں کو بھی نقصان پہنچا اور وہ کوئی کام انجام نہ دے سکیں، حالانکہ ان کے ساتھ بڑی توقعات وابستہ تھیں اور وہ بے جا نہ تھیں۔ بعض مقامات پر جمعیتوں کو اہل و اصلح سالار میسر نہ آ سکے، جو ان سے مقاصد کے لیے ٹھیک ٹھیک کام لے سکتے۔

بعض حالتوں میں سالار موجود تھے اور ابھی ضرورت کے مطابق جمعیتیں نہ مل سکیں ۱۸۵۷ء کا یہ پہلو یقیناً بڑا ہی رنجدہ اور قلق افزا ہے، لیکن اُسے کوئی غیر معمولی حالت نہ سمجھنا چاہیے۔ جب قومی اور ملکی قوتوں کی عنانِ تنظیم اپنے ہاتھ سے نکل کر غیروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے تو قومی مجاہدات کے لیے ترتیبات کے ابتدائی دور میں عموماً اس قسم کی صورتیں پیش آتی رہی ہیں۔ دنیا بھر کی قومی تحریکات میں ایسے واقعات کم وبیش مل جائیں گے۔ یہ ہمارے سامنے ہنگری کا حادثۂ الیمہ ہے جس پر صرف چند مہینے گزرے ہیں۔ قربانیوں کی بے بہائی پر غور فرمائیے، پھر یہ دیکھیے کہ مراد مندی کی شادمانی نصیب نہ ہوئی۔

حدیث آرزو

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ اس خامہ فرسائی اور قلمرانی سے محض داستاں سرائی مقصود نہ تھی۔ جس دور میں قومی زندگی کے بیسیوں پہلو ہر مدعی خدمت کی خاص توجہ اور صرف سعی وجہد کے متقاضی ہیں، اس میں خالی کہانیاں سنانے کے لیے اوقات فرصت وقف کردینا یقیناً فرض شناسی کی نہایت الم انگیز مثال ہوگی۔

مقصود یہ ہے کہ قلب وروح میں وہ حرارت ملتہب رہے، جسے جذبہ آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آزادی کے تقاضے بہت وسیع اور اس کے مقاصد بہت جلیل القدر ہیں۔ اس کا مطلب محض یہ نہیں کہ اختیار واقتدار کے مناصب غیروں سے چھین کر اپنوں کے حوالے کردیے جائیں اور حکومت کے بت کدے میں اجنبی مورتیوں کی جگہ دیسی مورتیوں کی پوجا کا بندوبست کرلیا جائے۔ حاشا وکلا۔ آزادی نظام حکومت میں ایک ایسا انقلاب چاہتی ہے، جو عوام کی حقیقی عملی ہمدردی اور بے غرضانہ بہی خواہی پر مبنی ہو۔ جس میں حکومت کا ہر فرد اس لیے جیسے کہ دوسروں کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکے اور فائدہ عام ہو، نسل، خاندان، خون یا عقیدے وغیرہ کی زنجیروں سے مقید نہ ہو۔ اگر یہ نہیں تو جو کچھ بھی ہے وہ آزادی نہیں بلکہ غلامی اور

حکومی ہے، خواہ اس کا درجہ کچھ ہی ہو۔ جو حکومت عوام کی بہبود کو ہر مصلحت پر مقدم نہ رکھے، وہ آزاد قوم کی قومی حکومت نہیں ہو سکتی۔ جو مسافر گھر سے اُٹھ کر راستے میں سو جائے وہ بھی منزلِ مقصود سے اسی طرح محروم رہے گا۔ جس طرح گھر میں سونے والے کے لیے محروم رہنا مقدر ہے۔ ہمیں خوب سوچنا چاہیئے کہ آیا گھر کے بستر سے اُٹھ کر راستے میں تو نہیں جا سوئے۔

جو کہانی اب ختم ہوئی ہے، اس جیسی کہانیاں آزادی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی لگن دلوں میں تازہ رکھتی ہیں۔ لگن تازہ ہو تو اسے زندگی کا وثیقہ اور عروج و برتری کی دستاویز سمجھنا چاہیے:

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

ضمیمہ ۱

کتاب مکمل ہو جانے کے بعد چند نئے مآخذ دستیاب ہوئے، جن کا پہلے علم نہ تھا۔ ان میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر ۱۸۵۷ء کے دو انگریزی اخباروں کے فائل ہیں، جو لاہور سے نکلتے تھے: اوّل "لاہور کرانیکل" (از جولائی تا دسمبر ۱۸۵۷ء) دوم "پنجابی" (از ۲۲۔ فروری تا ۲۵۔ دسمبر ۱۸۵۷ء) ان کے لیے عزیزی عبدالسلام خورشید دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ ان مآخذ سے بیان کردہ امور کی تصدیقِ مزید ہوتی ہے اور بعض امور پر بالکل نئی روشنی پڑتی ہے۔ ان سے بھی چند اقتباسات ملاحظہ فرما لیجیے:

تحریک کی عمومیت

میں نے کتاب میں ایک سے زیادہ مرتبہ عرض کیا کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک عام تھی، ملک کے تمام حصّے اور اس میں بسنے والے تمام طبقے اس سے متاثر ہوئے۔ بعض لوگ وقتی حالات کی سازگاری سے فائدہ اٹھا کر میدانِ عمل میں آ گئے۔ بعض قیادت سے محرومی کے باعث کچھ نہ کر سکے۔ بیشتر انگریزوں کا خیال تھا کہ یہ "اسلامی بغاوت ہے"، اس لیے کہ مسلمان اس تحریک میں بہت پیش پیش تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فرقہ وار تحریک نہ تھی اور اس کی غرض سیاسی آزادی تھی۔ اگرچہ فوج میں اس کا آغاز چربی والے کارتوسوں سے ہُوا۔ ۱۱۔ جولائی ۱۸۵۷ء کے "پنجابی" میں غالباً کسی انگریز نے لکھا تھا:

اس میں شک نہیں کہ موجودہ جنگ مذہبی نہیں جیسا کہ عام طور

پر سمجھا جاتا ہے اور "دین" ، "دین" کے جس نعرے سے ہندوستان
کے طول عرض میں گونج پیدا ہو گئی ہے، اس کی تہ میں تمام باشندگان
ہند کی کوشش یہ ہے کہ اجنبی اور غیر ملکی محکومی سے آزادی حاصل
کریں۔ یہ محکومی زیادہ سے زیادہ تلخ و ناخوش گوار محسوس کی جارہی
ہے، اس لیے کہ یہ اہل ملک کے قدیم مرغوبات و میلانات کی
بے حرمتی پر مبنی ہے اور یہ محکومی ایک ایسی طاقت کی طرف
عائد ہوتی ہے، جسے مفتوحین سے رنگ، عقیدے، زبان
رائے، عادات، خیالات، احساسات یا تصورات انتقادیات
میں کسی بھی نوع کی یکسانی نہیں۔

دیکھیے یہ رائے کتنی واضح، صاف اور روشن ہے۔

"اسلامی بغاوت"

اس زمانے میں "فرینڈ آف انڈیا" (رفیق ہند) کے نام سے ایک اخبار نکلتا تھا، جس کا ایڈیٹر ہنری میڈ[1] تھا، اس نے اگست ۱۸۵۷ء میں ایک کتاب مرتب کر کے طباعت کے لیے انگلستان بھیج دی تھی، جس کا نام "سپاہیوں کی بغاوت اور اس کے اسباب و نتائج" تھا۔ اس کتاب کا ذکر ۱۵ اگست کے "لاہور کرانیکل" میں ہوا تو لکھا گیا:

> اس سرکشی کو موجودہ مرحلے میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام
> نہیں دیا جا سکتا۔ یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا۔
> لیکن بہت جلد اس کی حقیقی حیثیت آشکارا ہو گئی یعنی یہ اسلامی
> بغاوت تھی۔

۱۔ HENRY MEAD

اس وجہ سے انگریز مسلمانوں کے سخت دشمن بن گئے تھے اور اخباروں میں بار بار تحریکیں پیش ہوتی تھیں کہ مسلمانوں پر ہرگز بھروسا نہ کیا جائے۔ ایک انگریز نے ۲۷۔ جولائی کے "لاہور کرانیکل" میں لکھا کہ پوربیے، کھتری اور ویشنو بہت اچھے ہیں اور ہمارے حد درجہ جانی دشمن مسلمان ہیں" ایک اور انگریز اٹھا اور اس نے ۵۔ اگست کے کرانیکل میں چھاپ دیا کہ گرمیوں کے موسم میں جو انگریز پہاڑوں پر جاتے ہیں، انھیں مسلمان دوکانداروں سے کچھ نہ لینا چاہیے اور ہر چیز صرف انگریز تاجروں سے خریدنی چاہیے:

> بنی بخشوں، الٰہی بخشوں اور دوسرے بدمعاشوں کے گروہ کی سرپرستی اب تک کی جاتی رہی آئندہ کے لیے انھیں دوامًا نظرانداز کر دینا چاہیے (میں اس گروہ میں معزز پارسی تاجروں کو شامل نہیں کرتا) اور مذکورہ بالا گروہ کی دوکانیں بہتر آدمیوں کو سنبھال لینی چاہئیں۔

تحریک کی وسعت و شدّت

تحریک کی وسعت و شدت کا کسی قدر اندازہ مندرجہ ذیل تحریر سے ہو سکتا ہے جو ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۷ء کے "لاہور کرانیکل" میں شائع ہوئی۔

> انگریز اب تک بغاوتوں سے بالکل محفوظ رہے۔ لہٰذا وہ یہ سمجھنے پر مائل ہو رہے ہیں کہ جس سرکشی کی آگ اب مشتعل ہے وہ اس درجہ خطرناک اور تباہی خیز ہے کہ اس سے اب تک کسی ملک کو سابقہ نہیں پڑا۔ انھیں یہ خیال ہو رہا ہے کہ ہندوستان کو قبضے میں رکھنا بہت مشتبہ ہے، اس لیے کہ چھوٹی سی گورا فوج کے لیے اتنے بڑے گروہوں کے مقابلے میں کامیاب ہونا ممکن نہیں۔

کارتوسوں کا معاملہ

حد درجہ تعجب اس امر پر ہے کہ کارتوسوں کے باب میں سپاہیوں

کا اضطراب کسی سے بھی مخفی نہ تھا۔ اس کے متعلق اخباروں میں مضامین چھپتے تھے۔ مثلاً ۹ مئی ۱۸۵۷ء کے "پنجابی" میں دہلی کے ایک شخص رام سنگھ کی تحریر شائع ہوئی۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے پہلے پہل کارتوسوں کے متعلق سُنا تو میری رگوں میں خون نے جوش مارا اور میں نے شہید ہونے کے لیے تیاری کرلی۔ تمام سپاہیوں کی یہی کیفیت تھی۔

میرے قول میں شک نہ کیجیے۔ ممکن ہے بے چینی کے اور اسباب بھی ہوں لیکن ان کے متعلق کسی بھی وقت غور کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تلافی کسی بھی موقع پر ہوسکتی ہے۔ موجودہ اشتعال تمام تر کارتوسوں سے پیدا ہوا۔ دیکھیے چھوٹی سی چنگاری کتنی وسیع شعلہ زنی کا سامان بن سکتی ہے۔ اس چنگاری کو فوراً بجھائیے۔

کیا آپ حیران نہ ہوں گے کہ انگریز یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، لیکن کسی کو احساس نہ تھا کہ اس وجہ اضطراب کو فوراً ختم کرنا چاہیے؟ دو ہی نتیجے نکلتے ہیں یا تو وہ اہل ملک کے مذہبی جذبات سے کاملاً بے پروائی اختیار کر چکے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ زور و قوت کے بل پر ہر اضطراب اور ہر بے چینی کو دبائے رکھنا مناسب ہے یا واقعی ان کا فیصلہ یہ تھا کہ کسی کا مذہب محفوظ رہے یا نہ رہے، انھیں بہرحال اپنے صوابدید کے مطابق عمل پیرا رہنا چاہیے۔ یہ ان کی اجنبیت و بیگانگی کی ایک بنیادی دلیل تھی۔

جوشِ انتقام

اواخر اگست تک دہلی میں ضروری سامانِ جنگ پہنچ چکا تھا اور شہر پر آخری فیصلہ کن حملے کی تیاریاں سرگرمی سے جاری تھیں۔ "لاہور کرانیکل" نے ۲۶۔ اگست ۱۸۵۷ء کو لکھا:

نیلگوں آسمان کی فضا میں "انتقام" "انتقام" کے انگریزی

نعرے کی صدائے بازگشت لحظہ بہ لحظہ واضح تر اور صاف تر
ہوتی جارہی ہے۔

دہلی فتح ہو گئی۔ انگریز چاہتے تھے کہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے اور بہادر شاہ کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ یہ نہ ہوا تو ۷۔ اکتوبر کے "لاہور کرانیکل" میں لکھا گیا:

دہلی کو اب تک کیوں تباہ نہیں کیا گیا؟ بادشاہ اب تک
کیوں زندہ ہے؟ اس کا جواب اختصار سے دے دینا چاہیے
شہر دہلی اور بادشاہ کا وجود دفتری حکومت کا ممنون ہے۔ دفتری
حکومت نے ہمارے سالاروں کے ہاتھ باندھ دیے۔

نومبر میں "پنجابی" کے صفحات پر یہی صدا بلند ہوئی۔ ملاحظہ فرمائیے:

دہلی مسلمانوں کا یروشلم ہے۔ کیوں اب تک اسے زمین کے
برابر نہیں کیا گیا؟ بادشاہ مسلمانوں کی محبت و عقیدت کا سب
سے بڑا مرجع ہے[1] کیوں اسے اب تک پھانسی نہیں دی گئی یا
گولی نہیں ماری گئی؟

انگریزوں کو افسوس تھا کہ نکلسن مر گیا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو طوفان انتقام کی لہریں خدا جانے کیا کیا قیامت برپا کرتیں۔

مشترکہ تحریک مسلم اور غیر مسلم اس تحریک میں یکساں شریک تھے۔ انگریزوں کو مسلمانوں کی شرکت پر تعجب نہ تھا، لیکن ہندوؤں کی شرکت پر وہ سراسر حیران تھے اور چاہتے تھے کہ فرقہ وار جذبات کو بھڑکا کر اپنا مطلب پورا کر لیں۔

---

[1] اصل الفاظ میں محبت و عقیدت کے بت کدے کا سب سے بڑا پر وہت ہے۔

۲۷۔جون ۱۸۵۷ء کے "پنجابی" کی مندرجہ ذیل تحریر ملاحظہ فرمائیے:

> اگر مسلمان تیموری خاندان کی حکومت بحال کرنے کے لیے مضطرب ہیں تو یہ امر چنداں حیرت انگیز نہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ہر ذات پات کے ہندو بھی اسی طرف ڈ ڈرتے جا رہے ہیں یقیناً یہ دیکھ کر انسان سراپا تعجب کا پیکر بن جاتا ہے۔ ہندو اس مقصد کو پایۂ تکمیل پر پہنچانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں، جو اگر کامیاب ہو جائے تو سب سے پہلے انھیں کے چوبی دیوتاؤں اور ٹیپ ٹاپ کی ہوئی دیویوں کے خلاف اعلان جہاد ہو گا۔

ہندو حقیقت حال سے بہتر آگاہ تھے، وہ نو سو سال سے مسلمانوں کی حکومت کا تجربہ کرتے آئے تھے، جو بعض خامیوں کے باوجود مذہبی رواداری کا بہترین نمونہ بنی رہی۔ یہاں تک کہ قید میں بھی ہندوؤں کی ذات پات کے تحفظ کی غرض سے انھیں کھانے کے بجائے پیسے دیے جاتے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انگریزوں نے اپنے مختصر سے دورِ حکومت میں ان کے تلک تک اتروانے میں تامل نہ کیا اور چربی والے کارتوس دانتوں سے کٹوانے پر اصرار کرتے رہے۔

شاہی جواہرات

شاہی جواہرات بھی انگریزوں کے قبضے میں آئے تھے، جن کی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہ ہو سکی، میوٹنی ریکارڈس میں جو فہرست پیش کی گئی ہے، وہ پچیس مختلف اشیا پر مشتمل ہے۔ ان میں طرے، سرپیچ، ہار، بازوبند، انگشتریاں وغیرہ شامل ہیں اور یہ سب چیزیں قیمتی موتیوں، ہیروں، زمردوں یا قوتوں سے مزین تھیں۔ فہرست مرتب کرنے والے نے ان کی قیمت چھیاسٹھ ہزار نو سو پانچ روپے لگائی جو بظاہر بالکل غلط اور ناقابل قبول ہے۔ مثال کے طور پر دو بازوبندوں کی قیمت ایک ہزار روپے بتائی گئی ہے، جن میں سے ہر ایک میں نو نو زمرد لگے ہوئے

نکلے[1] یہ فہرست اس غرض سے مرتب کی گئی تھی کہ ان اشیاء کو فوج کے مال غنیمت میں شامل نہ کیا جائے معلوم نہیں بالآخر کیا فیصلہ ہُوا۔

سلطنت گئی، تاج و تخت رخصت ہوئے، لال قلعہ چھنا، جلا وطنی کی زندگی نصیب ہوئی تو جواہرات کے جانے کا غم کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ بھی مال غنیمت تھا اور انگریزوں نے جس طرح چاہا اسے ٹھکانے لگایا۔ اس سے بیشتر بدرجہا گراں بہا تر چیزیں انگریزوں کے قبضے میں جا چکی تھیں۔ مثلاً ٹیپو سلطان کا تخت ہما، اس کا نہایت قیمتی کتب خانہ۔ ایسی ہی کتابوں کو دیکھ کر اقبال نے کہا تھا:

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

حیدرآباد دکن

سکندرآباد سے ۱۲-جون کا ایک خط "پنجابی" اخبار میں شائع ہُوا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہر میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی، مسجدوں میں زبردست اجتماع ہوتے تھے۔ چار اشتہار فارسی زبان میں لگائے گئے تھے، جن میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ اٹھیں اور انگریزوں کو ختم کر دیں ان میں سے ایک اشتہار مکہ مسجد پر لگایا گیا، دوسرا نظام کی ڈیوڑھی پر، تیسرا سالار جنگ' وزیر اعظم کی قیام گاہ کی دیوار پر اور چوتھا چار مینار پر[2]

سر سالار جنگ نے یہ اشتہار اتروا دیے۔ ریزیڈنٹ نے اسپ سوار توپ خانہ اور رسالہ چادر گھاٹ پر متعین کر دیا۔ ایک فقیر گرفتار ہُوا جو بازاروں میں جہاد کا وعظ کہتا

---

[1] بمبئی ریکارڈس جلد ہفتم حصہ دوم صفحہ ۲۹۶-۲۹۷ ۔ [2] تحریر میں بتایا گیا ہے کہ چوتھا اشتہار سب سے بڑی مسجد کے مینار پر لگایا گیا تھا۔ یہ محرر کی غلط فہمی ہے۔ کہ حیدرآباد کی سب سے بڑی مسجد مکہ مسجد ہے۔ یقیناً اس کی مراد چار مینار ہے جو شہر کے وسط میں سب سے بڑی عمارت ہے۔

پھرتا تھا اور اسے ریزیڈنٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ لکھنؤ سے ایک مشہور مولوی آیا۔ وہ بھی جہاد کی تلقین کرتا تھا۔ اس کا نام نہیں بتایا گیا۔ یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ شہر کے لوگ اس کا بڑا احترام کرتے تھے لہٰذا حکومت اسے گرفتار کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی تھی۔

روہیلے اور عرب تحریک جہاد میں پیش پیش تھے۔ مسجدوں میں صاف صاف کہا جاتا تھا کہ نظام کو حکومت سے الگ کر کے مغل خاندان کے کسی فرد کو حکمران بنا لینا چاہیے۔ نظام ناصر الدولہ کا انتقال ۱۸۵۷ء میں ہوا تھا۔ اس نے وفات سے پیشتر آٹھ ہزار روہیلوں اور چار ہزار عربوں کو ملازمت سے الگ کیا تھا۔ وہ سب چاہتے تھے کہ ہنگامہ برپا ہو جائے تاکہ انھیں کام کا موقع ملے۔[1]

---

[1] "پنجابی"، مورخہ ۸۔ اگست ۱۸۵۷ء

ضمیمہ ۲

جن پیادہ رجمنٹوں نے بغاوت کی، ان کا نقشہ مع مقامات ذیل میں درج ہے۔

	پیادہ فوجیں		پیادہ فوجیں
۱	کان پور	۳۶	جالندھر
۳	پھلور (ضلع جالندھر)	۳۸	دہلی
۶	الہ آباد	۴۱	سیتاپور (اودھ)
۹	علی گڑھ	۴۵	فیروزپور
۱۱	میرٹھ	۴۶	سیالکوٹ
۱۲	جھانسی	۴۸	لکھنؤ
۱۳	لکھنؤ	۵۴	دہلی
۱۵	نصیرآباد	۵۵	مردان (علاقہ سرحد)
۱۷	اعظم گڑھ	۵۶	کان پور
۱۸	بریلی	۵۷	فیروزپور
۲۰	میرٹھ	۶۰	انبالہ
۲۲	فیض آباد	۶۱	جالندھر
۲۸	شاہ جہان پور	۶۸	بریلی
۳۰	نصیرآباد	۷۱	لکھنؤ

پیادہ فوجیں		**پیادہ فوجیں**	
۲ے	پنیچ	۴ے	دہلی
رسالے		**رسالے**	
۱ے	لائٹ کیولری پنیچ	۶ے	جالندھر
۳ے	میرٹھ	۷ے	لکھنؤ

۱ے نظام کیولری	اورنگ آباد
۱۳ے بے قاعدہ کیولری	بنارس
یونائیٹڈ مالوہ کیولری	صدی پور

توپ خانے

۳ے کمپنی ۴ے ٹبالین	دہلی
۲ے "	نصیرآباد
۴ے فرسٹ برگیڈ	پنیچ
ایک دستہ	جھانسی

ھر مینا		**ر مینا**	
سفر مینا	میرٹھ	ہریانہ رجمنٹ	ہانسی حصار
لدھیانہ رجمنٹ	بنارس	۷ے گوالیار	پنیچ